کا مجموعہ تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق دے۔

قاضی اطہر مبارکپوری
ماہنامہ البلاغ: بمبئی

یہ معلوم ہو کر اہل علم کو صدمہ عظیم ہوا کہ ملک کے نامور عالم دین مولانا عبدالسلام صاحب قدوائی سابق استاذ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی اور حال معتمد دارالمصنفین اعظم گڑھ ۲۰ رمضان المبارک ۱۳۹۹ھ کو دفعتاً دماغ پر فالج پڑنے سے انتقال فرما گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون، مولانا مرحوم اپنی جماعت میں ایک ممتاز حیثیت کے مالک تھے، اللہ تعالیٰ نے بہت ساری خوبیوں سے نوازا تھا، دعا ہے، اللہ تعالیٰ بال بال مغفرت فرمائے اور متعلقین اور احباب کو صبر جمیل عطا کرے، افسوس ہے پرانی بساط سمٹتی جارہی ہے اور جانے والے کا کوئی صحیح معنی میں بدل پیدا نہیں ہوتا جو اس کی خالی جگہ کو پُر کر سکے، موصوف جہاں تک معلوم ہو سکا ہے دارالعلوم ندوۃ العلماء کے معتمد تعلیمات بھی تھے، اس لئے یہ حادثہ ندوہ کے حلقہ میں خصوصی طور پر بہت ہی غم انگیز ثابت ہوگا۔

ظفر صدیقی
ماہنامہ برہان، دہلی

تعمیر حیات

کی

خصوصی اشاعت

بیادگار

مولانا محمد الحسنیؒ

چند اہم اہل قلم

مولانا ابوالحسن علی ندوی
مولانا محمد منظور نعمانی
مولانا عبدالسلام قدوائی ندویؒ
مولانا مفتی سیاح الدین کاکاخیل
مولانا محمد ثانی حسنی
ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی
مولانا محمد رابع حسنی ندوی
مولانا عبدالماجد ندوی
مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی
مولانا واضح رشید ندوی
ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی
عبدالکریم پاریکھ

شانِ خط مولانا محمد الحسنی مرحوم

بسمہ

مخدوم گرامی زید تکمکارم راجارہ والطافہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ — رقیم نے ذرا بدحواس کے جواب دہی لکھ

بخیر صحت ہوں اور تمام تعلیقات نواحل پر گئی ہوں، عرصہ دراز سے کوئی شریف خدمت
بابرکت میں ارسال خدمت کرنے کا جمالی اخو استگار ہوں، آنے والوں سے الحمد للہ خیریت علمی
رہی اور طبیعت کو اطمینان رہا، دو ایک روز جو خدمت میں گزرے، اس سے خدا کا شکر
ہے بڑا فائدہ محسوس ہوا، یہ خیال رہا کہ آپ کا کوئی مراسلہ ملے یا آپ تو اطلاع
دی جائے لیکن امید خاطر ناخیر رہی، کچھ اور ہونے نہ ہونے کو ظاہر ایک آن چھپنے
کی بات سمجھ میں آیا، لیکن اندازہ ہوا کہ زیادہ تاخیر کرنا اچھا نہیں، اسلئے رائے یہ
ہوئی کہ چلی جائے، وہاں بھی جمع لوگوں کا کام ہوجائے اور جلدی ہوجائے، امید ہے
کہ آٹھ دس روز میں دیوان کا تصحیح شدہ نسخہ دہلی روانہ ہوجائے گا،
کچھ اور کام ہوجائے تو اسکی تصحیح کرکے پھر چھاپے والے کی خدمت میں ارسال کیا جائے گا،
خدا کرے جلدی کام ہو اور اچھا ہو،
جنتری کی توجہ اور دعا کا احب دستور محتاج ہوں، اور میری جو نرشتہ تضیع ہوئی
اس کے مجرم میں ہوں اور الحمد للہ اسکا اثر پاتا ہوں، اپنے کو دیکھتا ہوں اور خوش

کی تفصیلوں اور الطاف کو تو اب محسوس کرتا ہوں کہ
کلاہ گوشۂ دہقاں بآفتاب رسید

اسی کی ذرا سے عالی ہے تو ہی امید ہے کہ ان توجہات عالیہ کا فائدہ خواہ اثر
اور ثمرہ ظاہر ہوگا کہ
مستحق گر است گناہ گار آید

بڑے بھائی، بزرگے اور اہل خانہ اور بچے بچیوں کو سلام عرض
کرتے ہیں اور امیدوار عنایت و دعا ہیں

خادم
محمد الحسنی
۹۶۶ھ
۷ جون ۵۹ء

برادرم سید محمد واجد سلمہ تحیہ ہیں اور خاص طور پر
سلام عرض کر رہے ہیں اور دعا کی درخواست

وہاں سے خیریت بالخصوص مفتی مولانا شفیع صاحب، مولانا
مولانا محمد ان صاحب زید مجدہ اور مولانا عمار زید
سلامہ الدہر، وغیرہ کی خدمت میں سلام
عرض ہے۔

محمد الحسنی

حیات وخدمات ایک نظر میں

۱۹۳۵ء (۱۵ر اکتوبر - ۷ر رجب ۱۳۵۴ھ) - پیدائش

۱۹۴۱ء (اگست) - بذریعہ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رسم بسم اللہ ادا ہوئی۔

۱۹۵۰ء ـــــ پہلا عربی مضمون (حضرت مولانا علی میاں مدظلہ کی تقریر کا ترجمہ، بین الصورۃ والحقیقۃ۔

۱۹۵۵ء ـــــ مولانا سعید الرحمٰن اعظمی اور سید محمد اجتبا ندوی کے ساتھ البعث الاسلامی جاری کیا جسے ۱۹۶۰ء میں ندوہ نے لے لیا۔

۱۹۶۰ء - (فروری شعبان ۱۳۷۹ھ) "جمعیۃ الرابطۃ الاسلامیۃ" قائم کی۔

۱۹۶۳ء - (۱۰ر نومبر) تعمیر حیات جاری کیا

۱۹۶۴ء ـــــ مسلم مجلس مشاورت کے وفد کے ساتھ گجرات واحمد آباد وغیرہ کا دورہ کیا۔

۱۹۶۷ء ـــــ حضرت مولانا علی میاں مدظلہ کے ساتھ پہلی دفعہ سفر حجاز پر گئے۔

۱۹۷۲ء ـــــ الندوۃ العالمیۃ للشباب کی دعوت پر دوسری بار حجاز گئے۔

۱۹۷۴ء ـــــ جامعہ اسلامیہ کے اجلاس شوریٰ کے موقعہ پر تیسری بار حجاز گئے۔

۱۹۷۶ء ـــــ پہلی عربی تصنیف "الاسلام الممتحن" قاہرہ سے شائع ہوئی۔

۱۹۷۸ء (جولائی) - پہلی ایشیائی کانفرنس میں شرکت کے لئے پاکستان کا دورہ کیا۔

۱۹۷۹ء (۱۳ر جون) - سفر آخرت پر روانہ ہوئے اور تکیہ کلاں رائے بریلی کے خاندانی قبرستان میں محو خواب ہوئے۔

اہم تصنیفات: (عربی میں): الاسلام الممتحن۔ مصر تتنفس۔ الی القیادۃ العالمیۃ۔

(اردو میں): تذکرہ شاہ علم اللہ۔ سیرت مولانا محمد علی مونگیری۔ روداد چمن

ان کے علاوہ متعدد اردو کتابوں کے ترجمے عربی میں اور عربی کے اردو میں کئے۔

محمد میاں مرحوم

مولانا ابوالحسن علی ندوی

جون ۱۹۷۹ء کی ۱۱ یا ۱۲ تاریخ تھی اور میں بمبئی میں تھا، رات کو میں نے خواب دیکھا کہ لکھنؤ میں محمد علی لین والا ہمارا پرانا مکان ہے، بھائی صاحب مرحوم (ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب سابق ناظم ندوۃ العلماء) کا زمانہ ہے، اور گھر کا وہی نقشہ ہے جو ان کی زندگی میں تھا، وہ خود زندہ سلامت ہیں اور مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میرا انتقال ہوگیا ہے، میں عالم برزخ سے اپنے اس پرانے مسکن میں جس میں بچپن اور جوانی گزری گھر والوں سے ملنے آیا ہوں، مجھے پھر وہیں واپس جانا ہے، مجھے اس کا رنج بھی ہے کہ میں جلد ان عزیزوں کو چھوڑ کر چلا جاؤں گا، اور تھوڑا سا سہم بھی کہ مجھے قبر میں جانا ہے، ساتھ ہی ساتھ اس کا افسوس بھی کر رہا ہوں کہ میری عمر بہت کم ہوئی، خواب ہی میں مجھے اس کا شعور ہے کہ بھائی صاحب نے عمر طبعی پائی[1] اور میں اس عمر کو نہیں پہونچا، اس کے بعد میری آنکھ کھل گئی، میں خواب بہت کم دیکھتا ہوں، خاص طور سے معنی خیز جن میں آنے والے واقعات کی طرف اشارہ یا کسی امر کا انکشاف ہو، میں دیر تک سوچتا رہا کہ اس خواب کے کیا معنی ہیں؟ اور اس کی کیا تعبیر ہو سکتی ہے؟

غالباً اگلے ہی دن شب میں ایک دوست کے یہاں سے دیر میں واپس آیا تو معلوم ہوا کہ لکھنؤ سے مولانا محمد منظور صاحب نعمانی نے ٹیلیفون سے اطلاع دی ہے کہ میرے بھتیجے محمد میاں اچانک علیل ہو گئے، ان کو اسپتال میں داخل کر دیا گیا ہے، میں جتنی جلد ہو سکے لکھنؤ پہنچ جاؤں، ہونے والی بات، یہ سنتے ہی دل پر غیر معمولی اثر ہوا جو عزیزوں کی علالت کی عام اطلاع سے نہیں ہوا کرتا، وسط مئی میں جب میں "پیام انسانیت" کے کام کے لیے کرناٹک کے دورہ پر روانہ ہوا تھا تو محمد میاں اچھے خاصے اور چاق چوبند تھے، وہ بہت کم بیمار ہوتے تھے، اور کبھی ایسے بیمار بھی نہیں ہوئے تھے جس سے آئندہ کے لیے فکر و تردد پیدا ہو، لیکن سنتے ہی ماتھا ٹھنک گیا کہ اللہ خیر کرے، ایسے غیر معمولی طریقہ پر اطلاع دینے کا اہتمام کیا گیا ہے،

[1] ان کا انتقال ہجری حساب سے ۶۹ سال کی عمر میں ہوا۔

طبیعت پر فکر و تردد سے زیادہ حزن و یاس کی ایک کیفیت طاری ہو گئی، خواب بھی یاد آیا، دنیا میں اگر (اپنی ساری خامیوں اور کمزوریوں کے احساس کے ساتھ) میرا کوئی مثیل بلکہ "صورت مثالی" ہو سکتا ہے، تو محمد میاں ہی ہو سکتے ہیں، وہ جب بچے تھے، تو ان کی والدہ مرحومہ دعا کرتی تھیں کہ وہ اپنے چچا کے بالکل مثیل ہوں، اور اُردو کے زنانہ محاورہ کے مطابق "اپنے چچا کو پڑیں" اور انہی کا نمونہ ہوں، اللہ نے جن کو دو پیدا کیا ہے وہ دو ہی رہتے ہیں، پورے طور پر ایک کبھی نہیں ہو سکتے، لیکن دو میں جو زیادہ سے زیادہ وحدت، مماثلت اور مشابہت ہو سکتی ہے، وہ ہم دونوں چچا بھتیجے میں تھی، اس کا گواہ خاندان کا ایک ایک فرد ہے، اس لیے دل کو اور دھڑکا لگ گیا، کہ دیکھیے خدا کو کیا منظور ہے؟ کہیں میں نے اپنی شکل میں ان کی مفارقت کو نہ دیکھا ہو۔

واقعہ اسی شب میں پیش آچکا تھا، لیکن میرے رفیق سفر اور معاون مولوی معین اللہ ندوی (نائب ناظم ندوۃ العلماء) نے ٹیلیفون پر یہ خبر سُن کر بھی مجھ سے چھپایا کہ شاید میں سفر کے قابل بھی نہ رہ سکوں اور تھوڑی سی جو امید ان کا آخری دیدار کر لینے اور ان کی آخری خدمت میں شریک ہونے کی ہے وہ بھی جاتی رہے گی، میرے مزاج و جذبات کے لحاظ سے یہ بات بعید از قیاس بھی نہ تھی، میرے مخلص و محسن میزبان محمد بھائی (مالک بمبئی، آندھرا ٹرانسپورٹ) نے جن کی کوٹھی میں میں ٹھہرا ہوا تھا، اور ان کے تمام گھر والوں نے علم کے باوجود مجھے اس کی ہوا نہیں لگنے دی۔

ٹیلیفون کا پیغام پہونچنے کے بعد ہی ہم لوگ ہوائی اڈہ روانہ ہو گئے کہ پہلی پرواز سے دہلی اور صبح کی پرواز سے لکھنؤ پہنچ جائیں، اگر ایسا ہوتا تو وہ محرومی نہ ہوتی جو قسمت میں لکھی تھی، اور جو ان کے والد اور اپنے باپ کی طرح بھائی کے معاملہ میں اس سے پہلے (مئی ۱۹۶۱ء میں) پیش آچکی تھی اور اس کا داغ زندگی بھر رہے گا، مولوی معین اللہ صاحب نے یہ بھی انتظام کر لیا تھا کہ دہلی میں بھی یہ بات مجھ سے راز رہے، اور لکھنؤ پہنچ کر ہی مجھے اس روح فرسا واقعہ کا علم ہو، پھر اللہ ہی حافظ و ناصر ہے، وہی ڈوبتوں کو سہارا دیتا ہے وہی ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑتا ہے، قسمت کی نیرنگی کہ بڑی کوشش اور اس کے باوجود کہ ہوائی اڈہ کے عملہ کے بعض لوگوں سے ہمارے میزبان کے تعلقات بھی تھے، نصف شب میں روانہ ہونے والے جہاز میں کسی طرح جگہ نہ مل سکی، اور مجبوراً اگلے دن ۱۴ جون کو دن کے جہاز سے دہلی پہنچنا ہوا، ہوائی اڈہ پر جامعہ ملیہ کے جو عزیز ملنے آئے، ان کے مغموم چہرے غمازی کرتے تھے کہ واقعہ پیش آچکا ہے، لیکن نہ انھوں نے زبان

سے کچھ کہا، نہ مجھے پوچھنے کی ہمت ہوئی، نظام الدین کے تبلیغی مرکز میں ۲، ۳ گھنٹے ٹھہرنا ہوا، وہاں بھی زبانوں اور لبوں پر مہر لگی رہی، رات کی گاڑی سے لکھنؤ روانگی ہوئی، کانپور کے اسٹیشن پر بھی بعض عزیز ملے لیکن وہاں بھی یہ راز افشا نہ ہوا۔ گاڑی لکھنؤ اسٹیشن پہنچی تو ایک بڑا مجمع پلیٹ فارم پر موجود تھا، سوگوار اور غم میں ڈوبا ہوا، لیکن زبانیں بند، میں اس غیر معمولی مجمع ہی سے سمجھ گیا کہ اتنے سب دوست اسٹیشن پر کیوں آئے، سفر تو میری زندگی کا معمول بن گیا ہے، اور میں ملک کے باہر بھی نہیں گیا تھا، لیکن زبان بے زبانی کہے دیتی تھی کہ واقعہ پیش آچکا ہے، پلیٹ فارم سے باہر آیا تو رفیق محترم مولانا محمد منظور نعمانی صاحب نے گلوگیر اور مرتعش آواز میں واقعہ کی خبر دی، اور میں اسی وقت موٹر سے رائے بریلی روانہ ہو گیا، یہ راستہ جس طرح گزرا اور وہاں جا کر جو کچھ پیش آیا، وہ الفاظ میں ادا کرنے کی چیز نہیں، بس اللہ سے دعا ہے کہ پھر کبھی یہ آزمائش پیش نہ آئے۔

ان سطور کے لکھواتے وقت اچانک وہ دن یاد آگیا، جب اکتوبر ۱۹۳۵ء کی کسی تاریخ کو بمبئی سے (جہاں بھائی صاحب مرحوم ہی نے ڈاکٹر امبیدکر سے ملنے کے لیے بھیجا تھا) واپسی پر اچانک گھر میں محمد میاں کی ولادت[1] کا مژدہ سننے میں آیا، جو میرے پہونچنے سے دو چار دن پہلے کا واقعہ تھا، پانچ بیٹیوں کے بعد اللہ نے بھائی صاحب کو فرزند اور گھر کا چراغ عطا فرمایا تھا، اس پر گھر کے بچہ بچہ اور خاندان کے ایک ایک فرد کو جو خوشی ہوئی ہو گی اس کا اندازہ کرنا مشکل نہیں، پھر وہ وقت آیا کہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی لکھنؤ کے قیام کے دوران اپنی خواہش اور تقاضائے قلبی سے ۱۵ ستمبر ۱۹۳۸ء کو اچانک ہمارے مکان پر تشریف لے آئے، بھائی صاحب نے مجھ سے کہا کہ "محمد کو لاؤ" میں دوڑا ہوا گیا اور ان کو گود میں لے کر آیا، مولانا نے ان کے سر پر دستِ شفقت پھیرا پھر اگست ۱۹۴۱ء میں جب دوبارہ تشریف آوری ہوئی تو ان کی مکتب نشینی کا وقت آگیا تھا، مولانا ہی نے ان کی بسم اللہ کرائی، کیا عجب ہے کہ ان کی وہبی تحریری صلاحیت میں یہ برکت بھی شامل رہی ہو۔

محمد میاں کی تعلیم کا قصہ بھی عجیب ہے، اگر بیان کرنے والوں پر اعتبار نہ ہو تو اس کا یقین کرنا مشکل ہے ؏

حدیث گرچہ غریب است راویاں ثقہ اند

ان کی تعلیم کا قصہ تفصیل کے ساتھ ان کے بڑے بھائی خواہر زادہ عزیز مولوی سید محمد ثانی حسنی سلمہٗ بیان

---

[1] ان کی ولادت ۱۷ رجب ۱۳۵۴ھ (۱۵ اکتوبر ۱۹۳۵ء) کو ہوئی

کریں گے، کہ ان کا ہر وقت کا ساتھ تھا، مختصر یہ کہ خاندانی دستور کے مطابق قرآن شریف ختم کرنے کے بعد انھوں نے پہلے اُردو و فارسی کی تعلیم حاصل کی، عربی پڑھنے کے قابل ہوئے تو بھائی صاحب نے خود ہی انکو پڑھانا شروع کیا، بھائی صاحب نے اگرچہ قدیم طرز کے مطابق عربی کی تعلیم حاصل کی تھی اور ماہر اساتذہ سے درسیات کی تکمیل کی تھی اور ہر فن میں ان کی استعداد نہایت پختہ تھی، لیکن میری اور محمد میاں کی تعلیم کے بارے میں انھوں نے بالکل مختلف طریقہ اختیار کیا۔ میری تعلیم کے بارے میں کم لیکن محمد میاں کی تعلیم کے بارے میں زیادہ، وہ اس بات کے قائل تھے اور ایک حد تک داعی اور مبلغ تھے کہ ابتدا میں زبان کی تعلیم صرف و نحو کے قواعد کی مدد کے بغیر دی جائے، گویا قیاس کے بجائے استقرا کے اصول پر اور عربی کی تعلیم قرآن مجید سے شروع کی جائے، عرصہ تک تو ایک گھر میں رہنے کے باوجود مجھے یہ خبر نہیں ہوئی کہ محمد میاں کیا پڑھ رہے ہیں، یہ زمانہ میری بحرانی تدریسی و تبلیغی مصروفیت کا تھا، اور میں طویل طویل عرصہ تک سفر میں رہتا تھا، بھائی صاحب کی باقاعدہ تعلیم کے علاوہ محمد میاں میں اردو اور عربی کی ہر اس کتاب کے مطالعہ کا ذوق تھا جو ان کے ہاتھ لگ جائے، یہ ذوق ہم لوگوں میں موروثی طور پر لت اور مرض کی حد تک پہونچا ہوا ہے، ان کو عربی میں ابھی شد بد ہی ہوئی تھی کہ انھوں نے ہر چیز کو پڑھنا شروع کر دیا، قدرتی طور پر ان کو زیادہ تر میری عربی تحریریں اور مضامین اور رسائل ملے اور انھوں نے اس کو صرف پڑھا ہی نہیں بلکہ جذب کر لیا، اس بارے میں میرے ساتھ ان کا معاملہ وہی تھا جو میرا اپنے والد صاحب مرحوم کی تصنیفات اور تحریروں کے ساتھ تھا، کہ مجھے بچپن میں انہی کی چیزیں پڑھنے کو ملیں، اور میں نے انہی کی طرز تحریر اور انشاء و ادب کو معیاری و مثالی سمجھا، اسی کی تقلید میں فخر محسوس کیا، اور اسی کا چربہ اتارنے کی کوشش کی، یہاں تک کہ خط سے خط ملانے کی کوشش بھی کی، اور مجھے اس سے بڑا فائدہ پہونچا، محمد میاں کا میری تحریروں کے ساتھ بھی یہی حال تھا کہ وہ ان کو پڑھتے ہی نہیں تھے، بلکہ پی جاتے تھے، اور اسی کے اسلوب کی تقلید کرتے تھے۔

ابھی مجھے اندازہ نہیں ہوا تھا کہ انھوں نے عربی کتنی پڑھ لی اور ان کی استعداد کیا ہوئی، کہ ایک روز اچانک جب ان کی عمر ۱۳، ۱۴ سال سے زیادہ کی نہ ہوگی، انھوں نے شرماتے ہوئے مجھ سے اپنے عربی کے ایک مضمون کے دیکھنے کی خواہش ظاہر کی، میرے لیے یہ ایک انکشاف تھا کہ وہ عربی میں مضمون لکھنے لگے ہیں۔ میں نے بڑے شبہ و استعجاب کے ساتھ ان کا مضمون دیکھنا شروع کیا، مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ عربی میں ان کا قلم چل گیا ہے، اور وہ مضمون نگاری کے قابل ہو گئے ہیں، ۴۹ء میں جب ان کی عمر

۱۴، ۱۵ سال سے زیادہ نہ تھی، میں نے لکھنؤ کے ایک تبلیغی اجتماع میں "صورت و حقیقت" کے عنوان سے ایک تقریر کی، اس وقت کے حالات و تاثرات کی وجہ سے یہ تقریر بڑی مؤثر و طاقت ور بن گئی تھی، بعض یادداشتوں اور حافظے کی مدد سے میں نے اس کو اُردو میں خود مرتب کر لیا، اور وہ "صورت و حقیقت" ہی کے عنوان سے چھپ گئی، اسی زمانہ میں مجھے حجاز کا دوسرا سفر درپیش تھا، جس میں مجھے وہاں طویل قیام کرنا تھا، اور وہاں کے علمی ادبی حلقوں میں (دینی و ذہنی) تحریک پیدا کرنے کا عزم تھا، اس مقصد کے لیے مجھے ایسے دعوتی لٹریچر کی ضرورت تھی جو وہاں کے تعلیم یافتہ نوجوانوں اور اہل علم کے حلقوں میں ایک جنبش و تموج پیدا کر سکے، میں نے امتحاناً یہ تقریر محمد میاں کے حوالہ کی کہ وہ اس کا ترجمہ کر دیں، خیال تھا کہ میں اس پر محنت کر کے اس کو چھپنے کے قابل بنا دوں گا، لیکن جب وہ ترجمہ کر کے لائے تو مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اس میں اصل تقریر کا جوش اور طاقت موجود ہے، اور مجھے اس پر کسی خاص محنت کی ضرورت نہیں، یہ ان کے ترجمہ اور انشاء کا پہلا کامیاب تجربہ تھا، "تبیین الصورۃ والحقیقۃ" کے نام سے یہ رسالہ عربی ٹائپ میں قیمہ پریس بمبئی میں چھپوا کر جون ۵۰ء میں اپنے ساتھ لے گیا، میں جتنے دعوتی رسائل اپنے ساتھ لے گیا تھا ان میں یہ رسالہ سب سے زیادہ مؤثر و مقبول ہوا، اور بعض بڑے علماء نے اپنی مجلس میں اس کو خود پڑھ کر سنایا، اس کے بعد سے اس کے متعدد ایڈیشن نکل چکے ہیں، اور وہ بہت سے عرب ممالک میں بڑے ذوق شوق سے پڑھا جاتا ہے۔

کسی خاص محنت، کسی مدرسہ میں باقاعدہ تعلیم اور صرف و نحو اور مبادی کا ہفت خواں سر کئے بغیر محمد میاں کو عربی تحریر کا جو ملکہ حاصل ہو گیا، اور وہ بے تکلف بڑے بڑے عرب ادباء اور اہل قلم کی کتابیں اور مضامین پڑھنے لگے، اس کو میں بھائی صاحب کی ایک کرامت ہی سمجھتا ہوں، انھوں نے اپنے کم سن یتیم بھائی، (راقم السطور) کو جس خلوص، دلسوزی اور جانکاہی کے ساتھ عربی زبان و ادب اور دینیات کی تعلیم دلائی، اور اس بارے میں اپنے والد ماجد کا منشا پورا کیا، جس طرح ہر فن کے ماہر اساتذہ کا انتخاب کیا اور اس دور بینی اور بلند نگاہی کے ساتھ (جس کا ہندوستان کے حالات اور وقت کے دینی و علمی مشاغل سے کوئی جوڑ نہ تھا) اس کو عربی زبان میں دعوت و تبلیغ کے کام کے لیے تیار کیا، صاف محسوس ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اس کا صلہ اور انعام محمد میاں کی شکل میں عطا فرمایا کہ ان کی ساری لیاقت و صلاحیت کا معاملہ محض وہبی اور خداداد تھا، اور "عَمِلَ قَلِيلًا وَأُجِرَ كَثِيرًا" کا مصداق،

ان کے میرے قلم سے قلم ملا دینے کی بات جب قلم کی زبان پر آ ہی گئی ہے تو یہ لطیفہ سناتا چلوں کہ ایک مرتبہ (غالباً ۵۵ء کی بات ہے) جب "تاریخ دعوت وعزیمت" کی پہلی جلد لکھ رہا تھا اور مرکز دعوت وتبلیغ کچہری روڈ لکھنؤ جہاں میرا قیام تھا، امام غزالی کی "احیاء العلوم" کی ایک طویل عبارت کا ترجمہ کرنے میں مصروف تھا، اسوقت محمد میاں کہیں سے آنکلے، میں دیر سے ترجمہ میں مصروف تھا، اور مجھے اٹھنے کی ضرورت تھی، میں نے ان سے کہا کہ "یہاں سے تم ترجمہ کردو میں ابھی آتا ہوں" انھوں نے قلم برداشتہ ترجمہ لکھنا شروع کردیا، میں جب فارغ ہوکر آیا تو وہ خاصہ حصہ لکھ چکے تھے، میں نے اس کے آگے سے لکھنا شروع کردیا، اس حصہ کو مکمل کرنے کے بعد جب میں نے دیکھا تو مجھے قطعاً یہ پتہ نہیں چلا کہ میں نے کہاں سے شروع کیا تھا، اور انھوں نے کہاں سے شروع کرکے ختم کیا، انھوں نے قلم اور پیوند سے پیوند ایسا ملا دیا تھا کہ میں نہ ان کے اور اپنے خط میں، نہ زبان واسلوب میں امتیاز کرسکا، اس میں ذرا مبالغہ نہیں کہ پوری تحریر میرے ہی قلم کی لکھی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔

ان کا ذہنی وادبی ارتقا تیزی کے ساتھ جاری رہا، عمر ومطالعہ کے ساتھ اور جو حالات مشرق وسطیٰ میں پیش آئے تھے، ان کے اثر سے ان کے قلم کی روانی اور اس سے بڑھ کر ان کے قلم کی طاقت اور جوش تحریر بڑھتا گیا، یہاں تک کہ سچی بات ہے کہ وہ اس میں مجھ سے بازی لے گئے، ان میں فطری طور پر (اور کسی حد تک یہ بات موروثی بھی ہے کہ بھائی صاحب مقرر نہ تھے اور ان کی کم سخنی خاندان اور ـــــ حلقہ میں ضرب المثل ہے) خطابت کا مادہ نہ تھا، خطابت کی یہ طاقت بھی زبان سے قلم ہی کی طرف منتقل ہوگئی اور ان کی عربی تحریر میں خطیبانہ جوش، بے ساختگی اور برجستگی اور آمد وروانی ایسی پیدا ہوگئی جو آتش نوا اور شعلہ بار خطیبوں کا شیوہ اور ان کی تقریروں کا خاصہ ہے۔

اسی زمانہ میں انھوں نے میری بعض عربی تصنیفات کا ترجمہ کیا، دونوں زبانوں پر ان کو یکساں قدرت معلوم ہوتی ہے لیکن خطابت اور جوش کا عنصر ان کی عربی تحریروں میں زیادہ ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اردو تحریر میں سلاست وحلاوت ان کو اپنے دادا (مولانا سید عبدالحیؒ) سے ورثہ میں ملی، میری کتاب "الطریق الی المدینہ" کا ترجمہ کاروان مدینہ "الارکان الاربعہ" کا ترجمہ ارکان اربعہ" ربانیہ لارہبانیہ کا ترجمہ تزکیہ واحسان یا تصوف وسلوک، سب کے آخر میں "السیرۃ النبویہ" کا ترجمہ نبی رحمت، جو انھوں نے بڑے ذوق وشوق اور اہتمام واحترام کے ساتھ کیا، اس کے شاہد عادل ہیں۔

اسی زمانہ میں مشہور نومسلم یہودی النسل جرمن فاضل علامہ محمد اسد کی کتاب "Road to Mecca" کا عربی ترجمہ "الطریق الی مکہ" سامنے آیا، میں اس کتاب سے بہت متاثر ہوا، کتاب نہایت فکر انگیز، خیال افروز بلکہ ایمان افروز تھی، لیکن وہ بڑی بلند پایہ، علمی وادبی زبان میں لکھی گئی تھی، اس میں کثرت سے نفسیات، فلسفہ سیاسیات اور علم الاجتماع کی اصطلاحیں استعمال کی گئی تھیں، مغربی بالخصوص امریکی مذاق کی رعایت سے مصنف نے اپنے تاثرات ومشاہدات اور اپنے فکر ومطالعہ کے نچوڑ کو اپنی زندگی کی ایک داستان کی شکل میں پیش کیا تھا، پھر اس داستان کو پڑھنے والوں کی دلچسپی کے خیال سے توڑ کر کتاب میں پھیلا دیا تھا، اور ان کے مختلف ٹکڑوں کو آگے پیچھے کردیا تھا، اس میں کسی تاریخی ترتیب کا لحاظ نہیں رکھا تھا، میں نے پوری کتاب پڑھ کر اور اس پر محنت کرکے اس کے ٹکڑوں کو تاریخی طور پر مرتب کردیا، میں اس کتاب کے ترجمہ کو ذہین واعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوانوں خصوصیت کے ساتھ غیر مسلم اہل فکر کے لیے (جو مسلمانوں کی کسی تحریر کو خاطر میں نہیں لاتے اور خاص طور پر دعوتی لٹریچر کو سطحی ہونے کا طعنہ دیتے ہیں) بہت مفید سمجھتا تھا، لیکن مجھے اس بارے میں بڑا شک تھا کہ اس کے عربی ترجمے کو جو مصنف کے زیر نگرانی ہوا ہے، اردو میں کوئی منتقل کرنے میں کامیاب ہوسکے گا، ہندستان میں عربی کی ایسی بلند پایہ، عمیق ودقیق کتابیں (درسی، فقہی وکلامی کتابوں کو مستثنیٰ کرکے) کم ہی پہونچتی ہیں، اور ان کے پڑھنے والے تو خال خال ہی ہیں، میں نے بڑے تردد کے ساتھ یہ کتاب محمد میاں کو دی، میں نے کہا کہ اس کے ترجمہ کی کوشش کرو، انھوں نے انگریزی میں بھی استعداد پیدا کرلی تھی۔ میں نے کہا انگریزی اصل بھی سامنے رکھو اور جہاں وقت پیش آئے، مخدومی مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی سے مدد لو، انھوں نے کام شروع کردیا، علمی اصطلاحات کے ترجمہ میں جہاں ان کو دقت پیش آئی، انھوں نے مولانا سے رجوع کیا مولانا نے فلسفہ کے مشہور فاضل ومصنف صاحبزادہ ظفر حسین خاں مصنف "مآل ومشیت" کی طرف رجوع کرنے کا مشورہ دیا، تھوڑے عرصہ میں انھوں نے ترجمہ مکمل کردیا، جو "طوفان سے ساحل تک" کے نام سے چھپا، یہ ترجمہ کسی طرح اس بات کی غمازی نہیں کرتا کہ یہ ایک ایسے نوعمر مترجم کے قلم سے نکلا ہے جس نے نہ کسی عربی مدرسہ میں تعلیم پائی نہ کسی کالج میں، مصنف نے ازراہ کرم ہماری مجلس "مجلس تحقیقات ونشریات اسلام ندوۃ العلماء لکھنؤ" کو برصغیر ہندوپاکستان کے لیے اس کی اشاعت کی اجازت دے دی اور اس کے یورپین ناشر سے بھی اجازت دلوادی۔ اس وقت سے اس برصغیر میں یہی ترجمہ چل رہا ہے، ہندی میں بھی اسی سے ترجمہ کیا گیا ہے، کتاب پڑھنے کے بعد کوئی انصاف پسند قاری ترجمہ کی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتا، کہیں سے اس میں

ترجمہ پن کی بو نہیں آتی، معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کے قلم سے براہ راست یہ کتاب اردو میں نکلی ہے، خدا کا شکر ہے کہ یہ ترجمہ ان کے والد ماجد کی زندگی ہی میں شائع ہوگیا، اور انھوں نے اپنے لائق اور ہونہار فرزند کی تحریری قابلیت اور ترجمہ کا کمال دیکھ لیا،

ان کی اردو تحریر و انشاء اور تصنیف و تالیف کا ذکر شروع ہوا ہے تو اس کو مکمل کرتا چلوں کہ ۱۹۶۲ء میں طبیعت پر اس کا شدید تقاضا ہوا کہ بانی ندوۃ العلماء حضرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ کی شایان شان سیرت و سوانح ندوۃ العلماء کی طرف سے مرتب کی جائے کہ یہ ایک ایسے ادارے اور جماعت کا اخلاقی و علمی فرض ہے جو ان کا لگایا ہوا قلم ہے، اور جس نے بڑی تعداد میں ایسے اہل قلم پیدا کئے، جنھوں نے سوانح نگاری اور تاریخ نویسی کا میدان اختیار کیا اور اس میں اپنی کامیابی اور برتری کا نقش قائم کر دیا ہے، بہت سی حیثیتوں سے یہ میرا فرض تھا کہ میرے قلم سے متعدد سوانح عمریاں نکل چکی تھیں، لیکن اس زمانہ میں میری نظر بہت کمزور تھی اور نزول الماء کی وجہ سے میں ایسا تصنیفی کام کرنے سے قاصر تھا جس میں کثرت سے باریک تحریروں کو پڑھنا اور مواد اور حوالے تلاش کرنا ضروری ہے، میری نظر ہندوستان کے بعض اچھے اہل قلم پر پڑی جن کو دینی شخصیتوں کی سوانح نگاری سے خاص مذاق اور شغف تھا، میں نے ان سے خط و کتابت بھی کی، لیکن کام شروع نہ ہو سکا، پھر اس غرض سے دارالعلوم کی بالائی عمارت میں اس سوانح کی ترتیب و تحریر کے لیے باقاعدہ دفتر قائم کیا، دارالعلوم کے ایک اہل قلم استاذ کی خدمات بھی اس کے لیے لیں، اور کتاب کا مواد، ماخذ اور ضروری کتابیں جمع کر دیں، لیکن کام میں کچھ پیش رفت نہیں ہوئی، اسی دوران ایک روز اچانک معلوم ہوا کہ محمد میاں (جن کا "البعث الاسلامی" کا دفتر اسی کمرہ میں تھا) بغیر کسی کو بتلائے اپنے شوق سے یہ کام شروع کر چکے ہیں، اور ان کی بڑی تمنا ہے کہ یہ کام ان کے ہاتھوں انجام پائے، یہ غالباً اس تعلق کا نتیجہ تھا جو ان کے دادا مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب اور حضرت مولانا سید محمد علی صاحب مونگیری کے درمیان رہ چکا ہے، یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ اس کام کو خالص اپنی سعادت سمجھ کر انجام دے رہے ہیں، اور ان تمام آداب کو ملحوظ رکھتے ہیں جو اہل اللہ اور برگزیدہ اصحاب کی سوانح اور سیرت کی تصنیف و ترتیب میں ملحوظ رکھنے چاہئیے۔

تھوڑے عرصہ میں انھوں نے سوانح کا مسودہ میرے حوالہ کیا کہ میں اس پر اصلاحی نظر ڈال لوں، کتاب میرے تصور و توقع سے بلند نکلی، مجھے آج بھی اس میں بہت شبہ ہے کہ میں اس کو اتنے اچھے طریقہ پر لکھ سکتا

اور اس کے حقوق سے عہدہ برآ ہو سکتا تھا؟ کتاب میں ان کے قلم کی پختگی کے ساتھ ان کے ذہنی بلوغ اور پختگی کا بھی اظہار ہوتا ہے، اور کسی طرح یہ نہیں معلوم ہوتا کہ وہ ایک ایسے مصنف کے قلم سے نکلی ہے جس کی عمر صرف ۲۵ سال ہے، اور جس نے کسی تصنیفی ادارہ یا کسی استاذ سے تصنیف و تالیف کی تربیت نہیں حاصل کی، کتاب میں متانت تحریر، توازن اور اسی کے ساتھ ادبیت و تاثیر ہے، اور وہ سیر و سوانح کی ان شرائط کو پورا کرتی ہے جو ایک جامع کمالات ہستی اور ایک عہد آفریں تحریک کے بانی کی سوانح کے لیے ضروری ہیں۔

۳۱ اکتوبر، ۱، ۲، ۳ نومبر ۱۹۷۵ء میں ندوۃ العلماء کا پچاسی سالہ جشن دارالعلوم ندوۃ العلماء کے وسیع احاطہ میں منعقد ہوا، شرکائے اجلاس کے مرتبہ و مقام، موقر عرب وفود کی کثرت، عرب ممالک کی سربرآوردہ علمی و دینی شخصیتوں کی موجودگی، شیخ الازہر علامہ ڈاکٹر عبدالحلیم محمود صدر اجلاس کی دلآویز شخصیت اور ان کی اقتدار میں جمعہ کی نماز کی ادائیگی (جس میں ایک لاکھ سے زائد کے مجمع کا اندازہ کیا جاتا ہے) اجلاس کے دوران سکینت و برکت کی ایک روحانی فضا کا احساس، جلسوں کا نظم و ضبط، حاضرین کا گہرا تاثر، یہ سب وہ خصوصیات تھیں جو ہندوستان کی تاریخ میں اس سرزمین پر مدت دراز سے دیکھنے میں نہیں آئی ہوں گی، لیکن جو لوگ اس جشن میں شریک نہیں تھے ان کو جشن کا صحیح تاثر دینا اور اسکی قلمی تصویر کھینچنا اگر ناممکن نہیں تو نہایت دشوار معلوم ہوتا تھا۔ ؎

گر مصوّر صورت آں دلستاں خواہد کشید
حیرتے دارم کہ نازش را چساں خواہد کشید

لیکن اس جشن کی روداد کا مرتب نہ کرنا، اور جو کچھ دیکھا ہے اس کو دوسروں کو دکھانے کی کوشش نہ کرنا بھی سمجھ میں نہ آیا، آخر میں محمد میاں ہی پر نظر پڑی کہ وہ اس میں عملاً شریک بھی تھے، اور اُن احساسات و جذبات میں بھی اُن کا حصہ تھا، جو اس اجلاس کے پیچھے کام کر رہے تھے، یہ ان کے گھر کی کہانی تھی، اور ان کے دادا اور باپ کے خون اور پسینے سے سینچے ہوئے پودے کی نکھار اور فصل بہار کی داستان، اور بقول شاعر ؎

داستاں فصل گل خوش می سراید عندلیب!

انھوں نے میرے عربی خطبۂ استقبالیہ کا ترجمہ اردو میں اس طرح کیا تھا کہ بعض جگہ وہ عربی سے بھی بڑھ گیا تھا شعر کی جگہ شعر رکھنا اور ہندوستانی و مقامی ماحول کی رعایت سے الفاظ کا انتخاب، بڑی سبک دستی بلکہ چابکدستی

کا کام تھا، انھوں نے روداد مرتب کی اور گویا الفاظ میں ریکارڈنگ کا کام اس طرح کیا کہ پڑھنے والے کو دل کی دھڑکنیں، ذہن کے اندیشے، انبساط کی کیفیت اور سانس کی آواز بھی سنائی دے، جب یہ روداد "روداد چمن" کے نام سے شائع ہوئی تو مخدومی مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی علیل اور بڑی حد تک معذور ہو چکے تھے انھوں نے کتابوں پر مختصر تبصرہ کرنا بھی چھوڑ دیا تھا، لیکن "روداد چمن" انھوں نے خود مطالعہ فرمائی اور اس پر ایسا تبصرہ کیا جو عرصے انھوں نے کسی کتاب پر نہیں کیا تھا، ان کا یہ جملہ بڑا معنی خیز اور پوری عبارت کا قائم مقام ہے کہ "مصنف نے پروپیگنڈہ کو لٹریچر بنا دیا ہے" آج بھی کتاب موجود ہے اور اس میں مصنف کے قلم کی مصوری کا کمال دیکھا جا سکتا ہے۔

گھر کے ماحول خاندانی اثرات اور فطرت سلیمہ کی بنا پر محمد میاں کو اہل قلوب اور خاصانِ خدا سے گہری عقیدت تھی اور وہ تزکیۂ نفس اور تعلق مع اللہ کی اہمیت و ضرورت سمجھتے تھے، اسی جذبہ نے اس زمانہ میں جب وہ اپنے علمی و ادبی مشاغل میں منہمک تھے، ان کے قلم سے اپنے خاندان کے مورث اعلیٰ، حضرت سید احمد شہید کے جد امجد اور گیارہویں صدی ہجری کے ممتاز ترین متبع سنت و حامیٔ شریعت شیخ، حضرت سید شاہ علم اللہؒ کی سیرت لکھوائی، جو جولائی ۱۹۷۰ء میں "تذکرہ حضرت سید شاہ علم اللہؒ" کے نام سے شائع ہوئی، وہ ان کی مؤثر ترین تحریروں میں ہے، حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی ان کے گویا خاندانی شیخ تھے اور اُن کے والد والدہ دونوں ان سے بیعت تھے، مولانا لکھنؤ میں بھائی صاحب کے گھر کے علاوہ کہیں قیام نہیں فرماتے تھے، ڈاکٹر صاحب سے جو تعلق خاص تھا، اس کی بنا پر محمد میاں پر بھی بڑی شفقت کی نظر تھی، مجھے یاد ہے کہ جب ۱۹۵۷ء میں بھائی صاحب مولانا کی عیادت کو دیوبند تشریف لے گئے تو میں اور محمد میاں بھی ہم رکاب تھے، ایک دن مولانا نے مجھ سے پوچھا "محمد میاں کیا کرتے ہیں؟" میں نے کہا کہ عربی کا رسالہ "البعث الاسلامی" کے ایڈیٹر ہیں، فرمایا کہ "آپ ان کو دارالعلوم کا کوئی سبق نہیں دیتے" میں نے بعض مصالح کا ذکر کیا جو اس کے منافی تھے، فرمایا "کیا آپ لوگوں کے کہنے سننے کا خیال کرتے ہیں؟" پھر عربی کے دو شعر پڑھ کر جن کا مطلب یہ تھا کہ زبان خلق سے تو کوئی بڑی ہستی بھی محفوظ نہیں رہی خدا ان کو دارالعلوم سے جو قلبی لگاؤ اور اس کے کاموں میں دلسوزی و دلچسپی ہوگی، وہ ہر ایک کو تو نہیں ہو سکتی۔

اس عقیدت کا نتیجہ تھا کہ محمد میاں نے مولانا کی سیرت لکھنے کا ارادہ کیا جو مولانا کے حلقۂ عقیدت بلکہ ہندوستان کی ملت اسلامی کے ذمہ قرض ہے، جس کے لیے انھوں نے قربانیاں دیں، انھوں نے یہ کام شروع بھی کر دیا

تھا، لیکن ان کی اچانک وفات کی وجہ سے وہ مکمل نہ ہو سکا۔

اپنے زمانہ کے شیوخ و صلحا میں ان کو حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری سے بڑی عقیدت تھی، حضرت کی لکھنؤ کی مجلسوں میں تو وہ شریک ہوتے ہی تھے، رائے پور بھی گئے اور وہاں حضرت کے ہاتھ پر بیعت ہو گئے، اللہ تعالیٰ نے حضرت کی آخری علالت میں ان کو لاہور پہونچا دیا، حضرت کا حادثۂ وفات ان کے سامنے ہی پیش آیا، جنازہ کے ساتھ گئے اور حضرت کے وطن ڈھڈیاں جا کر تدفین میں شرکت کی۔

اپنے مرشد کے علاوہ حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب سے بھی عقیدت و محبت تھی، متعدد بار وہ رمضان المبارک میں سہارنپور جا کر ان کی صحبت اور ان کی مبارک مجالس میں شرکت سے مستفید ہوئے، حضرت شیخ کی مشہور کتاب "فضائل نماز" کا عربی میں ترجمہ بھی کیا جو "الصلوۃ ومکانتھا فی الاسلام" کے نام سے چھپی ہے، جس سے حضرت کی دعائیں ان کو حاصل ہوئیں اور تبلیغی جماعت کے عرب حلقوں نے اس سے فائدہ اٹھایا، آخری دور میں ان کو حضرت مولانا محمد احمد صاحب پھولپوری سے بڑا تعلق ہو گیا تھا، اور مولانا کی بھی ان پر خصوصی نگاہ شفقت تھی، مولانا کے عارفانہ کلام کو جمع و مرتب کرنے میں خاص طور پر ان کی تحریک شامل تھی، اور انھی کے بار بار کے تقاضے سے "دیوانِ محبت" کے نام سے مجموعہ مرتب ہوا، جس کے عناوین انھی کے تجویز کئے ہوئے ہیں۔ مولانا کی خدمت میں وہ وقتاً فوقتاً حاضر بھی ہوا کرتے تھے، مولانا کو ان کی وفات کا بڑا صدمہ ہوا، ان کی مجلسوں میں اب بھی ان کا برابر تذکرہ ہوتا ہے۔

محمد میاں پڑھنے لکھنے میں جتنے پکے تھے، سفر میں اتنے ہی کچے تھے، یہ وراثت ان کو اپنے والد ماجد سے ملی تھی، جو برسوں سفر نہیں کرتے تھے، ایک مرتبہ والدہ صاحبہ کے اشارہ و ہدایت سے میں ان کو مسلم مجلس مشاورت کے دورۂ گجرات میں ساتھ لے گیا، جو دسمبر ۱۹۶۴ء میں ہوا تھا، اس سلسلہ میں احمد آباد اور اس کے نواح گودھرا، بڑودہ، سورت اور بھڑوچ ان کا جانا ہوا، حجاز کے سفر بھی انھوں نے میرے دوسرے عزیزوں اور رفیقوں کے مقابلہ میں کم کئے تھے، پہلی مرتبہ ۱۹۶۷ء کو انھوں نے حجاز کا سفر کیا تھا، اور وہاں چھ مہینے قیام کر کے واپس ہوئے تھے، دوسرا سفر انھوں نے تنہا ۱۹۷۲ء میں "الندوۃ العالمیۃ للشباب الاسلامی" کی دعوت پر جس کا مرکز ریاض میں ہے کیا، اور سالانہ کانفرنس میں شرکت اور حج سے فراغت کر کے واپس ہو گئے، تیسرا سفر ۱۹۷۴ء میں میری معیت میں جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کی مجلس استشاری کے موقع پر پیش آیا، ہوائی جہاز کے سفر سے ان کے اعصاب پر بڑا اثر پڑتا تھا، اور وہ سفر میں ٹرین کو ترجیح دیتے تھے لیکن بیرونی ممالک کے سفر میں ہوائی جہاز

سے چارہ نہیں تھا، اس لیے وہ حتی الامکان اس سے بچنے کی کوشش کرتے تھے، انتقال سے کچھ ہی دن پہلے ان کو ایک طرف قبرص (سائپرس) کی مسلم صحافت کی اس کانفرنس میں شرکت کے لیے جو رابطہ عالم اسلامی کے اہتمام میں ہو رہی تھی، دعوت نامہ ملا۔

——— اور دوسری طرف ماسکو سے وہاں کی ایک صحافتی کانفرنس میں شرکت کے لیے دعوت نامہ آیا ہوا رکھا تھا، لیکن انھوں نے ان دونوں سفروں میں سے کسی میں جانا پسند نہیں کیا اور اس کی نوبت آنے سے پہلے وہ دنیا سے سفر کر گئے، قبرص میں بجائے ان کی موجودگی کے ان کے لیے دعائے مغفرت کی گئی اور فاتحہ پڑھ کر ثواب پہنچایا گیا۔

۶ — ۸ جولائی ۱۹۷۸ء کو رابطہ عالم اسلامی کی طرف سے کراچی میں پہلی اسلامی کانفرنس منعقد ہو رہی تھی، اس وقت میں حجاز میں تھا، مجھے معلوم ہوا کہ محمد میاں کے نام بھی دعوت نامہ گیا ہے، میری بڑی خواہش تھی اور میں نے اس کے لیے حرم شریف میں دعا کی کہ وہ اس کی شرکت کے لیے آمادہ ہو جائیں اور پاکستان کے سفر و قیام میں ان کا ساتھ ہو، اللہ نے یہ دعا قبول کی اور مولانا محمد منظور صاحب نعمانی کی معیت میں وہ عین وقت پر پہنچ گئے۔ اس کانفرنس سے فراغت کے بعد وہ میرے ساتھ پاکستان کے مختصر دورے میں شریک رہے، فیصل آباد، اسلام آباد، راولپنڈی، سرگودھا، اکوڑہ خٹک اور لاہور کے سفر میں ساتھ رہا، اس سفر میں وہ اپنے مرشد حضرت مولانا رائے پوری کے وطن و مدفن دھڑیاں بھی گئے، دو دن وہاں قیام رہا، ہندوستان آکر انھوں نے اپنی بہنوں سے کہا کہ یہی سفر کا حاصل تھا، اور جو سکون وہاں نصیب ہوا، پورے سفر میں نصیب نہیں ہوا، اس موقع سے ان کے دور افتادہ عزیزوں نے بھی ان کو دیکھ لیا، جنھوں نے ان کو دیکھا نہیں تھا اور ان کا نام اور قابلیت کی شہرت سنتے تھے، اس سفر میں انھوں نے اس کی ادنیٰ کوشش بھی نہیں کی کہ وہ اپنے کو نمایاں کریں یا کہیں کوئی مضمون پڑھیں اور تقریر کریں، انھوں نے اس پورے سفر میں اپنے کو ایک معمولی رفیق اور شریک قافلہ سے زیادہ نہیں سمجھا اور ہر جگہ چھوٹے بن کر رہے۔

ان کا ذہنی و علمی نشو و نما دار العلوم ندوۃ العلماء کے ماحول میں ہوا تھا، ان کا رابطہ وہاں کے اساتذہ اور فضلاء سے مسلسل اور مستقل طور پر رہا، آمد و رفت، مجالس کی شرکت اور علمی مذاکرات کے ذریعہ وہ وہاں کے ماحول اور فضا سے قریب رہے، ندوہ سے ان کو دو یا تین پشتوں کا تعلق تھا، وہ اس کے مقاصد اور دعوت سے بچپن سے آشنا اور مانوس تھے، پھر ان کا مطالعہ جتنا بڑھتا گیا اس پر ان کا اذعان اور اس کی صحت و صداقت

پر یقین بھی بڑھتا گیا، جس کا اندازہ اُن کے ان اردو اور عربی مضامین سے ہوتا ہے جو وہ وقتاً فوقتاً ندوۃ العلماء کے ترجمان "تعمیر حیات" اور "البعث الاسلامی" میں لکھتے رہے، نیز ان مضامین و رسائل سے جو انھوں نے پچاسی سالہ تعلیمی جشن کے لیے لکھے۔ اس آزاد علمی استفادہ کے علاوہ انھوں نے مولانا شاہ حلیم عطا صاحب مرحوم شیخ الحدیث دار العلوم کے درس حدیث میں سال بھر باقاعدہ شرکت کی اور ان سے صحاح کا درس لیا۔[1]

محمد میاں کا ذہن شروع سے وسیع تھا، ان میں کہیں سے سید جمال الدین افغانی کے آتش کدہ کی ایک چنگاری اڑ کر آ گئی تھی جو اُن کو بے چین بنانے اور وسیع خطوط پر سوچنے پر مجبور کرتی تھی، انھوں نے ہندوستان سے تو کیا، اپنے شہر لکھنؤ سے بھی بہت کم باہر قدم نکالا تھا، ان کے سفروں کی حد یہی دو تین قریبی اضلاع تھے، جن سے ان کو وطنیت یا قرب کا تعلق تھا، لیکن وہ لکھنؤ میں بیٹھے بیٹھے عالم اسلام کے اسلام پسند اور حوصلہ مند نوجوانوں کی تنظیم کے خواب دیکھتے تھے، رجب ۱۳۷۹ھ (جنوری ۱۹۶۰ء) میں انھوں نے اپنے رسالہ "البعث الاسلامی" میں سال نو کے تحفہ کے طور پر اس تنظیم کے قیام کی تجویز پیش کی، پھر اگلے شمارہ شعبان ۱۳۷۹ھ (فروری ۱۹۶۰ء) میں "مشروع اسلامی کبیر" کے عنوان سے انھوں نے اس کے قیام کا اعلان کر دیا اور نوجوانوں کو اس کی رکنیت کی دعوت دی، عربی میں اس کا نام "جمعیۃ الرابطۃ الاسلامیہ" تھا، اور انگریزی میں —

"International Cultural Islamic Organization"

یہ نوجوانوں کی بین الاقوامی اسلامی تنظیم تھی جس کا مقصد آپس میں تعارف، ایک دوسرے کے حالات سے واقفیت، مسلمانوں میں بیداری پیدا کرنے کے کام میں تعاون، ان کو صحیح مشورہ اور رہنمائی پیش کرنا تھا، اس کی طرف سے عربی انگریزی میں رسائل و مضامین بھی شائع ہوئے، اور وہ دوسرے ملکوں تک پہنچے۔ بہت سے نوجوانوں نے اس کا خیر مقدم کیا، اور رکنیت قبول کی، یاد رہے کہ رابطہ عالم اسلامی مکہ معظمہ کے قیام سے دو سال پہلے کی بات ہے۔

اُردو تحریر و تصنیف اور ان کے سفروں اور بعض دعوتی و تنظیمی کاموں کے اس ضمنی تذکرہ کے بعد جو محمد میاں کی زندگی اور ان کے علمی و ادبی کاموں میں ثانوی حیثیت رکھتا ہے، ہم ان کی عربی تحریر و انشاء کی طرف واپس آتے ہیں کہ یہی ان کا اصل میدان اور ان کے تفوق و امتیاز کا نشان ہے، عربی میں ان کا زور قلم بڑھتا رہا،

---

[1] اس درس میں مولوی ڈاکٹر تقی الدین ندوی مظاہری (حال مستشار علمی رئیس القضاۃ ابوظبی) ان کے رفیق و شریک تھے۔

اور ان کو اپنی تحریر و انشاء کے لیے ایک نئے اور مستقل میدان کی ضرورت جلد پیش آگئی، وہ بڑے سے بڑے اہم موضوع پر قلم برداشتہ اور برجستہ لکھ لیتے تھے، ان کے مضامین و تحریریں آمد ہی آمد تھی، مجھے بارہا اس کا تجربہ ہوا کہ میں نے کچھ لکھنا چاہا لیکن لکھنے کا موڈ نہ تھا، بعض کہنہ مشق اساتذۂ ادب اور عربی لکھنے والوں کے سپرد کیا تو مطلب کی بات ادا نہ ہوئی، مجبور ہو کر میں نے ان کے حوالہ کیا اور وہ تھوڑے وقت میں قلم برداشتہ لکھ کر لے آئے، اور میں اس کو پڑھ کر بالکل مطمئن ہو گیا کہ میری صحیح ترجمانی اور مضمون کا حق ادا ہو گیا، بعض نہایت نازک اور ذمہ دارانہ موقعوں پر مثلاً ۲۲ اپریل ۶۲ء کو سعودی سفیر ہز اکسیلنسی انس یوسف یاسین کی آمد — اور ۳ فروری ۶۸ء کو امام حرم شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن حسن کی تشریف آوری اور نماز جمعہ کی امامت کے موقعہ پر ندوۃ العلماء کی طرف سے جو سپاسنامہ پیش کیا گیا وہ انھیں کا لکھا ہوا تھا، حقیقت میں یہ کام میرے کرنے کا تھا لیکن وقت کم تھا اور طبیعت مضمحل، وہ دن گزر چکے تھے جب طبیعت جوش سے بھری ہوئی اور قلم کی کمان چڑھی ہوئی تھی، میں نے کہا کہ "محمد میاں یہ سپاسنامہ تم لکھو" ان میں سعادتمندی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی اور میرے ساتھ معاملہ تو ایک سعید فرزند کا تھا، طبیعت شگفتہ تھی یا افسردہ وہ گئے اور اس طرح مضمون لکھ کر لے آئے کہ جیسے کمپیوٹر میں سے کوئی چیز نکل آئے، دیکھا تو اول سے آخر تک مرصع کہیں قلم رکھنے کی گنجائش نہیں، پھر زور بیان، برجستگی اور دلآویزی مستزاد، پڑھ کر دل خوش ہو گیا، اور دل سے دعا نکلی، مضمون علماء و ادباء کی موجودگی میں جلسہ میں پڑھا گیا اور سب نے داد دی، ان لوگوں کی بہت بڑی تعداد رہی ہوگی جو سمجھتے ہوں گے کہ میں نے لکھا ہے، میں نے ایک فاضل دوست سے سنا ہے کہ جب "البعث الاسلامی" کے آتشیں اور شعلہ بار اداریے ان کے نام سے چھپے ہوئے بعض اہل ذوق نے پڑھے تو کہا کہ "یہ سب مولانا ابوالحسن علی کے لکھے ہوئے ہوتے ہیں، محمد میاں کا نام ہوتا ہے"۔

اس سلسلہ میں یہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے کہ مجھے اپنی کتاب "الصراع بین الفکرۃ الاسلامیۃ والفکرۃ الغربیۃ" کے نئے ایڈیشن کے لیے آخری مضمون لکھنا تھا جس میں پوری کتاب کا عطر آجائے اور وہ پڑھنے والے میں ایک نئی روح اور نیا ولولہ پیدا کر دے، کتاب کا اردو اور انگریزی ترجمہ بھی شائع ہو چکا تھا، ادھر مجھ سے بعض اہل ذوق نے یہ کہا تھا کہ کتاب کا آخری مضمون پوری کتاب کے مقابلہ میں کسی قدر سست اور ڈھیلا ہے، اور ناظرین وہی تاثر لے کر کتاب بند کرتے ہیں جو اس کے آخری باب یا فصل سے ان پر طاری ہوتا ہے، میں نے کچھ دیر تو سوچا کہ میں عربی میں لکھوں یا اردو میں، پھر فیصلہ کیا کہ اردو میں لکھوں

اتفاق سے اسی زمانہ میں پاکستان کے ایک موقر دینی رسالہ کے مدیر[1] کی (جو مجھے بہت عزیز ہیں) فرمائش آئی ہوئی تھی کہ میں ان کے رسالہ کے لیے کوئی مضمون بھیجوں، میں نے سوچا کہ "بیک کرشمہ دو کار" میں یہ مضمون بھی ان کو بھیج دوں گا اور اس کو خود عربی میں منتقل کر دوں گا، طبیعت موڈ پر تھی، اور کتاب کو موثر و نتیجہ خیز بنانے کا عزم تھا، اس لیے طبیعت میں آمد ہوئی اور میں نے ایک نشست میں پورا مضمون لکھوا دیا جو "حرف آخر" کے عنوان سے اس کتاب کے تیسرے ایڈیشن میں نظر آئے گا، مضمون سے فارغ ہونے کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ اب عربی میں اس کے لکھنے میں وہ آمد اور زور نہیں رہے گا جو براہ راست مضمون کے لکھنے میں تھا، اتفاق سے محمد میاں رائے بریلی آئے، میں جانتا تھا کہ ماشاء اللہ ان کی کمان چڑھی رہتی ہے اور ان کا شہپ قلم ساز و برق سے آراستہ رہتا ہے، —— میں نے کہا کہ محمد میاں اس کے عربی میں ترجمہ کی کوشش کرو، مجھے خود یہ کام مشکل معلوم ہوتا ہے، میرے ایک دو مرتبہ کہنے کے بعد وہ گھر گئے اور تھوڑی دیر کے بعد مضمون لکھ کر لے آئے، دیکھا تو معلوم ہوا کہ جیسے کسی عمدہ مشین سے ڈھلا ڈھلایا نکلا ہو، جہاں تک یاد ہے کہیں انگلی رکھنے کی ضرورت پیش نہیں آئی، عربی کتاب "الصراع بین الفکرۃ الاسلامیۃ والفکرۃ الغربیۃ" میں یہ مضمون "خاتمۃ البحث" کے عنوان سے موجود ہے، مترجم کا نام کتاب میں نہیں ہے، جس کا جی چاہے پڑھ لے، اور فیصلہ کرے کہ کیا کتاب میں دو قلم ہیں، یا ایک ہی؟، بلکہ بہت سے اہل ذوق محسوس کریں گے کہ یہ کتاب کا سب سے طاقتور حصہ ہے اور کتاب کی روح سمٹ کر اس میں آگئی ہے۔

اس پر ایک دوسرا واقعہ یاد آیا، انھوں نے "الاسلام بین الاوہام؟" (جواب ان کے ایک پورے مجموعہ مضامین کا نام ہے اور مصر میں زیر طبع ہے) کے نام سے ایک مضمون لکھا تھا جس میں اس تضاد کا اظہار کیا تھا جس کو مسلمان حکومتیں معاشرے اور افراد اسلام کے بارے میں اختیار کیے ہوئے ہیں، مضمون میں انھوں نے حسب معمول اپنا دل نکال کر رکھ دیا تھا، غالباً ۶۳ یا ۶۴ء تھا میں رابطہ عالم اسلامی کے اجلاس کے سلسلہ میں مکہ معظمہ میں مقیم تھا، مصر اور تحریک اخوان کے مشہور خطیب و ادیب استاذ عبدالحکیم عابدین جو بانی تحریک "الاخوان المسلمون" الامام الشہید حسن البناء کے بہنوئی اور ایک زمانہ میں جماعت "الاخوان المسلمون" کے سکریٹری جنرل بھی رہے اور مصر سے جلاوطنی کے بعد بیروت میں وکالت کرتے تھے، مجھ سے ملنے عزیزی ڈاکٹر مولوی عبداللہ عباس ندوی

---

[1] مولانا سمیع الحق صاحب مدیر رسالہ "الحق" اکوڑہ خٹک ضلع پشاور

کے مکان پر آئے، میں کسی ضرورت سے کمرہ سے باہر گیا، واپس آیا تو دیکھا کہ وہ "الاسلام بین لاو نعم" پڑھ رہے ہیں، ان کی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو گر رہے ہیں، میں کمرے میں داخل ہوا تو مجھ سے روتے ہوئے کہا من ھذا الاخ الذی کتب ھذا المقال ؟" (یہ کون صاحب ہیں جنھوں نے یہ مضمون لکھا ہے ؟) میں نے کہا کہ میرے بھتیجے ہیں، رو کر کہنے لگے کہ میرا اسلام پہنچانا اور مضمون کی داد دینا۔

۱۹۵۲ء میں جب مصر میں انقلاب آیا اور زمام اختیار و قیادت صدر ناصر کے ہاتھ آئی اور قومیت عربیہ کی وہ تیز و تند آندھی اٹھی جو عرب نوجوانوں بلکہ پختہ کار عربوں کی بھی ایک بڑی تعداد کو اڑا لے گئی، بڑے بڑے تناور درخت اور علم و ادب کی کوہ پیکر شخصیتیں اس طوفان میں پتہ کی طرح اڑتی اور اس سیلاب میں تنکے کی طرح بہتی نظر آتی تھیں، اس وقت یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ فکر اسلامی اور دعوت اسلامی کی ترجمانی کے لیے عربی کا ایک رسالہ نکالا جائے، اس وقت اس پورے تحتی براعظم میں عربی کا کوئی رسالہ نہ تھا، ندوۃ العلماء کا ارگن "الضیاء" ۱۹۳۵ء ہی میں بند ہو گیا تھا، عربی صحافت کا مزاج ایسا بگڑا تھا کہ جو لوگ اس فتنۂ عالم آشوب سے متاثر نہیں تھے اور قومیت عربیہ اور مصری قیادت پر تنقید کرنا چاہتے تھے، ان کے مضامین کا کسی اخبار و رسالہ میں چھپنا بھی دشوار تھا، اور اگر وہ کہیں چھپتے تو یہ رسائل ان غضبناک نوجوانوں کے عتاب کا نشانہ بن جاتے جو اس فلسفہ پر ایمان لا چکے تھے اور جن پر قومیت و اشتراکیت کا نشہ چھایا ہوا تھا۔

۱۹۵۵ء میں جب یہ تحریک اپنے شباب پر تھی اور سارا مشرق وسطیٰ (الا ماشاء اللہ) اس نشہ سے مست اور اپنے جامہ سے باہر ہو رہا تھا، ہم لوگوں نے عربی رسالہ کے اجراء کا ارادہ کیا، اس سے کچھ پیشتر محمد میاں کا ایک مضمون رسالہ "المسلمون" میں "العالم الاسلامی امام مفترق الطرق" (دنیائے اسلام دوراہے پر) کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ "المسلمون" اپنے عہد کا معیاری اور صف اول کا عربی رسالہ اور فکر و دعوت اسلامی کا بین الاقوامی ترجمان تھا، جس میں عالم عربی اور دنیائے اسلام کے چیدہ و برگزیدہ اہل قلم و ارباب فکر لکھتے تھے اس بلند پایہ رسالہ میں لکھنا ہر ایک کا کام نہ تھا، اس وقت صاحب مقالہ کی عمر ۲۰ سال سے بھی زیادہ نہ تھی رسالہ کے مدیر ڈاکٹر سعید رمضان اس وقت تک ہندوستان نہیں آئے تھے، وہ بالکل نہیں سمجھ سکے کہ مضمون نگار عربی کا ایک نو عمر لکھنے والا ہے جو جلد اسلامی عربی صحافت کے افق پر ستارہ بن کر چمکنے والا ہے،

۱۹۵۵ء میں "البعث الاسلامی" کے نام سے یہ رسالہ نکلا، اس کے مدیر، مالک سب کچھ محمد میاں ہی تھے، بھائی صاحب مرحوم نے اس کی سرپرستی قبول فرمائی، محمد میاں کے دوست اور دار العلوم کے لائق استاذ

مولوی سعید الرحمٰن ندوی ان کے معاون خاص تھے۔

خوش قسمتی سے اس رسالہ کو اسی حسنی گھرانے کے دو اور لائق فرزند محمد میاں کے پھوپھی زاد بھائی مولوی سید محمد رابع حسنی ندوی اور مولوی سید واضح رشید ندوی کا قلمی تعاون بھی حاصل ہو گیا، یہ دونوں بھائی (اللہ ان کی عمر میں برکت دے) عربی صحافت کی ممتاز صلاحیت رکھنے کے ساتھ انھیں جذبات و خیالات سے سرشار تھے جو محمد میاں کے سینہ میں موجزن تھے، ان چاروں نے ایک ٹیم کی طرح کام کیا، اور رسالہ کو تیزی کے ساتھ ترقی دی، جب رسالہ کی افادیت و مقبولیت نمایاں ہوئی تو ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامی نے (۱۹۶۰ء میں) اس کو ندوۃ العلماء کے ترجمان کی حیثیت سے لینے کا فیصلہ کیا، اور بھائی صاحب مرحوم کی فراخ دلی، اور محمد میاں کے ایثار سے یہ رسالہ ندوۃ العلماء کی طرف سے خوبصورت ٹائپ میں چھپنے لگا، پہلا شمارہ جو ندوۃ العلماء کی جانب سے نکلا اور جس پر "تصدر ھا ندوۃ العلماء" لکھا ہوا ہے، ۱۰ رمضان و شوال ۱۳۷۹ھ (مارچ و اپریل ۱۹۶۰ء) کا پرچہ ہے۔ اسی کے کچھ عرصہ بعد ۱۹۵۹ء سے ایک پندرہ روزہ اخبار "الرائد" بھی نکلنا شروع ہوا جس کے مدیر خصوصی مولوی محمد رابع ندوی شریک ادارت مولوی واضح رشید ندوی تھے، اور خصوصی مضمون نگار محمد میاں، اس اخبار نے رسالہ کو کمک پہونچائی اور دونوں نے مل کر صحیح خیالات کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا۔

"البعث" نے ایک ایسی حکومت، دعوت اور تحریک کے خلاف محاذ کھول دیا جو عصر حاضر کی ان تمام طاقتوں سے مسلح تھی جو کسی بڑی حکومت، وسیع ملک اور شاطر قیادت کو حاصل ہوتی ہیں، کہاں مصر کا سحر سامری اور دبدبۂ فرعونی جس کے جلو میں صحافیوں، ادیبوں، خطیبوں، مصنفین، اہل قلم کا لشکر اور ذرائع ابلاغ کے زبردست مرکز تھے، جنھوں نے اچھی اچھی مخالف عرب حکومتوں کے چھکے چھڑا رکھے تھے، کہاں یہ محدود تعداد میں معمولی ٹائپ و کاغذ پر چھپنے والا عربی کا یہ غریب رسالہ، جس کے عملہ کا حال یہ تھا کہ ع

خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گل کوزہ

لیکن اس کے صاحب ایمان نوجوان مدیر کا جوش جنوں، اس کی غیرت ایمانی اور زور قلم کی وجہ سے جس نے سید جمال الدین افغانی کے "العروۃ الوثقیٰ" کے مخصوص مقالات اور مولانا آزاد کے "الہلال" کے آتشیں اداریوں کی یاد تازہ کر دی تھی، بہت جلد اس رسالہ نے اسلام پسند حلقوں میں، جو مصر کی اس "خانہ برانداز" تحریک سے بے چینی محسوس کرتے تھے، لیکن کھل کر اپنی بیزاری کا اظہار اور مصر کی قیادت پر تنقید نہیں کر سکتے تھے

مقبولیت حاصل کرلی اور انھوں نے اس کو نہ صرف اپنے خیالات کا ترجمان سمجھا بلکہ اپنے زخموں کا مرہم اور اپنے درد کی دوا سمجھے، اس کا اندازہ ان تعزیتی خطوط اور تعزیتی نوٹس سے ہوگا جو عالم عربی کے بلند پایہ، اسلامی الفکر صحافیوں، عالموں، ادیبوں اور رہنماؤں نے اس جواں سال مسلم صحافی کی وفات پر لکھے اور جن کے متعدد نمونے مرحوم کے تازہ مجموعۂ مضامین "تناقض تحارفیہ العیون" کے آخر میں شائع ہوئے ہیں۔

البعث کے اداریوں اور مقالات کی گونج صرف اسلامی ہی حلقوں میں نہیں سنی گئی بلکہ مصر و شام کے ادبی صحافی حلقوں اور حکومت کے ایوانوں میں بھی سنی گئی، مجھے ایک باخبر و معتبر مصری دوست نے بتایا کہ صدر ناصر کو جو چند رسائل اور اخباروں کے تراشے مطالعہ کے لیئے پیش کئے جاتے تھے ان میں "البعث الاسلامی" بھی ہوتا تھا، ہندوستان کے مصری سفارت خانہ نے حکومت ہند سے اس کے خلاف احتجاج بھی کیا، اور ایڈیٹر سے جواب طلبی بھی ہوئی، لیکن انھوں نے اپنی روش نہیں چھوڑی اور ان کے زور قلم میں کوئی کمی نہیں آئی۔ راقم السطور سے مشہور عرب رہنما اور مجاہد شیخ محمد محمود الصواف (رکن مجلس تاسیسی رابطہ عالم اسلامی) نے خود ایک مرتبہ کہا تھا کہ "البعث الاسلامی" نے ناصر کو بے نقاب کرنے کے سلسلہ میں جو کردار ادا کیا ہے وہ پورے عالم عربی میں کسی رسالہ یا اخبار سے نہیں ہو سکا۔

"البعث الاسلامی" کی مقبولیت اسلامی حلقوں میں برابر بڑھتی گئی، سعودی عرب نے جو ملک فیصل مرحوم کی قیادت میں مصر کی اس تحریک کا خاص طور پر مقابلہ کر رہا تھا، خاص طور پر اس کی اہمیت محسوس کی، اور وہاں کے بعض صاحب حمیت عالموں اور شیوخ نے "حبۃ للہ" اس کی تبلیغ و اشاعت کا کام کیا، مجھے یاد ہے کہ محمد میاں جب پہلی مرتبہ (۱۳۸۶ھ/۱۹۶۷ء میں) میرے ساتھ حجاز گئے اور وہاں کے وزیر تعلیم معالی الشیخ حسن ابن عبداللہ بن حسن سے ملنے کے لئے ہم لوگ شیخ محمد محمود الصواف کی معیت میں طائف گئے تو انھوں نے بڑی گرمجوشی سے "البعث" کے جوان مدیر کا استقبال کیا اور رسالہ سے اپنی گہری دلچسپی و تاثر کا اظہار۔

اسی سفر میں (۱۳ رجب ۱۳۸۷ھ ۱۶ اکتوبر ۱۹۶۷ء کو) وہ سنگین حادثہ پیش آیا جس میں اللہ نے ہم دونوں کو بال بال بچایا، ہوا یہ کہ جب ہم طائف سے واپس آرہے تھے تو صرود مکہ میں داخل ہونے سے پہلے ڈرائیور کی آنکھ جھپک جانے کی وجہ سے گاڑی الٹ گئی، اور ایسی الٹی کہ چھت بالکل زمین پر تھی، اور چاروں پہیے دفتی کے ڈبہ کی طرح اوپر، ڈرائیور کا خیال تھا کہ ہم دونوں اب اس عالم میں نہیں ہیں اس نے لیٹے لیٹے پوچھا کہ "یا شیخ أأنت حی؟" واقعہ بھی ایسا تھا، گاڑی جب رکی تو پہلے محمد میاں باہر آئے، اور

انھوں نے کہا کہ چچا میاں باہر آجائیے، اللہ تعالیٰ نے ہم لوگوں کی مدد فرمائی، اور صاف جان بچالی، ایسا کس طرح اور کیسے ممکن ہوا، یہ محض قدرت الٰہی کا کرشمہ ہے، مفتی امین الحسینی صاحب مرحوم نے مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ آپ گاڑی سے اس طرح نکلے جیسے حضرت یونس شکم ماہی سے نکلے تھے، معلوم ہوتا ہے ابھی اللہ کو محمد میاں سے کام لینا تھا، اور "البعث الاسلامی" کے ذریعہ عالم عربی میں ہندوستان کی ایک بے سروسامان جماعت کی نحیف آواز پہونچانی تھی۔

محمد میاں کے ان زلزلہ انگیز اداریوں کا سلسلہ جاری رہا اور صحیح الفکر عرب نوجوان روز بروز ان کے گرویدہ ہوتے گئے، جس ماحول اور تربیت میں ان کا نشو و نما ہوا تھا، اس کے بالمقابل دنیائے اسلام بالخصوص عالم عربی کی مذہب بیزار اور اسلام گریز قومی، اشتراکی، بعثی، مادی تحریکیں اور دعوتیں اور بہت سے ممالک عربیہ (اور خاص طور پر ان ممالک کی جن کو دعوت اسلامی کا مرکز اور اسلامی دنیا کے لیے نمونہ ہونا چاہیئے تھا) مادہ پرستانہ زندگی نے ان کی طبیعت کے اندر ایک شدید کشمکش پیدا کردی اور (جیسا کہ میں نے ان کی معرکۃ الآرا کتاب "الاسلام الممتحن" کے مقدمہ میں لکھا ہے۔)

"ان کے قلم کو ایک ایسے آبشار میں تبدیل کردیا جو چٹانوں سے ٹکرانے کی وجہ سے ابلتا ہے، اور بڑے جوش و شور کے ساتھ گرتا ہے، اس کے نتیجہ میں ایسے مضامین ان کے قلم سے نکلے جن میں آبشار کا شور اور طوفان کا زور ہے۔"

اس کا نمونہ ان کے مجموعہ مضامین "الاسلام الممتحن" اور "تناقض تحارفیہ العیون" میں دیکھا جا سکتا ہے۔

ان کے آخری زندگی کے مضامین میں ایک اہم مضمون وہ تھا جس میں انھوں نے اس تضاد کا نقشہ کھینچا ہے جو اسلامی ممالک میں عمومیت کے ساتھ اور بعض ان عرب ممالک میں (جو اسلام کی نمائندگی، مقامات مقدسہ کی خدمت و حفاظت اور دین صحیح کی دعوت کے دعویدار اور علمبردار ہیں) وہاں کے سربراہوں اور ذمہ داروں کے اقوال و افعال اور اسلام کی تعلیمات اور وہاں کی روزمرہ زندگی میں پایا جاتا ہے، اور جس کو دور کیے بغیر نہ اسلام کی صحیح تصویر دنیا کے سامنے آسکتی ہے نہ یہ ممالک خطرہ سے نکل سکتے ہیں، انھوں نے اس مضمون میں اپنا دل نکال کر رکھ دیا تھا اور خون کے آنسو روئے تھے، یہ مضمون ان کے رسالہ "البعث" کے رجب ۱۳۹۹ھ (جولائی ۱۹۷۹ء کے) شمارہ میں "سوال حائر یحتاج الی جواب" کے عنوان سے شائع ہوا، میں اہتمام سے

البعث اور الرائد پڑھتا ہوں لیکن ان دنوں میں بعض تحریری کاموں کی تکمیل کے سلسلہ میں ایسا مشغول ہوا کہ میں یہ نمبر نہیں پڑھ سکا، ان کے حادثۂ وفات کے بعد جب مولانا منظور نعمانی صاحب کے منہ سے اس کی تعریف سنی اور انھوں نے یہ بتایا کہ انھوں نے ٹیلیفون پر ان کو اس جرأتمندانہ اور مؤثر مضمون پر دل کھول کر داد دی اور ان سے فرمائش کی کہ وہ اس کا ترجمہ خود کر دیں وہ اس کو اپنے رسالہ "الفرقان" میں شائع کر دیں گے، مرحوم کے انتقال کے بعد جب میں بمبئی سے واپس ہوا تو میں نے وہ مضمون پڑھا، اور پڑھ کر مسرت کے ساتھ یہ حسرت ہوئی کہ میں نے یہ مضمون ان کی زندگی میں کیوں نہ پڑھ لیا تھا، اگر میں ان کی زندگی میں یہ مضمون پڑھ لیتا تو ان کا ہاتھ چومتا اور پیشانی کو بوسہ دیتا، اس کا رواج نہ ہونے کی وجہ سے اگرچہ یہ بات عجیب معلوم ہوتی اور ان کے لیے آزمائش بن جاتی لیکن اس کے بغیر اس پسندیدگی کا اظہار ممکن نہ تھا جو اس مضمون کے پڑھنے سے ہوتی ہے، افسوس ہے کہ اس کی نوبت نہ آئی اور یہ حسرت دل کی دل ہی میں رہ گئی۔

شاید بہت سے لوگوں پر یہ بات گراں گزرے اور کچھ پڑھنے والے اس کو مبالغہ اور جانبداری پر محمول کریں کہ وہ اپنے اس جوش تحریر و زور قلم میں سید قطب شہید سے آنکھیں ملاتے ہوئے نظر آتے ہیں اور تعجب نہیں کہیں (ایک عجمی نژاد نوعمر اور ایک عربی الاصل پختہ کار ادیب کا فرق ذہن میں رکھتے ہوئے) ان سے بڑھ جاتے ہوں کہ فوارہ کی روانی اس کے جوش دروں کا نتیجہ ہوتی ہے اور یہ "جوش دروں" ان کو اپنے آبائے کرام اور حضرت سید احمد شہید کے تعلق و عقیدت سے ملا تھا، جس کی نظیر مشرق وسطیٰ میں (مغربی تعلیم و تربیت اور مغربی تہذیب و تمدن کے اثر سے) اگر مفقود نہیں تو قلیل الوجود ضرور ہے میں نے اپنے اس مقدمہ میں اس حقیقت نگاری کی معذرت کرتے ہوئے لکھا تھا۔

"میرا اور صاحب کتاب کا رشتہ ایک طرح سے باپ بیٹے اور استاد و شاگرد کا سا ہے، اس کتاب کا مقدمہ لکھتے وقت مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ گویا میں اپنی کسی تصنیف کا مقدمہ لکھنے جا رہا ہوں،

لہ مرحوم کی اچانک وفات نے اس کی مہلت نہ دی، خدا کو منظور تھا کہ یہ کام ان کے ہونہار فرزند سید عبداللہ حسنی ندوی کے قلم سے تکمیل پائے، انھوں نے بڑی خوبی اور کامیابی کے ساتھ اس مضمون کو اردو میں منتقل کیا جو الفرقان ماہ شوال ۱۳۹۹ھ میں "ایک تضاد جس کی کوئی توجیہ ممکن نہیں" کے عنوان سے شائع ہوا اور بہت پسند کیا گیا اور اس طرح فارسی کا وہ جملہ صادق آیا، اگر پدر نہ تواند پسر تمام کند

جس کا یہ نتیجہ ہو سکتا ہے کہ لوگ اس کو "اپنے منہ اپنی تعریف" اظہار کمال اور خود پسندی پر محمول نہ کریں اور یہ ایسی کمزوری ہے جس کو دین و شریعت اور اخلاق و تہذیب نے کبھی پسند نہیں کیا، اور میں خود بھی امکانی حد تک اس سے بچنے کی کوشش کرتا رہا ہوں۔

لیکن جب میں نے اپنے اس احساس کا حقیقت پسندانہ اور غیر جانبدارانہ جائزہ لیا اور اس کا تجزیہ کیا تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں درحقیقت لوگوں کے تبصرہ اور قیل و قال سے ڈر رہا ہوں، اس خوف و احساس نے اس مسئلہ کو غیر شعوری طور پر ایک اخلاقی رنگ دے دیا ہے، میں طبیعت کی اس کمزوری کو ایک اخلاقی کمزوری سمجھ رہا ہوں، میں نے محسوس کیا کہ اگر میں نے اس جذبہ و احساس کے سامنے سپر ڈال دی اور اس خوف سے ایک قابل قدر کتاب کا مقدمہ لکھنے سے باز رہا کہ وہ میرے ایک خورد اور عزیز کی کتاب ہے تو میں ایک خیالی اخلاقی کمزوری اور کوتاہی کا ارتکاب کروں گا، اس لیے کہ قرآن کی اخلاقی تعلیمات جہاں اعزہ و اقارب (اگر وہ برسر باطل ہوں) کے خلاف شہادت دینے کو ضروری قرار دیتی ہیں وہیں ان اعزہ و اقارب کے حق میں (اگر وہ برسر حق ہوں) شہادت دینے کو بھی واجب گردانتی ہیں، قرآن مجید میں جہاں یہ فرمایا گیا ہے۔

یاایھا الذین امنوا کونوا قوامین بالقسط شھداء للہ ولو علیٰ انفسکم اوالوالدین[1]

اے ایمان والو! انصاف کے علمبردار بنے رہو، اور اللہ کے لیے گواہی دینے والے بنو، خواہ یہ گواہی تمہاری اپنی ذات، ماں باپ اور عزیزوں کے خلاف پڑے۔

وہیں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی ہے۔

ان اللہ یامرکم ان تؤدوا الامانات الی اھلھا، واذا حکمتم بین الناس ان تحکموا بالعدل ان اللہ نعما یعظکم بہ ان اللہ کان سمیعًا بصیرا[2]

خدا تم کو حکم دیتا ہے کہ امانت والوں کی امانتیں ان کے حوالہ کر دیا کرو، اور جب لوگوں میں فیصلہ کرنے لگو تو انصاف سے فیصلہ کرو، خدا تمھیں بہت خوب نصیحت کرتا ہے، بے شک خدا سنتا اور دیکھتا ہے۔

---

[1] النساء ۱۳۵ [2] النساء ۵۸

اس نابغہ، جواں سال جس نے اپنی عمر کی صرف ۴۴ بہاریں دیکھیں، اسلام کے اس پرجوش داعی وسپاہی اور اس پر مستزاد اپنے گھر کے اس "گوہر شب چراغ" اور لختِ جگر کے انتقال سے دل ودماغ پر جو گزری اور گزر رہی ہے اس کو امیر خسرو کے اس شعر پر ختم کرتا ہوں جو انھوں نے کسی ایسے ہی حادثہ پر اپنے مالک حقیقی کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا، کہ حقیقت حال کی عکاسی اور دل کی ترجمانی اس سے بہتر نہیں ہو سکتی۔

جاں زتن بُردی و در جانی ہنوز
در دہا دادی، و در مانی ہنوز

سدِّ ایمانی

اخلاقی پستی کے اس طوفان بلاخیز کے لئے جو پورے ملک اور معاشرے کو اپنے لپیٹ میں لے رہا ہے۔ کسی ڈیم کا خیال ہمارے دماغ میں نہیں آتا۔

نیل و فرات راوی وجہلم اور گنگا وجمنا کے محدود سیلابوں کے نقصانات اور تباہ کاریاں تسلیم لیکن بداخلاقی، کرپشن، بے حیائی و بدمستی اور دولت کی پوجا کا جو سیلاب آج ہر سوسائٹی میں (مسلم وغیر مسلم کی تفریق کے بغیر) گلے گلے بہہ رہا ہے۔

یہ اینٹ پتھر یا سیسہ اور فولاد کی کوئی سد سکندری نہیں، خدا کے خوف، دوسری زندگی کے یقین، حیا، وغیرت، سچی انسانیت دوستی، ضمیر کے محاسبہ اور سچائی وحق پرستی کی وہ سدایمانی ہے، ان ڈیموں اور پشتوں سے کہیں زیادہ اہم ہے، جو پانی کے بچاؤ یا پانی کی حفاظت یا آبپاشی اور بجلی کے لئے قائم کئے جاتے ہیں اور ان پر کروڑوں اور اربوں روپیہ، دل ودماغ کا سب سے قیمتی سرمایہ، اور انسانی کاوش کا بہترین نچوڑ آسانی سے صرف کر دیا جاتا ہے۔

(مولانا محمد الحسنی ندوی مرحوم)

مولانا محمد الحسنی

ــــ مدیر "البعث الاسلامی"

مولانا محمد منظور نعمانی

اکثر ناظرین کو یہ بھی معلوم ہو چکا ہوگا کہ رفیق محترم مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندوی کے اکلوتے حقیقی بھتیجے اور دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے شہرۂ آفاق عربی جریدہ "البعث الاسلامی" کے مدیر مولانا محمد الحسنی جو اپنی بعض خداداد خصوصیات اور وہبی کمالات کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کی ایک نشانی تھے، اور جن کی عمر ابھی صرف ۴۴ سال کی تھی۔ صرف چند گھنٹے کی علالت کے بعد ہماری اس دنیا سے اٹھا لیے گئے۔ انّ للّٰہ ما اخذ ولہ ما اعطیٰ وکلّ شیٔ عندہٗ باجل مسمّیٰ۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء کے سابق مہتمم مولانا محمد عمران خاں صاحب ندوی ازہری، مولانا علی میاں کے بارے میں فرمایا کرتے ہیں کہ "رَجُلٌ مَوْھُوْب" (یعنی ان کے پاس جو کچھ ہے وہ کسبی نہیں، وہبی ہے، انھوں نے محنت کر کے حاصل نہیں کیا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے خزانۂ کرم سے یوں ہی عطا فرما دیا ہے) ــــ واقعہ یہ ہے کہ یہ بات مولانا علی میاں سے کہیں زیادہ ان کے مرحوم بھتیجے مولانا محمد الحسنی پر صادق آتی تھی۔

اب سے ۳۲ سال پہلے ۱۹۴۶ء کی بات ہے جب راقم سطور نے مولانا علی میاں کے مشورہ بلکہ ان ہی کی تحریک پر "الفرقان" کو بریلی سے منتقل کرنے اور خود بھی منتقل ہونے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس وقت اپنی رہائش اور الفرقان کے دفتر کے لیے جو مکان کرایہ پر ملا تھا وہ گوئن روڈ پر مولانا علی میاں اور ان کے برادر بزرگوار مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی (علیہ الرحمہ) کے مکان کے گویا بالکل برابر میں تھا۔ عزیز مرحوم مولانا محمد الحسنی ڈاکٹر صاحب کے اکلوتے صاحبزادے تھے۔ ان کو سب "محمد میاں" کہتے تھے اس وقت وہ دس گیارہ سال کے بچے تھے لیکن میں نے کبھی ان کو بچوں کے ساتھ یا بچوں کی طرح کھیلتے نہیں دیکھا، بولتے بھی بہت کم ہی تھے۔ دریافت کرنے سے معلوم ہوا تھا کہ پڑھنے کے لیے کسی اسکول یا مکتب مدرسہ میں بھی نہیں جاتے ہیں، والد ماجد ڈاکٹر صاحب خود ہی ان کو قرآن پاک باترجمہ پڑھاتے ہیں اور اسی کے ذریعہ عربی تعلیم بھی ہو رہی ہے اور مصر وغیرہ سے آنے والے عربی اخبارات کا مطالعہ بھی کراتے ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ صرف ونحو کوئی کتاب اُن کو نہیں پڑھائی گئی ہے اور نہ پڑھانے

کا ارادہ ہے۔

کچھ عرصہ کے بعد سُنا کہ محمد میاں عربی میں مضمون نگاری کرنے لگے ہیں۔ ہم جیسوں کو بجا طور پر حیرت ہوگی کہ جس شخص نے صرف و نحو بالکل نہیں پڑھی۔ جو ماضی مضارع، معرب، مبنی، مرفوع، منصوب، مجرور، منصرف، غیر منصرف کو نہیں جانتا، وہ عربی کا کوئی جُملہ بھی کیسے صحیح لکھ سکتا ہے۔ لیکن اللہ کی شان اور اس کی قدرت کی کارفرمائی کہ محمد میاں صرف و نحو سے بالکل ناواقف اور نابلد ہونے کے باوجود بہت اچھی عربی لکھنے لگے اور جلد ہی وہ وقت آگیا کہ عالم عربی کے بعض بلند پایہ رسالوں میں مضامین بھیجنے لگے اور ان رسالوں میں وہ مضامین بڑے اہتمام اور بڑی قدر سے غالباً یہ سمجھ کر شائع کیے گئے کہ یہ ہندوستان کے کسی علامہ کے قلم سے لکھے ہوئے ہیں۔ اس سلسلہ کا ان کا پہلا مضمون مشہور اخوانی زعیم سعید رمضان کے ماہنامہ "المسلمون" میں شائع ہوا تھا۔ جو اس زمانہ میں دمشق سے نکلتا تھا اور عالم عربی کا بلند پایہ اور بہت ہی موقر مجلہ تھا۔

پھر اُن کی عمر کا ۲۰ واں سال تھا کہ انھوں نے خود اپنا ایک عربی رسالہ جاری کرنے کا فیصلہ کیا۔ اور "البعث الاسلامی" کے نام سے ایک بلند معیار عربی ماہنامہ اکتوبر ۱۹۵۵ء سے جاری ہوگیا۔ اس وقت وہ ان کا ذاتی رسالہ تھا، ان کا گھر ہی اس کا دفتر تھا، وہ خود ہی اس کے لیے مضامین لکھتے، خود ہی کتابت کراتے اور چھپواتے اور خود ہی ڈاک سے اس کو روانہ کرنے کا اہتمام کرتے۔ "خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گل کوزہ"۔

راقم سطور کی طرح جو لوگ اس لائن سے کچھ واقفیت رکھتے ہیں وہی سمجھ سکتے ہیں کہ اپنی ذات کے بل بوتے پر ہندوستان سے عربی رسالہ نکالنے کا فیصلہ کیسی ہمت مردانہ اور مالی اعتبار سے کتنے خسارے کا سودا تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ۲۰ سالہ محمد میاں کو یہ ہمت بخشی۔ جلد ہی "البعث الاسلامی" عربی ممالک میں مقبول اور ساتھ ہی خود کفیل ہونے لگا۔

پھر ۱۹۵۹ء میں جب کہ اس کی عمر کا چوتھا سال تھا اور جیسا کہ عرض کیا گیا عرب ممالک میں اس کو اچھی مقبولیت حاصل ہوگئی تھی، ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامیہ کے ایک جلسہ میں (جس میں راقم سطور بھی بحیثیت رکن انتظامی شریک تھا) اس تجویز پر گفتگو ہوئی کہ "البعث الاسلامی" کو ندوۃ العلماء کی تحویل میں لے لیا جائے، اور اس کی اشاعت کا اہتمام و انتظام ندوۃ العلماء کی طرف سے ہو۔ اور مولانا محمد میاں اسی طرح اس کے مدیر اور ذمہ دار رہیں تو یہ ندوہ اور اس کے دارالعلوم کے لیے خاص کر عرب ممالک میں ان کے تعارف کے لیے بہت مفید ہوگا۔

غور و بحث کے بعد مجلس نے اس تجویز کو منظور کرلیا۔ مولانا محمد میاں صاحب کی طرف سے اُن کے والد ماجد ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحبؒ نے (جو خود ندوۃ العلماء کے ناظم تھے) اس کی منظوری دے دی — اور "البعث الاسلامی" کی ملکیت ندوۃ العلماء کی طرف منتقل ہوگئی۔ کسی معاوضہ کا کوئی ذکر ہی نہ آیا، بلکہ مولانا محمد میاں کے لیے ان کی محنت اور کارکردگی کا کوئی الاؤنس بھی مقرر نہیں کیا گیا اور وہ اسی شغف اور عرق ریزی کے ساتھ دن رات ایک کرکے اس کا کام کرتے رہے اور اس کا معیار بلند سے بلند تر ہوتا چلا گیا۔

قریباً دو سال کے بعد جب ان کے والد ماجد ڈاکٹر صاحب وفات پا گئے تو ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامیہ کے ایک جلسہ میں ان کے لیے "البعث الاسلامی" کی ادارت اور تمام تر کارکردگی کے سلسلہ میں صرف ۱۰۰ روپے کا الاؤنس منظور کیا گیا، انھوں نے اس کو بھی بہ خوشی قبول کرلیا، حالانکہ اس وقت بھی ندوۃ العلماء کے دفتر کے بعض محرّروں کی تنخواہ اس سے زیادہ تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی فطرت کو ان چیزوں سے بالکل بے نیاز بنایا تھا لیکن ان کی اس قناعت اور قربانی کا صلہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی شان عالی کے مطابق ملا اور "البعث الاسلامی" ہی کے سلسلہ سے ان کے لیے "یَرْزُقُهُ مِنْ حَیْثُ لَا یَحْتَسِبُ" کی ایک شکل پیدا ہوگئی۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا۔ وہ عربی زبان کی صرف و نحو سے بالکل ناواقف تھے (راقم سطور نے خود مولانا علی میاں سے سُنا ہے کہ غالباً اُن کو ماضی کی پوری گردان بھی یاد نہ ہوگی) لیکن البعث الاسلامی" میں ان کی جو تحریریں شائع ہوتی تھیں، وہ زبان کے لحاظ سے عالم عربی کے مشاہیر اہل قلم کی تحریروں کے ہم پلّہ ہوتی تھیں۔ ان کے مضامین کا ایک مجموعہ "الاسلام الممتحن" کے نام سے شائع ہو چکا ہے، اس کو دیکھ کر آج بھی ہر وہ شخص جس میں اس کی اہلیت ہو یہ موازنہ کر سکتا ہے۔

وہ زبان و اسلوب میں (عربی میں بھی اور اُردو میں بھی) مولانا علی میاں کا ایسا تتبع کرتے تھے کہ گویا ان کا مثنّٰی اور "دوسری کاپی" بن گئے تھے لیکن ادھر کچھ دنوں سے بعض وہ حضرات جن کا احساس و اندازہ اس باب میں معتبر ہو سکتا ہے، محسوس کرتے تھے کہ ان کے قلم میں خاص کر عربی تحریر میں مولانا سے بھی زیادہ طاقت آگئی ہے۔ خود مولانا علی میاں بھی کبھی کبھی اس کا اظہار فرماتے تھے۔

اُن کا شاہکار اور آخری یادگار:۔

۱۱ جون دوشنبہ کی شام کو اسی مہینے جون (مطابق رجب) کا "البعث الاسلامی" کا شمارہ میرے

پاس آیا۔ مغرب و عشاء کے درمیان میں نے سب سے پہلے اس کا افتتاحیہ پڑھا۔ جو عزیز مرحوم کے قلم کا لکھا ہوا تھا، اس کا عنوان تھا "سوال حائر یحتاج الی جواب" یہ، صفحے کا مضمون تھا، اس میں ممالک اسلامیہ عربیہ خاص کر سعودی مملکت کے ذمہ داروں سے وہ باتیں صاف صاف کہی گئی تھیں جن کا اسی طرح صاف صاف کہا جانا ان کی خیر خواہی کا بھی تقاضا تھا اور از روئے دین اب فرض ہو گیا تھا، اور اس فرض کو اب وہی مرحوم ادا کر سکتا تھا جس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی خاص توفیق عطا ہو۔ اس کو پڑھ کر میں نے محسوس کیا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمارے مولانا محمد الحسنی کو یہ سعادت بخشی گئی ہے کہ بہتر سے بہتر اور مؤثر سے مؤثر انداز میں انھوں نے یہ فرض ادا کر دیا۔ میں نے اس افتتاحیہ کو ان کے قلم سے "ندائے غیب" سمجھا، اور طے کر لیا کہ اس کو اردو میں منتقل کرا کے "الفرقان" میں شائع کرنا ہے۔

اگلے دن (۱۲ جون سہ شنبہ) فجر کی نماز کے بعد ہی میں نے مولانا محمد میاں کو فون کیا۔ ان کے مضمون کے بارے میں اپنا تاثر ان کو بتلایا اور اُن سے فرمائش کی کہ وہ اس کو جلدی زیادہ سے زیادہ بس دو تین دن میں "الفرقان" کے لیے اُردو میں منتقل کر دیں یا کسی سے کرا دیں۔ انھوں نے کہا بہت اچھا! انشاء اللہ ہو جائے گا۔ اللہ کے سوا کسی کو بھی علم نہ ہوگا کہ آج ہی کا دن ان کی زندگی اور اُن کے کام کا آخری دن ہے اور کل ہی اُن کا سفر آخرت ہے۔

عزیز مرحوم مولانا محمد میاں کو اللہ تعالیٰ نے جس طرح اپنے خاص فضل سے غیر عادی طریقہ پر وہ علمی و قلمی کمال عطا فرمایا تھا جس کا ذکر اوپر کیا گیا، اسی طرح بلکہ اس سے بھی بڑا فضل و انعام ان پر، ان کے رب کریم نے یہ فرمایا تھا کہ جس تزکیۂ نفس اور اصلاح اخلاق کے لیے طالبین صادقین برسوں اصحاب ارشاد و مشائخ کی تربیت میں رہتے اور ریاضتیں کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے یہ بے بہا دولت بھی اُن کو اپنے فضل خاص ہی سے عطا فرما دی تھی۔

معلوم ہوتا تھا کہ کبر، غصہ، حسد، کینہ، بخل جیسے رذائل ان کی فطرت سے نکال دیے گئے ہیں، اور محاسن اخلاق بھرپور عطا فرما دیے گئے ہیں۔ ذالك فضل الله يوتيه من يشاء والله ذوالفضل العظيمه

(الفرقان جولائی ۱۹۷۹ء)

جواں مرگ محمد الحسنی

مولانا صبر السلام قدوائی ندوی مرحوم

جون کا معارف طباعت کے آخری مرحلہ میں تھا کہ اچانک اطلاع ملی کہ ندوۃ العلماء کے نقیب رسالہ البعث الاسلامی کے مدیر مولوی محمد الحسنی کا انتقال ہو گیا، یہ خبر اتنی خلاف توقع تھی کہ بڑی دیر تک یقین نہیں آیا۔ ان کی عمر زیادہ نہیں تھی، چالیس سے تین ہی چار سال آگے بڑھے ہوں گے، صحت بھی اچھی تھی کبھی کسی طویل یا شدید بیماری میں مبتلا نہیں ہوئے تھے، جب ملاقات ہوتی ہشاش بشاش نظر آتے۔

یہ سچ ہے کہ جو آیا ہے اسے ایک دن جانا ضرور ہے کل نفس ذائقة الموت لیکن کسے معلوم تھا کہ ان کا وقت موعود اتنا قریب ہے، ہم لوگوں کے سامنے تو بچے تھے ان کی پیدائش کل کی بات معلوم ہوتی ہے، ہم کس طرح خیال کرتے۔ کہ وہ ہم سے پہلے رخت سفر باندھ لیں گے، لیکن ان کے دوستوں اور ہم سنوں کو بھی اس تیز روی کا گمان نہیں تھا، ان کی جسمانی ساخت اور صحت کی رفتار دیکھ کر سبھی عمر طویل کی پیشین گوئی کرتے تھے لیکن ظاہر بینوں کے یہ سارے اندازے غلط ثابت ہوئے اور اللہ کی مشیت پوری ہو کر رہی۔ تقدیر کے سامنے تدبیر نے سپر ڈال دی اور انسان کی مجبوری و بے بسی ہی نہیں خام خیالی اور غلط اندیشی بھی نمایاں ہو گئی۔

مصلحت ایزدی تھی کہ وہ چھوٹی عمر ہی میں اس دنیا سے کوچ کر جائیں۔

تقدیر الٰہی کے رازہائے سربستہ کی نقاب کشائی انسان کے بس میں نہیں ہے اس کا علم ناقص، اس کی نظر کوتاہ اور اس کا علم محدود ہے۔ ان حالات میں وہ حکمت الٰہی کا احاطہ کس طرح کر سکتا ہے، عالم غیب ہماری نگاہوں سے اوجھل ہے، ہم ظاہر بیں باطن کے حقائق سے ناواقف ہیں۔ البتہ اللہ کی مصلحت پر ہمارا ایمان ہے اور یہ یقین رکھتے ہیں کہ اس کا کوئی فعل مصلحت سے خالی نہیں ہے

یہ ہماری کم نگاہی ہے کہ موت کو زندگی کا خاتمہ سمجھتے ہیں، اس سے تو حیاتِ نو کا آغاز ہوتا ہے، دنیا مطیۃ الآخرۃ ہے انسان اس جہاں فانی سے گزر کر عالم جاودانی میں قدم رکھتا ہے جہاں اسے مادہ کے جامۂ تنگ کو اتار کر خلعت لامحدود عطا ہوتی ہے اور فنا کے گھاٹ سے اتر کر بقائے دوام نصیب ہوتا ہے، اسے انحطاط وزوال کے خوف سے نجات ملتی ہے اور عروج مسلسل اور ارتقائے پیہم کی مسرت سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملتا ہے۔

محمد میاں اب ہمیں نظر نہیں آتے ہیں، لیکن یہ ہماری نظر کی کوتاہی اور نگاہ کی نارسی ہے اگر مادیت کا حجاب حائل نہ ہوتا تو ہم دیکھتے کہ وہ لاخوف علیھم ولاھم یحزنون کے عالم میں پہنچ کر فرحین بما اٰتاھم اللہ من فضلہٖ کے زمرہ میں شامل ہوگئے ہیں۔ وہاں نزلا من غفور رحیم کے مزے لے رہے ہیں اور پسماندگان کو خوف وحزن سے نجات کی بشارت سنا رہے ہیں وذالك فضل اللہ یؤتیہ من یشاء واللہ ذوالفضل العظیم اللہ کا ہاتھ پکڑنے والا کون ہے وہ جسے جو چاہے دے، وہ سمیع وبصیر، علیم وخبیر ہے، وہ دلوں کی آواز سنتا اور نیتوں کے خلوص کو دیکھتا ہے، وہ ماضی سے آگاہ، حال سے باخبر اور مستقبل سے واقف ہے، اس کے یہاں مزدور پابند وقت نہیں بلکہ مزدور کے حسن عمل اور صلاحیت کار پر موقوف ہے۔ کسی کو سارے دن کی جانکاہی کے بعد چند پیسے ملتے ہیں اور کسی کو صرف چند منٹ کی کارگزاری پر اشرفیاں عطا ہوتی ہیں، قلت وکثرت کا فیصلہ مالک کی نظر پر منحصر ہے، اس کو کسی کا کام پسند آجائے تو تھیلیوں کے منہ کھول دیتا ہے۔

محمد میاں نے عمر بہت کم پائی اس زندگی کی چوالیس بہاریں بھی پورے طور پر دیکھ نہ پائے کہ ادھی آنکھیں بند ہوگئیں اور روح فنا کے مرحلے سے گزر کر بقا کی منزل میں پہنچ گئی، وہ ڈاکٹر عبدالعلی مرحوم کی آخری اولاد تھے، پانچ بیٹیوں کے بعد اللہ نے انھیں یہ بیٹا عطا کیا تھا، سارے خاندان میں خوشی کی لہر دوڑ گئی، ڈاکٹر صاحب بھی مسرور ہوئے، انھوں نے اس نعمت پر اللہ کا شکر ادا کیا اور طے کر لیا کہ اس عطیۂ ربانی کو اس کی راہ میں لگائیں گے لوگ سمجھتے تھے کہ وہ اپنی طرح دینی ودنیاوی تعلیم دلا کر اس بچے کو ڈاکٹر بنائیں گے لیکن ڈاکٹر صاحب کے سوچنے کا انداز دوسرا تھا وہ اللہ کے دین اور اس کے بندوں کی خدمت کے قائل ضرور تھے مگر موقع اور محل اور حالات وضروریات کے پیش نظر وہ خدمت کی

نوعیت اور دائرۂ کار کا یقین کرتے تھے، محض مادی نفع تو کبھی ان کا مطمح نظر نہیں رہا۔ وہ خالص دنیاوی کاموں میں بھی روحانی قدروں کو پیش نظر رکھتے تھے اور رضائے الٰہی کی طلب سے کبھی غافل نہ ہوتے تھے۔ مگر اس بارہ میں بھی وہ ادنیٰ واعلیٰ نظر رکھتے تھے، انھوں نے محمد میاں کی تعلیم وتربیت میں بھی یہ نقطۂ نظر پیش نظر رکھا، وہ نصاب ونظام تعلیم کے بارے میں تقلید کے بجائے اجتہاد کے قائل تھے اور خوب سے خوب تر کی فکر میں رہتے تھے، پہلا تجربہ انھوں نے اپنے چھوٹے بھائی (علی میاں) پر کیا پھر اسی روشنی میں محمد میاں کے لئے بھی نصاب وطرز تعلیم کا ایک مؤثر اور تیز رفتار لائحہ عمل مرتب کیا، مجھے یاد ہے کہ تجربہ کار مدرسین اس پر سخت تنقید کرتے تھے اور وثوق کے ساتھ اس کی ناکامی کی پیشین گوئی کرتے تھے مگر ڈاکٹر صاحب اپنی رائے پر جمے رہے، بالآخر ان کی رائے صحیح ثابت ہوئی اور محمد میاں قواعد وضوابط کے پرپیچ راہوں سے گزرے بغیر ادب وانشا کی ایسی بلند منزل تک پہنچ گئے جس پر لوگ رشک کرتے تھے، ان کی تحریریں فصاحت وبلاغت، زور کلام، قوت استدلال اور انداز بیان کا بہترین نمونہ ہوتی تھیں ان کے مضامین عرب ملکوں میں بھی قدر کی نگاہ سے دیکھے اور دلچسپی سے پڑھے جاتے تھے، وہ مقرر نہ تھے مگر جب کبھی مجمع کے سامنے کوئی مضمون پڑھتے تو سامعین ہمہ تن گوش ہو جاتے۔

اللہ نے ان کے دل کو اسلام کی محبت اور ملت کے درد سے سرشار کر دیا تھا، باپ کی تربیت اور صاحبانِ علم وبصیرت کے فیضانِ نظر نے اس نشہ کو دو آتشہ بلکہ سہ آتشہ بنا دیا تھا، ابھی شعور کی آنکھیں ٹھیک سے کھلنے بھی نہیں پائی تھیں کہ وہ اسلام کی خدمت اور ملت کی تنظیم کے خواب دیکھنے لگے۔ اس غرض سے ایک سوسائٹی کی تشکیل کی اور اسلام کی بین الاقوامی زبان عربی میں ایک اعلیٰ درجہ کے رسالہ کے اجرا کا منصوبہ بنایا، ان کے حسن نیت نے اس خیال کو مقبولیت عطا فرمائی اور البعث الاسلامی کے نام سے ایک وقیع رسالہ جاری ہوگیا، اور ملل اسلامیہ کے درمیان ربط ونظم کی طرح پڑ گئی، جس نے آگے چل کر ایک مؤثر اور مضبوط نظام کی شکل اختیار کی، ندوۃ الشباب العالمیۃ اور رابطۃ العالم الاسلامیہ دونوں ان کے خواب کی تعبیر ہیں ان کے قلم کا اثر روز بروز بڑھ رہا تھا اور مصر وشام، نجد وحجاز اور دوسرے عرب ممالک میں ان کے مضامین بڑے شوق سے پڑھے جاتے تھے، ان کا ایک مجموعہ کتابی شکل میں شائع ہو چکا ہے

مزید کتابیں زیر ترتیب تھیں لیکن ع

آں قدح بشکست وآں ساقی نہ ماند

عربی کے ساتھ وہ اردو کے بھی بہت اچھے انشار پرداز تھے، اس کم عمری میں انھوں نے کہن سال مصنفین سے خراج تحسین وصول کیا، مولانا محمد علی مونگیری کی ضخیم سوانح عمری کے علاوہ تصانیف وتراجم کا ایک سلسلہ یادگار ہے، مشہور صاحب علم جرمن مسلمان لیوپولڈ اسد کی کتاب "روڈ ٹو مکہ" (ROAD TO MECCA) کا ترجمہ "طوفان سے ساحل تک" کے نام سے ایسا رواں اور شستہ کیا کہ اہل زبان عش عش کرنے لگے، مولانا ابوالحسن علی کی تحریروں کے بڑے باکمال مترجم تھے. ان کی بہت سی کتابوں اور رسالوں کو عربی سے اردو اور اردو سے عربی میں منتقل کیا ہے اور ابھی چند ماہ ہوئے ان کی ضخیم سیرت نبوی کا ترجمہ اس خوبی کے ساتھ اردو میں کیا کہ اصل کا گمان ہوتا ہے، علی میاں ان کی ترجمہ نگاری کے بڑے مداح تھے اور کہا کرتے تھے کہ محمد میاں نقل کو اصل بنا دیتے ہیں۔

علم وادب میں اس کمال کے ساتھ وہ تہذیب وشائستگی اور شرافت ومتانت کا بھی بہترین نمونہ تھے۔ خوردوں کے ساتھ شفقت ومحبت سے پیش آتے، دوستوں کی دلداری ودلنوازی کی کوشش کرتے۔ بزرگوں کی تعظیم وتوقیر کا ہمہ وقت خیال رکھتے اور ہم نشینوں کی خوشنودی کی فکر کرتے۔ اجنبی آدمی سے بھی ملاقات ہوتی تو مسکراتے ہوئے ملتے۔ ان کے چہرہ کی بشاشت اور خندہ جبینی ان کی لطافت، طبع اور پاکیزگی قلب کی ترجمان تھی۔ ان کی کس کس بات کو یاد کیا جائے۔ ع

کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جاست

جی چاہتا تھا کہ ابھی کچھ دن اور زندہ رہتے، اپنے بچوں کی بہار دیکھتے۔ گھر والے ان کو دیکھ کر خوش ہوتے، عزیزان کے حسن سلوک سے مستفید اور دوست ان کی شگفتہ مزاجی اور بذلہ سنجی سے محظوظ ہوتے اور ان کے دل ان کی باغ وبہار طبیعت سے باغ باغ ہوتے، ملک وملت کی خدمت کے نئے نئے میدان تلاش کرتے، ان کا شہپر قلم نئی وادیوں میں قدم رکھتا۔ اس کی جولانیاں نئے معرکے سر کرتیں اور وہ اپنی

سحر آفریں تحریروں سے دلوں کو مسخر کرتے لیکن ع

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

مشیت ایزدی کے سامنے کسے مجال دم زدن ہے۔ بندگی تسلیم ورضا کی طالب ہے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون ہ

مکمل اعتماد

مقصد خواہ کتنا ہی رفیع ہو، عقیدہ خواہ کتنا ہی مضبوط ہو، جذبہ چاہے جتنا بھی طاقتور ہو، اگر اس کے راستہ پر (جو اس مقصد کے حصول کے لئے ہم نے اختیار کیا ہے) ہم کو پورا بھروسہ نہیں، ہم پورے اعتماد ویقین کیساتھ اسکی دعوت نہیں دے رہے ہیں، ہمارے لہجہ میں وہ بے خوفی یا وہ استحکام نہیں ہے جو کسی مشاہدہ یا مشاہدہ کے درجہ والے یقین یا اپنے مسلسل تجربہ کے نتیجہ میں پیدا ہوتا ہے تو ہماری یہ دعوت کبھی زیادہ وسعت اختیار نہیں کر سکتی،

لیکن طریقۂ کار، مسلک اور طرز فکر پر یہ یقین تعصب کے ہر شائبہ، انتہا پسندی، مبالغہ آرائی یا سخت گیری کے ہر اثر سے پاک ہونا چاہیئے، اس کا رخ تعمیری ہونا چاہیئے نہ کہ تخریبی، مثبت نہ کہ منفی، مصالحانہ نہ کہ جارحانہ۔ اجتماعیت کی روح کے ساتھ نہ کہ انفرادیت پسندی یا خود پسندی کے جذبہ کے ساتھ۔

اگر چلنے والوں کو اپنے راستہ کی سمت اور صحت کا یقین نہیں ہے تو اس کا سب سے پہلا نتیجہ یہ نکلے گا کہ وہ ان لوگوں کے نعروں اور ان تحریکوں اور دعوتوں کا شکار آسانی کے ساتھ ہو جائیں گے جو اپنی راہ ومنزل پر نسبتاً زیادہ یقین رکھتی ہیں۔

(مولانا محمد الحسنی ندوی مرحوم)

شاخ ثمرور کی طرح خمیدہ سر

مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی کے نام مکتوب

از: مفتی سیّد سیّاح الدین کاکاخیل
(رکن اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان)

گذشتہ سال شعبان میں آپ حضرات سے آخری ملاقات ہوئی تھی۔ اس کے بعد بارہا آپ کی خدمت میں عریضہ ارسال کرنے کا ارادہ کرتا رہا۔ مگر میری بدقسمتی کہ مجھے اتنی فرصت نہیں مل سکی کہ حسب خواہش مفصّل عریضہ لکھ سکوں۔ مصروفیات زیادہ ہوگئی ہیں اور قویٰ کمزور ہوگئے ہیں اور قوّت کار میں کمی آگئی ہے۔ اور اِدھر اُدھر کے اسفار کی وجہ سے جسمانی مصروفیت کے علاوہ ذہنی پریشانی بھی ہوتی ہے اور اس کا مجھے ہمیشہ افسوس رہا کہ آپ سے مکاتبت اور استفادے کا سلسلہ جاری نہیں رکھ سکا۔ اگرچہ آپ کی یاد ہمیشہ رہی اور صحت وعافیت اور درازیٔ عمر کی دعائیں کرتا رہا ہوں۔ اور آپ کی تصانیف کا بار بار مطالعہ کرکے حظّ بھی اٹھاتا ہوں اور یاد بھی تازہ کرتا ہوں ؎

اے غائب از نظر کہ شدی ہمنشین دل — می بینمت عیاں و دعا می فرستمت

کل کسی صاحب نے اخبار "جسارت"، کراچی کے حوالے سے دفعۃً یہ غم انگیز و روح فرسا خبر سنادی کہ لکھنؤ میں مدیر "البعث الاسلامی" محمد الحسنی کا انتقال ہوگیا ہے۔ خبر سنتے ہی دل کو بے اختیار صدمہ ہوا مگر چونکہ یہ خبر طبیعت کو گوارا نہ تھی اس لئے میں نے تاویل کی، کہ خبر کسی اور کے بارے میں ہوگی یا خبر کی نوعیت کچھ اور ہوگی، اس لئے یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا مگر تحقیق کرنے کا خیال تو پیدا ہوا۔ اخبار جسارت کا وہ شمارہ منگوایا، تو ادارۂ نشریات وتحقیقات اسلام کراچی کے اعظم جناب فضل ربی ندوی کے حوالے سے پوری خبر تھی جس کو پڑھ کر حقیقت معلوم ہوئی اور میری ساری تاویلوں اور امیدوں پر پانی پھر گیا اور دل پر چوٹ لگی اور زبان سے انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا۔

طوی الجزیرۃ حتی جاءنی خبرٌ — فزعت فیہ بآمالی الی الکذب

حتی اذا المیدع لی صدقۃ املا — شرقت بالدمع حتی کاد یشرق لی

میں کیا عرض کروں۔ اخی المحترم مرحوم کے کن کن کمالات علمی اور اخلاقی کا نقشہ سامنے آیا۔ البعث الاسلامی کا جو بھی تازہ پرچہ آتا۔ میں ضرور ان کی نگارشات قلم کو بڑے ذوق وشوق اور علمی استفادہ کی نیت سے بہ غور مطالعہ کرتا۔ بارہا بعض نکات اور جملوں پر قلبی جذبات تحسین وآفریں کی فراوانی کی بناء پر دعائیں دیتا۔ ان کے محاسن اعمال واخلاق کا صحیح ادراک تو آپ کو ہے، مجھے آپ کا وہ جملہ اچھی طرح یاد ہے کہ گذشتہ سال کراچی میں ایک صاحب نے جو ناصر کی حمایت کی اور آپ نے پُرجوش انداز میں دلائل کے ساتھ جو اسکی تردید فرمائی تو اس سلسلہ میں آپ نے فرمایا تھا کہ، یہ محمد الحسنی میرے ایسے عزیز بڑے بھائی کا لڑکا ہے جو میرے والد کی طرح میرے مربی اور والد کے قائم مقام تھے۔ اس سے بڑھ کر دوسرا کوئی میرا عزیز نہیں اور یہ مجھے بہت پیارا ہے۔ لیکن اگر یہ بھی ناصر کا حامی بن جائے تو میں اس کو دینی غیرت کی بنا پر چھوڑ دوں گا۔ آپ کے ان جملوں سے مجھے یہ اندازہ ہوا تھا کہ مرحوم کے ساتھ آپ کا کتنا گہرا قلبی تعلق تھا، اس لئے میں نے محسوس کیا کہ جب اُن کی مفارقت کی اس خبر سے میں نے اپنی طبیعت متاثر اور بے حد مغموم پایا اور قلب کو انتہائی صدمہ پہنچا تو آپ کے حساس اور محبّت ومودت سے بھرپور قلب صافی کو اس سانحۂ عظمیٰ سے کس قدر صدمہ پہنچا ہوگا۔

انا للہ وانا الیہ راجعون ہ للہ ما اخذ ولہ ما اعطیٰ وکل شیئ عندہ بمقدار — یہ صدمہ عزیز برادر زادہ کی جدائی کا بھی ہے لیکن مزید برآں یہ صدمہ ایک ایسے عالم دین کی مفارقت کا بھی ہے جو عربی کا بہترین انشاء پرداز اور بے نظیر اہل قلم تھا۔ عجمی ہوتے ہوئے حجازی لے سے نغمہ سرائی کر رہا تھا اور حجازی خم ہی کے ذریعہ حجازی مے کی ساقی گری کر رہا تھا۔ دردمند دل کے جذبات واحساسات کو بہترین موثر ودل پذیر انداز بیان کے ساتھ فصیح وسلیس عربی میں عربوں کو پیش کرنے والا حقیقی اسلامی ادیب تھا۔ اکثر اہل کمال واہل قلم کو دیکھا گیا ہے کہ یہ کمال اُن میں کچھ نہ کچھ غرور ونخوت کا عنصر پیدا کر دیتا ہے (الا ماشاء اللہ) مگر اس وقت تک میری ملاقات صرف دو شخصوں سے ہوئی ہے جو شاخ ثمرور کی طرح جھکے رہتے تھے اور فضائل وکمالات کی فراوانی نے ان کے تواضع میں اور اضافہ کر دیا تھا۔ ایک عبدالحمید صدیقی مرحوم مقالہ نگار ترجمان القرآن اور دوسرے عزیز مرحوم محمد الحسنی رحمہ اللہ تعالیٰ۔ گذشتہ سال میں نے بغور مطالعہ کیا، ان کی وضع قطع گفتگو اور طرز تکلّم وغیرہ کسی بات سے یہ مترشح نہیں ہوتا تھا کہ عربی ادب

کے میدان کے شہسوار اور البعث الاسلامی کے مدیر شہیر اور عربی کتب کے نامور مصنف سید محمد الحسنی بھی ہیں، آخری ملاقات جو الوداعی تھی جامعہ اشرفیہ میں عصر کی نماز کے بعد ہوئی تھی۔ آپ کے بعد ان سے مصافحہ کیا تو کشادہ جبینی کے ساتھ نہایت محبت و اخلاص کے انداز میں فرمایا کہ، "پاکستان آکر جن حضرات سے ملاقات و گفتگو ہوئی ہے میں نے تو صرف آپ کو اپنا ہمدم دہم مشرب پایا اور جی خوش ہوا"۔ ان کے ان محصومانہ اور محبت و خلوص سے بھرے جملوں سے مجھ ناچیز کی حوصلہ افزائی ہوئی۔ اب ان ساری باتوں اور اداؤں کو یاد کرتا ہوں تو طبیعت متاثر ہو جاتی ہے۔ لیکن ارشاد نبویؐ القلب یحزن والعین تدمع ولا نقول الا ما یرضی ربنا وانا بفراقك یا محمد لمحزونون کے مطابق غم واندوہ کے باوجود صبر و استقامت کا راستہ اختیار کریں گے۔ آپ کی خدمت میں کلمات تعزیت لکھنا تو وہی "پند بہ لقمان" والی بات ہے۔ لیکن من مصابا فلہ مثل اجرہ کے ارشاد نبوی کے مطابق یہ تعزیت نامہ ارسالِ خدمت کر رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس کی ابدی خوشیاں نصیب فرمائے، قبر مبارک کو انوارِ رحمت و مغفرت سے منور فرمائے۔ اس کی نیکیوں اور دینی خدمات کو شرف قبول عطا فرما کر ان کا بہترین بدلہ عطا فرمائے اور اُن کو کفارۂ زلّات بنائے اور مغفرت نصیب فرمائے اور آپ کو اور دوسرے اعزہ واقارب اور متعلقین ومتوسلین کو اس صدمۂ جانکاہ پر صبر واستقامت اور اس کو برداشت کرنے کا اجر جزیل عطا فرمائے۔ اور ان کی علمی اور روحانی برکات سے اُن کے پس ماندگان کو نوازے۔ آمین یارب العالمین.

فقط والسلام خیر ختام۔

مولانا محمد الحسنی کی تعلیم اور اُن کا مطالعہ

حروف شناسی کی ابتداء سے علم وفضیلت کی انتہا تک

—— مولانا محمد ثانی حسنی ——

حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کا دست شفقت :

ستمبر ۱۹۳۸ء کو حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ لکھنؤ بغرض علاج تشریف لائے اور مولوی گنج میں مولانا محمد حسن صاحب کے مکان میں قیام کیا، مولانا کے قیام کی وجہ سے ہندوستان بھر کے علماء و مشائخ حاضر خدمت ہوتے، بعد ظہر مکان پر خواص کی مجلس ہوتی اور بعد عصر مسجد خواص میں عام مجلس منعقد ہوتی خواص کی مجلس میں ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب اور ان کے بھائی مولانا سید ابوالحسن علی صاحب بھی شرکت کیا کرتے تھے، خدا کے فضل و کرم سے انھیں مجالس میں سے ایک مجلس میں ان ہر دو بزرگوں کے ساتھ راقم الحروف کو بھی شرکت کی سعادت ملی۔ راقم الحروف کی عمر اس وقت ۱۲ سال کی تھی، اتنا یاد ہے کہ جب ہم لوگ بھیڑی منڈی مولوی گنج پہونچے تو زائرین کی بڑی تعداد سڑک پر اور سڑک کے کنارے کھڑی تھی اور اندر جانے کی اجازت کی منتظر، ڈاکٹر صاحب نے اطلاع کرائی، دروازے پر مفتی جمیل احمد صاحب تھانوی کھڑے تھے، انھوں نے حضرت تھانویؒ کے پوچھنے پر پوچھا آپ کے ساتھ کون کون ہے؟ جواب دیا میرے بھائی ابوالحسن علی اور میرے بھانجے محمد ثانی، اندر سے اجازت ملی ہم لوگ داخل ہوئے اس وقت حضرت خطوط سن رہے تھے اور جوابات لکھوا رہے تھے۔

۱۵ ستمبر ۱۹۳۸ء مطابق ۱۹ رجب ۱۳۵۷ھ کو خواص کی مجلس میں حضرت مولانا نے ڈاکٹر صاحب سے از خود فرمایا! ڈاکٹر صاحب میرا جی چاہتا ہے کہ میں آپ کے گھر آؤں انشاء اللہ آج ہی بعد مغرب آؤں گا، پھر حسب ارشاد خواص کی مسجد میں بعد عصر مجلس کر کے اور نماز مغرب پڑھ کر پا پیادہ گوئن روڈ تشریف لے چلے

لوگ سن کر پیچھے پیچھے چلنے لگے، حضرت مولانا، ڈاکٹر صاحب کے مطب میں کچھ دیر بیٹھے، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی بصد شوق وذوق اپنے بھتیجے محمد میاں کو جن کی عمر تین سال کی تھی گود میں کوٹھے سے لائے حضرت تھانوی نے محمد میاں کو اپنی آغوش میں لیا، سر پر ہاتھ پھیرا، دعائیں دیں، مطب اور مطب کے سامنے شائقین، عوام، خواص کا اچھا خاصہ اجتماع ہوگیا تھا، تھوڑی دیر بعد یہ نورانی مجلس ختم ہوئی اور حضرت اپنی قیام گاہ کو تشریف لے گئے، حضرت تھانوی کی تشریف آوری سے اس گھر کو جو شرف اور اس کی وجہ سے اہل خانہ کو جو کیف وسرور حاصل ہوا تھا وہ مدتوں باقی رہا اور آج بھی اس کی لذت اور نورانیت محسوس ہوتی ہے۔

تسمیہ خوانی:

۱۹۳۹ء میں جبکہ محمد میاں کی عمر ۴ سال کی تھی گھر میں تعلیم کے لیے بٹھائے گئے اور اپنی بہنوں کے ساتھ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے لگے تھے مگر قاعدے سے ۱۹۴۱ء میں جبکہ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی دوبارہ لکھنؤ تشریف لائے اور تقریباً ایک ماہ قیام فرمایا تو کسی تاریخ کو بعد ظہر خواص کی مجلس میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی محمد میاں کو لے گئے، حضرت نے پاس بلایا اور بسم اللہ کرائی، محمد میاں کے ساتھ حضرت تھانوی کے ایک مسترشد مولوی عبداللہ صاحب کشمیری کے لڑکے عبید الرحمٰن بھی تھے۔ ان دونوں نے پڑھا، محمد میاں نے آہستہ آواز میں پڑھا، اور عبید الرحمٰن نے بلند آواز میں حضرت تھانوی نے محمد میاں کی طرف اشارہ کرکے فرمایا یہ بچہ نقشبندی ہوگا اور عبید الرحمٰن کو فرمایا کہ یہ چشتی ہوگا۔ بسم اللہ کی یہ مجلس بڑی بارونق اور نورانی تھی۔ ہر طرف علماء فضلا اور اہل اللہ موجود تھے۔ محمد میاں اپنی کم عمری کے دور کے یہ دونوں واقعوں کو اپنی علمی اور دینی زندگی کی ترقیات کا منبع سمجھتے تھے اور اس ابتدا پر بڑا کیف وسرور اور اپنی خوش بختی محسوس کرتے تھے، یہی وجہ تھی کہ ان کو حضرت تھانوی سے بہت زیادہ تعلق تھا اور ان کے دل میں حضرت مولانا کی عظمت اور محبت بلکہ کسی درجہ کا عشق کوٹ کوٹ کر بھرا تھا اور اکثر ان کی تصانیف پڑھا کرتے تھے اور اُن سے بڑا فائدہ اٹھاتے تھے۔

حروف شناسی:

محمد میاں کی تعلیم کو چار دوروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے پہلا دور ان کی عمر کے چوتھے سال سے عمر کے ساتویں سال تک، یہ تین سالہ دور ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۲ء تک کا ہے، اس تین سالہ دور میں انھوں نے اپنے والد ماجد ڈاکٹر صاحب اور محلہ کی مسجد کے امام مولوی محمد سلیم صاحب کشنوی اور کچھ کچھ اپنی بہنوں سے تعلیم حاصل کی، بالکل ابتدائی کتابیں، نماز کی تعلیم، قاعدہ بغدادی اور تھوڑی بہت اُردو اور پھر قرآن مجید کی تعلیم حاصل کی اور پھر ان کی بہنوں کو ایک مولوی صاحب پڑھانے آتے تھے جن کا نام مولوی عبداللہ کشمیری تھا جو ڈاکٹر صاحب کو نہ معلوم کیسے دستیاب ہو گئے تھے ممکن ہے حضرت تھانوی کی مجلس میں شرکت کی وجہ سے، کیونکہ ان مولوی صاحب کا بیعت وارادت کا تعلق حضرت تھانویؒ ہی سے تھا، وہ مولوی صاحب بڑے دیندار، ایماندار اور زاہد وعابد خوش اوقات تھے، محمد میاں اپنی ان بہنوں کے ساتھ جو ان سے عمر میں قریب تھیں اور مولوی صاحب موصوف سے پڑھتی تھیں بیٹھ جاتے تھے اور ان سے مانوس ہوگئے اور خود مولوی صاحب کو اس بچے سے اس کی پیاری پیاری باتوں اور ذہانت وذکاوت کی بنا پر بڑا اُنس ہوگیا تھا۔

ابتدائی تعلیم:

محمد میاں کی تعلیم کا دوسرا دور ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۶ء یا ۱۹۴۷ء تک ہے۔ یہ پورا دور مولوی عبداللہ صاحب کشمیری سے پڑھنے کا ہے، اس دور میں بالکلیہ مولوی صاحب محمد میاں کے استاذ رہے، مکان مسکونہ کے اس کمرے میں جو سڑک کی طرف اوپر ہے یعنی ڈاکٹر صاحب کے مطب کے اوپر والے کمرہ میں اور اکثر اس کمرہ کی طرف جانے والے زینے کے اوپری حصہ پر بیٹھ کر اپنا چھوٹا سا بکس، تختی، رحل، کتابیں اور کاپیاں لئے ہوئے ایک سات سالہ بچہ ایک مولوی صاحب کے پاس بیٹھا ہے بچہ کی آواز تو پڑھنے کی کم آتی ہے، مولوی صاحب موصوف مسلسل بولتے اور تقریر کرتے رہتے ہیں، بزرگوں کے قصے سنا رہے ہیں، صحابہ کی سیرت بتا رہے ہیں اور بڑی میٹھی زبان میں کبھی بیٹے اور نام لے کر کبھی محمد میاں کہتے ہیں، ان کی آواز کبھی کبھی اتنی بلند ہوجاتی ہے کہ دوسرے کمرے والے لوگ سنتے ہیں، آواز کی شیرینی اور حلاوت ایسی کہ وہ بچہ بڑے شوق

سے سنتا ہے، یہ تھے مولوی عبداللہ، محمد میاں کے استاذ اول، اور وہ تھا وہ بچہ محمد میاں جس نے عمر بھر اپنے ان استاذ کو یاد رکھا ان کے ممنون رہے اور ان کے ساتھ حسن معاملہ کرتے رہے ان کے ادب اور عظمت کو اپنے دل میں بٹھایا، مولوی عبداللہ صاحب نے محمد میاں کو خوش خطی سکھائی، قرآن شریف پڑھایا حساب سکھایا اور اس کی مشق کرائی، فارسی پڑھائی فارسی میں، گلستاں بوستاں اور بعض اور دوسری کتابیں پڑھائیں، پڑھانے سے زیادہ وہ تقریر کرتے اور اسباق کو ذہن نشین کراتے۔

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی کی زیارت وخدمت اور عقیدت ومحبت:

مولوی عبداللہ پر مسلم لیگ کے خیالات اور افکار کی پوری چھاپ تھی اس لئے وہ کانگریس اور جمعیۃ علماء کے افکار وخیالات سے ہم آہنگ نہ تھے بلکہ کھل کر مسلم لیگ کی حمایت اور علمائے جمعیۃ کے خیالات کی مخالفت کرتے۔ اگرچہ محمد میاں کو اپنے خیالات کی تعلیم نہیں دیتے تھے مگر ان کے سامنے دوسروں سے بحث کرنے لگتے تھے، یہ صورتحال ایسی صورت میں اور بدنما ہوجاتی تھی کہ یہ گھر جہاں وہ پڑھاتے تھے، حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی کی آتے جاتے قیام گاہ تھا اور اس گھر والے سب کے سب حضرت مدنی کے ہی عقیدتمند اور ارادت کیش اور ان پر اپنے دل وجان کو چھڑکنے والے تھے، محمد میاں غور سے ان بحثوں کو سنتے ایک طرف استاذ کی عظمت، دوسری طرف والد ماجد کا ادب ولحاظ لیکن ابتدائے عمر سے وہ حضرت مدنی کو دیکھتے ان کی خدمت میں بیٹھتے رہے اور اپنے والد ماجد کو ان کے سامنے زانوئے ادب تہ کرتے دیکھتے رہے اس لئے استاذ کے سیاسی خیالات کا اثر ان کے دل ودماغ پر نہیں پڑا، بلکہ حضرت مدنی کا احترام دل میں بیٹھا، گھر کے بڑوں خصوصاً والد ماجد کے خیالات وافکار کے نقوش ان کے دل ودماغ کے پردہ پر لاشعوری طور سے ثبت ہوتے رہے۔

ان بحثوں کے باوجود مولوی عبداللہ صاحب مرحوم کا محمد میاں پر یہ احسان ہے کہ انھوں نے اپنے شاگرد کو اولاد کی طرح پڑھایا اور اپنی محبت کی گرانمایہ متاع ان کو دی، بزرگوں کی عظمت کا سکہ بٹھایا اور ابتدائی تعلیم بڑے اچھے طریقے سے دی، ان کے ذہن کو جلا دی۔

ترجمہ قرآن مجید:

محمد میاں کی تعلیم کا تیسرا دور ۱۹۴۴ء سے ۱۹۵۰ء تک ہے، اس دور کا ابتدائی حصہ مولوی عبداللہ صاحب کی تعلیم دینے کا آخری حصہ بھی ہے یعنی ایک طرف مولوی عبداللہ صاحب محمد میاں کو فارسی اور اردو کی متوسط کتابیں پڑھاتے تھے اور اس تعلیم کی تکمیل کا وقت قریب تھا تو دوسری طرف ڈاکٹر صاحب محمد میاں کو اپنے خاص انداز اور تجربات کی روشنی میں عربی پڑھاتے تھے، ڈاکٹر صاحب نے محمد میاں کی عربی تعلیم کو قرآن حکیم کی بعض ایسی سورتوں کے ترجمے سے شروع کیا جن میں عموماً قصے ہوتے تھے، جیسے سورۂ یوسف، سورۂ زمر سورہ قصص وغیرہ، قرآن کریم کے ترجمے کو سورہ فاتحہ کے ترجمے سے شروع کیا۔

اسی زمانہ میں ان کے پھوپھی زاد بھائی عزیزی مولوی محمد واضح سلمہٗ (جو بعد میں ان کے بہنوئی بھی ہوئے اور سب سے زیادہ بے تکلف دوست اور ہر وقت کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے والے ساتھی بھی) عربی پڑھنے اسی گھر میں اترے، دونوں کو عربی پڑھنے کا بڑا شوق تھا اور ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کا شوق بھی جس دن محمد میاں نے سورۂ فاتحہ کا ترجمہ پڑھا پڑھ کر فوراً واضح کے پاس آئے اپنے پڑھنے کی خوش خبری سنائی اور واضح کو وہی ترجمہ پڑھایا، بعد میں مزاحاً کہتے تھے کہ لو ہم تمہارے استاذ ہوگئے، انھیں دنوں واضح سلمہٗ دارالعلوم ندوۃ العلماء سے مولانا سید سلیمان ندوی کی مشہور کتاب دروس الادب لائے جو محمد میاں کے ہاتھوں میں آئی اور انھوں نے اس کو پڑھا اور اس کے الفاظ یاد کیے، اس تعلیم میں ڈاکٹر صاحب نحو وصرف کے قواعد سے صرف نظر کرکے صرف ترجمہ بتاتے تھے اور اگر محمد میاں اٹکتے تو کہتے اس کے معنی تم فلاں لفظ میں پڑھ چکے ہو، یہ لفظ وہی لفظ ہے مگر فرق یہ ہے اس میں الف نون لگا ہے اس کے یہ معنی ہوتے ہیں، اس میں واؤ نون آیا ہے اس کے یہ معنی ہیں، اس میں ت ہے اس کے یہ معنی ہیں، الغرض سمجھا کر ان کے ذہن کو ایسے رُخ پر ڈالتے کہ وہ خود بخود ترجمہ نکال لیتے۔

نیا دینی نصاب تعلیم ودرس:

اس کے بعد اس وقت کی رائج مصری کتابوں کو پڑھایا جن میں حکایات للاطفال خاص طور پر قابل ذکر ہے لیکن وہ مصری کتابوں کو ان کی تصویروں اور غیر دینی مضامین کی وجہ سے بچوں کے لیے مفید نہیں

سمجھتے تھے وہ چاہتے تھے کہ بچوں کے لئے ایسا عربی نصاب تیار ہو جو بچوں کے دل و دماغ میں انبیاء کرام صحابۂ کرام اور دین اسلام کی عظمت بٹھائے۔

دوسری طرف مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی نے مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی کو لکھا کہ مصر کے مصوّر اور غیر دینی نصاب کا دارالعلوم جیسے مدرسے میں داخل ہونا اور ان کا بچوں کو پڑھانا سمجھ میں نہیں آتا، مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کے توجہ دلانے اور ڈاکٹر صاحب کی فکرمندی سے مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی نے اپنے خاص انداز اور اسلوب میں قصص النبیین کا سلسلہ لکھنا شروع کیا جس کے تین حصّے لکھے اور اپنے بھتیجے محمد میاں کی طرف ان کو منسوب کیا گویا کہ انھیں کے لیے لکھ رہے ہوں، اس پر جو مقدمہ لکھا اس کا مخاطب محمد میاں کو بنایا۔

یہ ایک فطری بات ہے کہ بچہ جب دیکھتا ہے کہ اس کا نام اور ذکر کسی کتاب یا مضمون میں لیا جاتا ہے تو وہ خوش ہوتا ہے اور ایک دوسرے کو دکھاتا پھرتا ہے اور دوسرے بچے اس پر رشک کرتے ہیں، یہی حال محمد میاں کا تھا، ان کے چاہنے والے چچا نے ان کے لیے ایک کتاب لکھی دلچسپ اور پراز معلومات پھر ان کا نام چھپا وہ بہت خوش ہوئے اور اپنے ہم عصروں پر ان کو کسی قدر فخر و ناز ہوا ان کے ہم سبق اور ہمعصر بھائی واضح سلمہٗ کو خیال آیا کہ یہ بھتیجے ہم بھانجے ہمارا تو نام نہیں آیا ان کا آیا ان کو اس احساس پر قلق ہوا، محمد میاں کو خدا نے کم عمری کے باوجود ذہن رسا دیا تھا اور تالیف قلب کی دولت عطا کی تھی، ایک لطیفہ کے طور پر بولے تمھارا نام بھی آیا ہے اور واضحۃ سھلۃ کی طرف اشارہ کیا۔

ترجمہ ریاض الصالحین

محمد میاں نے مصری کتابیں پڑھ کر قصص النبیین پڑھی پھر القراۃ الراشدہ کے حصے پڑھے، ڈاکٹر صاحب نے قرآن شریف کی بعض سورتوں کے ترجمے اور مندرجہ بالا کتابوں کے بعد حدیث کی کتاب ریاض الصالحین پڑھائی، اس کتاب کے پڑھانے میں بھی ڈاکٹر صاحب نے بہت سہل طریقہ اختیار کیا، جس وقت محمد میاں ڈاکٹر صاحب سے ریاض الصالحین پڑھتے تھے، اسی زمانے میں واضح سلمہٗ اس کتاب کو دارالعلوم میں پڑھتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کا قاعدہ تھا کہ خود بھی پڑھاتے تھے اور بعض دفعہ دوسرے سے پڑھواتے تھے ایک دن واضح سلمہٗ پڑھ کر آئے تو ڈاکٹر صاحب نے ان کو بلایا اور کہا کہ ریاض الصالحین کا وہ سبق جو تم پڑھ کر آئے

ہو محمد کو پڑھاؤ، دونوں بچوں کی علمی سطح تقریباً ایک تھی، ایک تو ڈاکٹر صاحب کی موجودگی دوسرا تازہ سبق واضح گھبرائے اور پریشان سے ہوئے۔

اسی زمانے میں ڈاکٹر صاحب نے اپنی ہمشیرہ امۃ اللہ تسنیم صاحبہ کو جو اس زمانہ میں بعض حوادث کی وجہ سے بہت غمگین اور فکرمند رہتی تھیں اس مبارک کام پر آمادہ کیا کہ وہ ریاض الصالحین کا اردو ترجمہ کریں، بڑے بھائی کے حکم سے انھوں نے دلجمعی کے ساتھ اس کا ترجمہ کیا اور اس کا نام "زاد سفر" رکھا، یہ کتاب بہت زیادہ مقبول ہوئی اور بہت سے مدارس میں داخل نصاب کرلی گئی۔ محمد میاں نے اس کتاب کو بھی مطالعہ میں رکھا اور اصل کتاب ریاض الصالحین بھی پڑھتے رہے۔

انشاء کا کام:

ان کتابوں کے پڑھنے کے ساتھ ساتھ انشاء کا کام بھی کرنے لگے، شروع میں عموماً اردو سے عربی اور عربی سے اردو جملوں اور عبارتوں کے ترجمے کرتے تھے، بالکل شروع میں چند دن انشاء کا کام راقم السطور کو دکھایا، اس کے بعد جب اس کا کام اور بڑھا تو دارالعلوم ندوۃ العلماء کے اس وقت کے استاذ ادب مولوی عبداللہ عباس ندوی سے ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ وہ محمد میاں کی انشاء دیکھ لیا کریں، انھوں نے اس خدمت کو انجام دیا وہ کہتے ہیں۔

> ڈاکٹر صاحبؒ کے حکم سے محمد میاں نے انشاء کا کام کئی بار مجھ کو دکھایا، میں نے آٹھ آٹھ صفحے ان کے لکھے ہوئے دیکھے مگر سوائے ایک یا دو جگہ کے کوئی نحوی یا صرفی یا عبارت کی غلطی نظر نہیں آئی، میں نے اس کا ذکر ڈاکٹر صاحب سے کیا تو وہ اتنا خوش ہوئے کہ ان کا چہرہ مارے خوشی کے کھل اٹھا، اور بالکل انار کی طرح روشن اور سرخ ہو گیا۔

ادب و نحو و صرف اور فقہ:

ادب کی کتابوں میں کلیلہ و دمنہ کا کچھ حصہ راقم السطور سے پڑھا اس زمانہ میں برادر عزیز مولوی محمد رابع دارالعلوم سے فارغ ہو چکے تھے اور دیوبند میں کچھ عرصہ رہ کر دارالعلوم دیوبند کے اساتذہ سے تعلیم حاصل کر چکے تھے ان سے بھی محمد میاں نے گھر ہی پر رہ کر کچھ کتابیں پڑھیں جن میں حماسہ کے بعض ابواب بھی ہیں۔

ایسا نہیں تھا کہ وہ نحو وصرف سے بالکل بے نیاز ہوں۔ ان کو بعض دفعہ اپنی اس کمی کا احساس ہوتا تھا۔ اگرچہ انھوں نے سبقاً سبقاً کوئی نحوی یا صرفی کتاب نہیں پڑھی بلکہ عمومی طور پر اس سے استغنا برتا، لیکن کوئی نہ کوئی کتاب کبھی نہ کبھی مطالعہ میں رکھ لیتے، مثلاً ایک دن راقم السطور سے کہنے لگے۔

"بھئی بھیا! جی چاہتا ہے کہ کوئی نحو وصرف کی ایسی ہلکی کتاب نظر سے گزر جائے جو ذہن ودماغ پر بار بھی نہ بنے اور لکھنے پڑھنے میں کوئی غلطی نہ ہو کوئی ایسی کتاب بتائیے۔"

راقم السطور کو یاد آیا کہ اس نے اپنے شفیق استاذ مولانا شبلی صاحب فقیہ مدرس دارالعلوم ندوۃ العلماء کے کہنے پر انھیں سے ایک کتاب ایسی پڑھی تھی جو مختصر بھی ہے اور جامع بھی اس کا نام "ضروری" ہے تو انکو مشورہ دیا کہ تم ضروری پڑھ لو۔ محمد میاں نے وہ کتاب کتب خانہ سے حاصل کرلی اور اس کے کچھ سبق راقم السطور سے پڑھے وہ کتاب ان کو بھی بہت پسند آئی، انھوں نے مولانا عبدالرحمٰن امرتسری کی کتاب کتاب النحو اور کتاب الصرف بھی مطالعہ میں رکھی، اسی طرح اس وقت کی رائج کتابوں میں النحو الواضح بھی تھی، اور وہ کتاب اکثر گھر میں بھی رہتی تھی اس کو بھی انھوں نے دیکھا تھا مگر سبقاً سبقاً کسی کتاب کا پڑھنا یاد نہیں۔ فقہ میں کنز الدقائق اور شرح وقایہ کے اکثر اسباق مولانا سید محمد مرتضیٰ صاحب بستوی مظاہری سے پڑھے جو ان دنوں دارالعلوم ندوۃ العلماء کے چھوٹے درجوں کو پڑھاتے تھے اور محلہ ہی میں رہتے تھے۔ ادب میں کامل مبرد مولوی احمد عثمان صاحب ندوی سے پڑھی۔ مجموعہ من النظم والنثر بھی پڑھی مگر کس سے پڑھی اس کا علم نہیں ہو سکا۔ اور مختارات کا کچھ حصہ اپنے خالہ زاد بھائی مولانا سید ابوبکر صاحب حسنی سے پڑھا جو ان دنوں حلیم مسلم کالج کانپور سے طویل رخصت لے کر ڈاکٹر صاحب کے گھر پر مقیم تھے۔

اُردو انگریزی

مولانا سید ابوبکر صاحب سے ان کے رائے بریلی کے قیام کے دوران روزانہ انگریزی سے اُردو اور اُردو سے انگریزی ترجمہ جملوں میں کرتے تھے۔ ان کا یہ سبق کسی جگہ بیٹھ کر اور جم کر نہیں ہوتا تھا بلکہ ٹہلتے ٹہلتے اور بات کرتے کرتے نہایت ہلکے پھلکے انداز میں ہوتا تھا، وہ ابتدا تھی جس کے بعد محمد میاں نے انگریزی زبان میں اپنی استعداد بہت بڑھالی تھی اور وہ بے تکلف انگریزی اخبارات

پڑھنے لگے تھے۔ ان کے والد ماجد ڈاکٹر صاحب کا معمول تھا کہ وہ روزانہ ایک انگریزی اخبار اور ایک اردو اخبار منگواتے تھے اور مطالعہ کرتے تھے، اسی وجہ سے محمد میاں نے بھی اپنا یہی معمول بنالیا تھا، اور پابندی سے وہ ان اخبارات کا مطالعہ کرتے تھے۔

اعلیٰ تعلیم اور حدیث کی تکمیل:

ان کی تعلیم کا چوتھا اور آخری دور ۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۲ء تک کہا جا سکتا ہے، جب ان کی علمی استعداد زیادہ ہوئی اور کتابوں کے پڑھنے کا شوق بڑھنے لگا اور ہر علم وفن کی کتابوں کو وہ سمجھنے لگے تو ڈاکٹر صاحب نے احیاء العلوم پڑھنے کی تاکید کی، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کی کتابوں میں سرور المحزون پڑھائی اور اس کا اُردو میں ترجمہ کرایا، حدیث کی کتابوں میں مجمع الفوائد پڑھنے کو دی اور اس کی حدیثوں پر نشان لگائے، پھر وہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کی اور تصانیف پڑھنے لگے۔ ڈاکٹر صاحب نے امام ابن تیمیہ اور امام ابن قیم کی کتابوں کو پڑھنے کے لیے دیا، چوں کہ ڈاکٹر صاحب ان ہر دو بزرگوں کے بڑے قائل اور ان سے متاثر تھے اس لیے ان کی کتابوں کو خود رکھتے اور دوسروں کو ان کے پڑھنے کی تاکید کرتے۔

حدیث کی کتابوں میں ریاض الصالحین کے بعد مشکوٰۃ پڑھوائی، اب محمد میاں اس درجہ پر پہنچ گئے تھے کہ وہ دارالعلوم میں جاکر صحاح کی تعلیم حاصل کریں، اس کام کے لیے ڈاکٹر صاحب کی نظر مولانا شاہ حلیم عطا صاحب سلونی پر پڑی جو اس وقت مولانا حیدر حسن خاں صاحب ٹونکی کے چلے جانے کے بعد حدیث کے استاذ بلکہ شیخ الحدیث ہوئے تھے اور مدتوں سے اس درسگاہ میں حدیث کی خدمت انجام دے رہے تھے محمد میاں نے ۱۹۵۱ء سے ۱۹۵۲ء میں ان کی خدمت میں جاکر حدیث کی تعلیم حاصل کی اور اس فن کی کتابوں کے پڑھنے کے بعد گویا علوم وفنون کی تعلیم سے فراغت حاصل کرلی۔

مطالعہ:

حضرت مولانا شاہ حلیم عطا صاحب سے تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ محمد میاں دارالعلوم کے دوسرے اساتذہ، مولانا محمد اسحاق صاحب سندیلوی، مولانا محمد اویس صاحب ندوی سے بھی علمی استفادہ کرتے تھے۔ نیز کتب خانہ میں بیٹھ کر کتابوں کا مطالعہ کرتے، خصوصاً سید قطب، شیخ محمد الغزالی، احمد امین

احمد حسن زیات کی تصنیفات سے بہت زیادہ استفادہ کرتے۔ مصطفیٰ لطفی منفلوطی کی کتابوں کو بھی پڑھا جن میں العبرات، النظرات قابل ذکر ہیں، اسی طرح احمد امین کی حیاتی، فجر الاسلام، ضحی الاسلام، امیر شکیب ارسلان کی حاضر العالم الاسلامی مطالعہ میں رکھی۔ طہٰ حسین کی علیٰ ہامش السیرہ اور الشعر الجاہلی کا بھی مطالعہ کیا۔ انکے علاوہ شیخ حسن بنا کی مذکرۃ الدعوۃ والداعیہ، تحریک اخوان المسلمین کے داعیوں کی تصنیفات خصوصاً سید قطب کی فی ظلال القرآن، العدالۃ الاجتماعیہ فی الاسلام، ان کے بھائی محمد قطب اور بہن امینہ قطب کی تصنیفات پڑھیں۔ اور اس جماعت کے اخبارات جیسے، الدعوۃ، منبر الشرق، مصر سے نکلنے والے دوسرے اخبارات، الہلال، الجمہوریہ، الشباب العربی، الازہر برابر مطالعہ میں رکھتے تھے، ریاض سے نکلنے والا رسالہ الدعوہ مدینہ منورہ کا ماہنامہ، الجامعہ روزنامہ المدینہ المنورہ، المنہل مکہ مکرمہ کا، اخبار العالم الاسلامی، التضامن الاسلامی، حضارۃ الاسلام شام کا، لبنان کا الشہاب، کویت کے المجتمع، العربی۔ البلاغ۔ پھر ایکے بعد تو مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی کے مسلسل عرب ممالک کے سفروں، مصر و سوڈان، شام و عراق، کویت، شرق اردن کے دوروں نے کتابوں رسالوں کی آمد کا دروازہ کھول دیا، کون سا عربی اخبار تھا جو نہ آتا ہو اور کون سی علمی کتاب تھی جو اس گھر میں موجود نہ ہو یہ سب رسالے، کتابیں محمد میاں نے پڑھیں۔

راقم السطور کو یاد ہے کہ ایک دن وہ اور محمد میاں مولانا محمد اویس صاحب ندوی سے انکے مکان پر جو دار العلوم کے حدود میں واقع تھا ملنے گئے، مولانا نے کچھ دیر گفتگو کرنے کے بعد فرمایا۔

"محمد میاں! ڈاکٹر صاحب اور مولانا علی میاں کا حکم اور مشورہ سر آنکھوں پر مگر میرا حقیر مشورہ یہ ہے کہ آپ سید قطب، غزالی، احمد امین اور عقاد، طہٰ حسین، منفلوطی رافعی کی کتابوں کو بہت پڑھتے ہیں، اگر ان کے بجائے امام ابن تیمیہ اور امام ابن قیم کی تصنیفات کو زیر مطالعہ رکھیں تو آپ کو بہت فائدہ ہوگا، ان کے آگے ان لوگوں کی کیا حیثیت ہے؟"

پھر مولانا نے ان ہر دو بزرگوں کی تصنیفات کی نشاندہی کی اور ان کے پڑھنے پر اصرار کیا، ان کے اصرار پر محمد میاں نے ادھر اور زیادہ توجہ دی، چونکہ ڈاکٹر صاحب اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب بھی ان ہر دو بزرگوں کی تصنیفات کو پسند کرتے تھے اور خود ان کو مطالعہ میں رکھتے تھے، مولانا ابوالحسن علی صاحب ندوی نے زاد المعاد کا خلاصہ بھی کیا تھا، اس لئے محمد میاں نے زاد المعاد پڑھی، اس کے

علاوہ سیرت ابن ہشام اور دوسری اہم تاریخی اور سیرت کی کتابوں کو مطالعہ میں رکھا۔

غیر مرتب نظام درس اور صرف و نحو سے استغنا کے باوجود علمی فضیلت اور زبان و ادب میں کمال و عبور

پھر وہ زمانہ آیا کہ ان کا محبوب مشغلہ کتابوں کا پڑھنا اور ان کے مضامین کو لکھنا بن گیا اور ان کی میز مختلف علوم و فنون کی کتابوں سے ہمہ وقت مزین رہتی، ان میں قدیم کتابیں بھی ہوتیں اور جدید مصنفین کی تصانیف بھی، تفسیر، سیرت، حدیث، تاریخ، ادب کی مختلف النوع کتابوں کو وہ پڑھتے ہی رہتے، اس طریقہ تعلیم اور ڈاکٹر صاحب کی ہمہ وقت توجہ، کتابوں کے مطالعہ، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی ادبی تحریروں اور کتابوں کے پڑھنے، ہر دو برادران عزیزی محمد رابع اور محمد واضح سلمہما جو ہر وقت ساتھ رہتے اور دار العلوم میں پڑھتے تھے، ان کے ذریعہ مختلف علوم و فنون کی کتابوں کے گھر میں آنے سے محمد میاں کے مطالعہ میں بڑی وسعت پیدا ہوئی اور پھر گھر میں خود ایک مختصر سا کتبخانہ تھا جس میں قدیم و جدید نادر و نایاب مطبوعہ اور قلمی کتابیں تھیں، ان سب کے مطالعہ سے محمد میاں کے ذہن و دماغ، دل اور زبان کو جلا ملی، اور پھر ان کے قلم نے ان کے مضامین کو صفحۂ قرطاس پر ان کے نقوش ثبت کرنے شروع کر دیئے، خدا نے ان کو ذہن رسا دیا تھا اور دماغ روشن بغیر کسی محنت کے اور درسی کتابوں کے سبقاً سبقاً پڑھے بغیر دیکھتے دیکھتے ترقی کے وہ مراحل طے کئے جس کی مثال بہت کم ملتی ہے۔

محمد میاں کے صرف و نحو سے استغناء اور ان فنون سے ناواقفیت کا حال اس واقعہ سے بھی معلوم ہو سکتا ہے جو مولانا محمد مرتضیٰ صاحب مظاہری سناتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔

"۱۹۴۸ء یا ۱۹۴۹ء کا زمانہ تھا جب ڈاکٹر صاحب مرحوم نے مجھ سے فرمایا کہ محمد کو کنز الدقائق پڑھا دیجئے ڈاکٹر صاحب فقہ کی کتابوں میں کنز الدقائق کو بہت پسند کرتے تھے، میں نے ڈاکٹر صاحب کے حکم پر ان کے مکان سے بالکل متصل اس مکان کی اوپری منزل پر جس میں ڈاکٹر صاحب کے بڑے داماد مکرمی سید محمد مسلم صاحب حسنی رہتے ہیں اور جس میں میرا عارضی قیام تھا محمد میاں کو کنز الدقائق پڑھانا شروع کی، ایک دن پڑھاتے پڑھاتے میں نے پوچھ لیا محمد میاں اچھا بتاؤ یہ کون سا صیغہ ہے وہ چپ رہے

میں نے کہا سوچ کر بتاؤ پھر بھی وہ نہ بتا سکے۔ مولوی سید محمد ثانی صاحب بیٹھے ہوئے تھے انھوں نے کہا کہ انھوں نے نحو وصرف پڑھی کہاں ہے جو آپ صیغہ پوچھ رہے ہیں ان کو تو ماضی کی گردان بھی یاد نہیں ذرا پوچھئے میں نے کہا ماضی کی گردان کو وہ گردان بھی نہ کر سکے میں نے حیرت و استعجاب سے کہا کہ خدا کی شان اتنی بڑی بڑی کتابیں پڑھتے ہیں اور گردان اور صیغوں تک سے ناواقف ہیں۔"

اور اس سے بڑھ کر یہ کہ وہ جب انشار پردازی کے اس بلند مقام تک پہنچ چکے تھے جب مصر و حجاز اور دوسرے عرب ممالک کے علماء، ادباء اور اہل قلم حضرات ان کی تحریروں کو بڑے ذوق و شوق سے پڑھتے تھے، اور ان کی علمی فضیلت، قلم کی طاقت اور بیان کی لطافت، اور ان کی شگفتہ اور سلیس و بلیغ تحریروں کے قائل ہو چکے تھے جن کا تعارف کراتے ہوئے عراق کے ایک بڑے ادیب، عالم اور صاحب فکر صاحب قلم بزرگ شیخ محمد محمود الصواف نے جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں طلبہ کے ایک جلسہ میں ان کو اس طرح یاد کیا۔

"عزیز طلبہ تم اس نوجوان (محمد میاں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) کو جانتے ہو، نہیں بالکل نہیں جانتے، یہ وہ فاتح بے تیغ و شمشیر ہیں جنھوں نے تنہا ایوان ناصری کے کنگرے گرا دیئے، علم کدۂ قاہرہ میں ہلچل مچا دی اور اربابِ صحافت کی دھجیاں بکھیر دیں، وہ عالم اسلام کے محبوب رسالہ "البعث الاسلامی" کے روح رواں ہیں، میں شدت سے اس کا انتظار کرتا رہتا ہوں، جب تک ہاتھ میں نہیں آجاتا، آنکھیں ڈاک کی طرف لگی رہتی ہیں، میں اداریہ پڑھتا ہی نہیں بلکہ اسے پیتا ہوں، مجھے ان کے سارے اداریئے زبانی یاد ہیں تم سننا چاہو تو آزما لو۔"[1]

وہ محمد میاں جن کے فضل و کمال اور بلاغت و فصاحت سے معمور تحریر کے ایسے بڑے ادیب و مقرر قائل ہیں ان محمد میاں کا حال یہ تھا کہ انھوں نے اپنے انتقال سے صرف ایک ماہ پہلے اپنے موقر رسالہ البعث الاسلامی میں ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی پر ایک صفحہ کا مضمون لکھا، صبح کا وقت تھا، وہ اپنی میز کے سامنے بیٹھے ہوئے لکھ رہے تھے کہ راقم السطور اچانک پہنچ گیا، دیکھتے ہی بولے منجھلے بھیا آئیے، ایک

[1] تحریر مولوی محمد ایوب صاحب نیپالی ندوی جو اس جلسے میں موجود تھے اور محمد میاں کے میزبان تھے۔

چیز دیکھئے بس ذرا بیٹھئے پورا کر لیں تو دکھاتے ہیں اور وہ تیزی سے اپنا قلم چلانے لگے۔ چند ہی منٹ بعد ایک کاغذ بڑھایا اور بولے۔ ہم نے بھٹو کی پھانسی پر اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے اور یہ ابھی کمپوز ہونے جا رہا ہے۔ چچا میاں (مولانا سید ابوالحسن علی ندوی) ہیں نہیں وہ سفر پر ہیں۔ چھوٹے بھیا (مولوی محمد رابع ندوی) اور واضح دونوں رائے بریلی میں ہیں، آپ اس پر اپنی نظر ڈال لیں۔

راقم السطور نے حیرت سے کہا۔

"تمھارا مضمون اور میں دیکھوں تم اتنا اچھا مضمون لکھتے ہو کہ میں خود اس سے استفادہ کروں نہ یہ کہ میں دیکھوں یہ کیسی الٹی بات!

وہ مسکرا کر بولے:

ارے دیکھئے بھی اس میں دو چیزیں دیکھنی ہیں (۱) کوئی نحوی یا صرفی غلطی تو نہیں (۲) مضمون کہیں سخت تو نہیں ہو گیا ہے؛ بس اتنا دیکھ لیجئے اور پاس کر دیجئے ہم کو اطمینان ہو جائے گا۔

ان کے اصرار پر میں نے مضمون کو اپنے ہاتھوں میں لیا پڑھا اور کہا۔

"میرے نزدیک کوئی صرفی یا نحوی غلطی نہیں ہے اور اب تو تم کوئی ایسی غلطی بھی نہیں کرتے تمھارا قلم تو بہت رواں، شگفتہ اور پر تاثیر ہو چکا ہے۔

ے اللہ کرے زور قلم اور زیادہ

رہا لہجہ کی سختی تو میرا تاثر یہ ہے کہ ذرا سخت ہو گیا ہے مگر کوئی حرج نہیں ماموں جی تو اس معاملہ میں سخت رویہ ہی کے قائل ہیں۔"

محمد میاں بولے۔

"بس بس ٹھیک ہے ہم تو چچا میاں کے خیالات کے ترجمان ہیں، ہمارا قلم ان کے قلم، ہماری زبان ان کی زبان، ہمارے خیالات ان کے خیالات کے تابع ہیں۔

اور یہ کہہ کر مجھ سے مضمون لے لیا، مسکرائے اور بیگ میں رکھ لیا، پھر وہ مضمون چھپا، بعض اہل الرائے کے نزدیک وہ مضمون سخت تھا مگر خال مکرم مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی اپنے سفر سے واپس ہوئے اور اپنے وطن تکیہ کلاں (دائرہ شاہ علم اللہ) تشریف لائے تو محمد میاں بھی آئے، میں نے ایک صبح کو خال مکرم مدظلہ العالی سے تنہائی میں عرض کیا کہ محمد میاں نے بھٹو پر جو مضمون لکھا وہ آپ نے پڑھا

تو فرمانے لگے! ہاں پڑھا بہت اچھا ہے محمد میاں نے خوب ہی لکھا ہے میں ان کو اس پر مبارکباد دوں گا اتنے میں محمد میاں کمرے میں داخل ہوئے تو خال مکرم مولانا مدظلہ العالی نے بہت خوشی کا اظہار کیا اور مضمون پر داد دی، محمد میاں اپنے عم مکرم مدظلہ کی تحسین اور خوشی پر بڑے متاثر ہوئے اور ان کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا میں نے ان کے چہرے کو بغور پڑھا، معلوم ہوتا تھا کہ مارے خوشی کے آنکھوں سے آنسو نکل آئے ہیں، ان کی اس کیفیت سے میرا دل بھی خوشی سے جھوم اٹھا۔

رسائل وجرائد کا مطالعہ اور مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی کے بعض رسائل کا ترجمہ

محمد میاں کو ۱۹۴۵ء سنہ ۱۹۴۶ء ہی سے جبکہ وہ عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھ رہے تھے ان کے والد ماجد ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب بعض مصری، شامی اور حجازی جرائد وکتب کے مطالعہ پر زور دیتے تھے اس زمانے میں ڈاکٹر صاحب کے نام مکہ مکرمہ سے نکلنے والا اخبار "ام القریٰ" آتا تھا۔ اس طرح بعض مصری جرائد اور کتابیں بھی آنے لگی تھیں وہ سب محمد میاں اور برادران عزیزاں مولوی محمد رابع ومولوی محمد واضح کے مطالعہ میں آتی تھیں، مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی نے ۱۹۴۵ء میں ایشیائی کانفرنس دہلی میں عرب نمائندوں اور سفیروں کے سامنے ایک تقریر کی تھی جو الیٰ ممثلی البلاد الاسلامیہ کے نام سے طبع ہوئی تھی، اس کے علاوہ من الجاہلیۃ الی الہدایہ طبع ہوئی، پھر ۱۹۴۷ء سنہ میں مولانا مدظلہ سفر حج پر گئے اور حجاز میں مختلف علماء سے گفتگو کی، تقریریں کیں اور مختلف مکتبوں سے کتابیں خریدیں اور اپنے برادر مکرم ڈاکٹر صاحب کو ارسال کیں، اس سفر میں راقم السطور بھی ساتھ تھا، ایک دن تیونسی علماء سے ملاقات ہوئی، انھوں نے درجنوں اخبار اور جرائد دیئے، یہ ساری کتابیں اور اخبارات ساتھ آئے اور ان کا مطالعہ محمد میاں نے کیا، ۱۹۴۹ء سنہ میں راقم السطور حجاز گیا اور تینوں بھائیوں (مولوی محمد رابع ندوی، مولوی محمد واضح ندوی اور مولوی محمد میاں کی ہی نیت سے اہتمام کر کے کتابوں کی دو کانوں سے مختلف کتابیں اور تازہ اخبارات خریدے انمیں عشرۃ ایام فی السوڈان اور انقلابان فی سوریا بالکل تازہ تازہ چھپی تھیں میں بڑے شوق کے ساتھ ان کو لایا اور ان تینوں کو پڑھنے کے لیے دیا۔ سنہ ۱۹۵۰ء میں مولانا

سید ابوالحسن علی ندوی اور عزیز مولوی محمد رابع ندوی حجاز گئے، اس سے پہلے مولانا مدظلہ کی ایک اردو تقریر صورت وحقیقت کا ترجمہ محمد میاں عربی میں کر چکے تھے جس کا نام بین الصورۃ والحقیقۃ رکھا تھا وہ رسالہ عرب حلقوں میں بڑا مقبول ہوا، مولانا سید ابوالحسن علی صاحب نے اس کتاب کے متعلق مصر سے سنہ ۱۹۵۱ء میں اپنے برادر مکرم ڈاکٹر صاحب کو لکھا۔

"محمد میاں کی کتاب بڑی دور دور پہنچ رہی ہے، ان کو اپنی عربی تحریر کی مشق خوب کر لینی چاہیئے۔"

دوسرے خط میں لکھتے ہیں:۔

"سب سے زیادہ جو رسالہ مقبول ومؤثر ہوا وہ بین الصورۃ والحقیقۃ ہے پہلے سے اس کا اندازہ نہ تھا، وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس کی گرفت سخت اور صاف اور مضمون عام فہم اور روزانہ زندگی سے تعلق رکھتا ہے، یہ رسالہ چوں کہ پہلے سے پہنچ چکا تھا اس لئے اس کی اشاعت بھی بہت ہوئی اور اکثر حلقوں میں ہم سے پہلے پہنچ گیا۔"

اسی زمانہ میں محمد میاں نے اپنے عم مکرم مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی کی ایک تقریر (سیرت محمدی کا پیغام) کا ترجمہ عربی میں کیا تھا، اس کا ذکر ڈاکٹر عبدالعلی صاحب نے مولانا موصوف سے خط کے ذریعہ کیا تھا جس کا جواب مولانا نے یہ دیا۔

"آپ نے محمد سلمہ کے ترجمہ سیرت محمدی کا پیغام کا ذکر ہے وہ بھیج دیں تو کسی رسالہ میں شائع ہو جائے گا۔"

پھر جب مولانا موصوف حجاز سے قاہرہ گئے تو ان کو وہ ترجمہ مل گیا وہ اس کی وصولیابی پر لکھتے ہیں۔

"آج کی ڈاک سے محمد سلمہ کا کیا ہوا ترجمہ سیرت محمدی کا پیغام پہنچا، انشاء اللہ یہاں کسی مناسب مجلہ میں شائع ہو جائے گا۔ ابوالحسن علی

(۶ جمادی الثانیہ سنہ ۱۳۷۰ھ)

مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی کا سفر مصر وسوڈان بڑا کامیاب رہا تھا، اس سفر کی پوری روداد بعد میں چھپی جس کا نام "مذکرات سائح فی الشرق الاوسط ہے"۔ وہ کتاب بڑی دلچسپ اور معلومات افزا ہے اس سفر کے دوران دونوں بھائیوں کے درمیان خط وکتابت کا ایک سلسلہ قائم رہا، ڈاکٹر صاحب اپنے

قیمتی مشوروں سے مستفید کرتے رہے اور مولانا موصوف وہاں کے حالات وکیفیات اور اپنے سفر کے تاثرات سے آگاہ کرتے رہے، مصر جانے سے پہلے مولانا موصوف حجاز میں ٹھہرے، ان کے ہمراہ عزیزی مولوی محمد رابع سلمہٗ بھی تھے اور مولوی سید محمد طاہر صاحب مولانا معین اللہ صاحب ندوی اور مولوی عبدالرشید ندوی بھی، ڈاکٹر صاحب نے اپنے ایک خط میں تحریر فرمایا۔

"رابع سے کہو سید ہاشم علی نحاس کے یہاں سے خریطۂ اوربا، خریطہ الشرق الاوسط، اور الرابطۃ الاسلامیہ اور الشرق العربی وبعض دیگر جرائد کی ایک ایک کاپی لیتے آئیں"۔

مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی نے مصر سے بہت سی وہ کتابیں اور رسالے جو مصر کے علماء، ادباء اور مصنفین نے ان کو ہدیتاً دی تھیں پارسل کے ذریعہ اپنے بڑے بھائی ڈاکٹر صاحب کو بھیجیں تاکہ ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ساتھ محمد میاں ان کا مطالعہ کریں، مولانا نے اپنے خط میں لکھا۔

"ان میں کئی سو کتابیں ہیں جو مصر کے علماء و مصنفین وادباء نے ملاقات کے وقت ہدیہ دیں، اور بعض کتابیں کتب خانہ ندوۃ العلماء کے لئے اور بعض علماء ہندوستان کے لیے ہیں، سب پر ان کی تصریح ہوگی لیکن زیادہ تر ہماری ذاتی کتابیں ہیں ان میں "العقد الفرید" محمد واضح کو دے دیجائے انھوں نے فرمائش لکھی ہے۔ یہ احمدامین نے ہمیں ہدیہ کی ہے اور روحی الرسالہ ۱، ۲، ۳، اور جو کتاب محمد میاں پسند کریں وہ رکھ لیں، پھر ہم انشاء اللہ آکر جو چیز جہاں کی ہوگی بتلادیں گے، بدائع المنن بھی اس میں ہوگی اور انشاء اللہ کچھ درسی اور جغرافیائی کتابیں محمد سلمہٗ کی اور بھی کتابیں ہیں جو ہم آکر دیں گے۔ ۲۲ اپریل ۱۹۵۹ء

کتابوں کے اس پارسل کے پہونچنے میں بہت زیادہ تاخیر ہوئی جس کی وجہ سے ڈاکٹر صاحب اور محمد میاں کو اس کا انتظار بڑا سخت معلوم ہوا اور انھوں نے تقاضہ کا خط لکھا محمد میاں اپنے خط میں لکھتے ہیں۔

"عم مکرم مدظلہ العالی السلام علیکم

آداب کے بعد گزارش ہے کہ ہم لوگ بعافیت ہیں، امید ہے آپ بھی بعافیت ہوں گے، مکہ معظمہ سے آپ کا گرامی نامہ ملا مسرت ہوئی، اللہ تعالیٰ خیریت وخوشی کے ساتھ واپس لائے، اپنی خاص دعاؤں میں فراموش نہ فرمائیں، پارسل معلوم نہیں کس منزل میں ہے سخت انتظار ہے، ابھی کسی قسم کی کوئی اطلاع یا بلٹی نہیں آئی چھوٹے بھیا (مولانا محمد رابع) کو سلام۔ والسلام محمد ۲۰ ستمبر ۱۹۵۱ء

اردو تعلیم اور مطالعہ:

اب تک تو محمد میاں کی عربی تعلیم کی سرگزشت بیان کی جارہی تھی، اب ایک نظر ان کی اردو تعلیم پر بھی ڈالتے چلئے، محمد میاں نے اولاً مولوی محمد اسماعیل میرٹھی کی مشہور اور مفید عام کتاب کا سٹ پڑھا اس کے بعد اپنے والد ماجد ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب کی تصنیف "اسلام کی تعلیم" اور جد امجد مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب کی کتابیں، نورالایمان، تعلیم الاسلام پڑھیں، اس کے ساتھ ساتھ ان کی کتاب "الاصلاح" کو مطالعہ میں رکھا، نیز ڈاکٹر عبدالعلی صاحب کی تصنیف "نماز سمجھ کر پڑھئے" پڑھی جو غالباً خود ڈاکٹر صاحب موصوف نے پڑھائی ممکن ہے یہ کتاب انھوں نے اپنے بیٹے کے لئے ہی لکھی ہو۔ اس کتاب کو محمد میاں بہت زیادہ پسند کرتے تھے اور اس کی اشاعت کرتے تھے اور آخر عمر میں بھی ارادہ تھا کہ وہ اس نایاب کتاب کو دوبارہ چھپوائیں گے سیرت نبوی میں مولانا سید سلیمان صاحب ندوی کی "رحمت عالم" مولانا سلیمان منصور پوری کی "رحمت للعالمین" اور مولانا مناظر احسن گیلانی کی "النبی الخاتم" پڑھی، النبی الخاتم کی وہ بہت تعریف کرتے تھے۔ عقائد میں اولاً مولانا خرم علی صاحب بلہوری کی "نصیحۃ المسلمین" اور بعد میں مولانا اسماعیل شہید کی مشہور ومعروف کتاب تقویۃ الایمان اپنے مطالعہ میں رکھی۔

۱۹۳۹ء میں جب کہ ان کی عمر ۴ سال کی تھی، اس وقت مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی کی تصنیف "سیرت سید احمد شہیدؒ" طبع ہوکر گھر پر آئی تھی وہ اتنی خوبصورت تھی کہ ہر ایک اس کو اٹھا کر دیکھتا تھا۔ محمد میاں باوجود اس کے کہ اس کو پڑھ نہ سکتے تھے مگر اس کو دیکھتے اور اس کی خوبصورتی سے خوش ہوتے اور جب ان کی عمر ۹، ۱۰ سال کی ہوئی تو اس کو مطالعہ میں رکھا اور اس سے ان کے معصوم دل ودماغ پر بڑے خوشگوار اثرات پڑے اور جہاد ومجاہدین کی عظمت دل میں بیٹھی۔ اس کتاب کے مطالعہ نے ان کو دینی جذبات سے سرشار کردیا اور باوجود اپنی کم عمری کے انھوں نے اس سلسلہ کی دوسری کتابیں پڑھنی شروع کردیں، جن میں مولوی محمد جعفر تھانیسری کی کتاب "کالا پانی" مولوی عبدالرحیم صادقپوری کی "در منثور" غلام رسول مہر کی "سید احمد شہیدؒ، سید صاحب کے حالات پر مشتمل کتاب" وقائع احمدی" مولانا مسعود عالم ندوی کی "ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک" حضرت سید احمد شہید کی صراط مستقیم اور ان کے قلمی مکاتیب اور اپنے عم مکرم کا عربی رسالہ ترجمۃ الامام احمد ابن عرفان شامل ہیں۔ اس زمانے میں ان کے گھر میں خاندان

کے ایک بزرگ سید عبدالرزاق صاحب کلامی کی منظوم تصنیف "حسام الاسلام" ترجمہ فتوح الشام پڑھی جاتی تھی وہ اس کے جاندار اشعار سنتے اور ان سے اثر لیتے اور بعد میں خود اس کو پڑھا۔

ان کے عم مکرم کے تین رسالے وصیت رسول" "مسلمانوں پر ایک نظر" اور قلب پر تین اثر"، تفسیر الیوم اکملت لکم دینکم" چھپ چکے تھے وہ بہت مختصر اور مؤثر تھے وہ محمد میاں نے پڑھے، اسی طرح مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی کی مشہور کتاب " دعائیں" انھوں نے سبقاً سبقاً پڑھیں اور دعائیں یاد کیں۔

۱۹۴۲ء میں راقم السطور کے بڑے بھائی سید محمود حسن صاحب کا ۲۱ سال کی عمر میں انتقال ہوا، محمد میاں ان سے بہت مانوس تھے، اس حادثہ کا پورے گھر پر بہت اثر تھا، راقم السطور نے ان کے انتقال کے بعد ہی ایک مختصر رسالہ "اسلامی اخلاق" کے نام سے لکھا اور طبع کرایا، اس کی طباعت میں جو کیف و سرور اور نشاط تھا وہ اب تک یاد ہے، سارے بھائی اس کو لئے پھرتے تھے اور تقسیم بھی کرتے تھے محمد میاں مرحوم بھی اس جماعت میں شامل تھے خود بھی پڑھا اور دوسروں کو بھی دیا۔

۱۹۴۳ء میں ادارہ تعلیمات اسلام کا قیام عمل میں آیا اس نے درس قرآن کے ساتھ ساتھ دینی تصنیفات کا ایک ذخیرہ بھی مہیا کیا جو عام فہم تھا، جس میں "رسول اکرم" از مولانا عبدالسلام صاحب قدوائی، سیرت محمدی کا پیغام از مولانا سید ابوالحسن صاحب ندوی، نیز صحابہ کرام پر الگ الگ رسالے طبع کئے جن کو محمد میاں نے اپنے مطالعہ میں رکھا، انھیں میں راقم السطور کے رسالے امام ربانی مجدد الف ثانی اور حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی بھی تھے جو محمد میاں نے پڑھے۔

۱۹۴۶ء میں محمد میاں کی عمر گیارہ سال کی تھی، اس سال راقم السطور نے ایک مکتبہ کی بنیاد رکھی جس کا نام مکتبۂ اسلام تھا، اس میں حضرت تھانوی کی تصنیفات، ادارہ تعلیمات اسلام کی ساری کتابیں مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کی تصنیفات جو استاذ مکرم مولانا مسعود عالم صاحب ندوی مرحوم کے ذریعہ دستیاب ہوئی تھیں جمع کی گئی تھیں، راقم السطور کو اچھی طرح یاد ہے کہ محمد میاں کا اکثر وقت اس دوکان پر گزرتا تھا اور وہ اس مکتبہ کی اکثر کتابیں اٹھا اٹھا کر پڑھتے تھے۔

مکتبہ اسلام نے مولانا سید ابوالحسن علی صاحب کی تصنیف "مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر" چھاپی وہ طبع ہو کر دہلی سے آئی تو محمد میاں نے اول سے آخر تک اس کو پڑھ ڈالی، اسی زمانہ میں امۃ اللہ تسنیم صاحبہ

(جو ان کی پھوپھی تھیں) کی زاد سفر ترجمہ "ریاض الصالحین" چھپی وہ گھر کی چیز تھی اور خاصہ کی، وہ محمد میاں نے پڑھی ان کا شعور بیدار ہوا اور مطالعہ کی قوت بڑھی، علم کا شوق روز افزوں ہونے لگا تو انھوں نے دیکھا کہ ان کی والدہ ماجدہ کے ہاتھوں میں ایک کتاب رہتی ہے جو ہر وقت وہ پڑھتی رہتی ہیں اس کا نام طریقہ النجاۃ (ترجمہ مشکوٰۃ) ہے وہ کتاب انھوں نے پڑھنی شروع کی اور ختم کر ڈالی اور اس کی کئی حدیثیں زبانی یاد کرلیں، ایک کتاب "میری محسن کتابیں" بھی ہے جسے انھوں نے بغور پڑھا اور اس سے بہت کچھ استفادہ کیا، مولانا شبلی کی سیرۃ النبی، الفاروق، النعمان نیز "دارالمصنفین کی مطبوعات خصوصاً سیر الصحابہ نے ان کے ذہن و دماغ پر گہرے اثرات ڈالے۔

رسالے اور ماہنامے:

رسالوں میں سب سے پہلے "پھول" "غنچہ" اور پھر "پیام تعلیم" ان کی نظر سے گزرا، یہ ان کی بہت کم عمری کا زمانہ تھا، اسی زمانہ میں جالندھر سے "مسلمہ" نام کا ایک پاکیزہ ماہنامہ جو مسلم خواتین کے لیے نکلتا تھا ڈاکٹر صاحب اپنی بچیوں کے لیے منگاتے تھے اس میں اکثر محمد میاں کی پھوپھی محترمہ امۃ اللہ تسنیم صاحبہ کے مضامین شائع ہوتے تھے، وہ رسالہ محمد میاں پڑھتے تھے اور بعد میں خود بھی مضمون لکھا۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء کا آرگن الندوہ قدیم و جدید جو دو مختلف دوروں میں چند سال نکل کر بند ہو چکا تھا اس کے فائل ان کے مطالعہ میں رہے۔

۱۹۴۶ء میں مشہور دینی رسالہ "الفرقان" جو بریلی سے مولانا محمد منظور صاحب نعمانی کی ادارت میں نکلتا تھا، لکھنؤ منتقل ہو گیا، اس کا دفتر گویا اس محلے میں لب سڑک کھلا جہاں محمد میاں کا گھر ہے اس رسالہ میں مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی کے مستقلاً مضامین شائع ہوتے وہ رسالہ گھر پر آتا تھا، محمد میاں نے اس کا خصوصی طور پر مطالعہ کیا اور آخر تک مطالعہ کرتے رہے۔

۱۹۴۸ء میں ادارہ تعلیمات اسلام سے "تعمیر" کے نام سے رسالہ نکلنا شروع ہوا، اس میں مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی کے بکثرت مضامین شائع ہوتے تھے وہ سارے مضامین محمد میاں کے مطالعہ میں آئے۔ "برہان" دہلی، "معارف" اعظم گڑھ پہلے ہی سے مطالعہ میں رکھے اور آخر زندگی معرفت حق الہ آباد اور "الحق" "خنک"، "بینات" کراچی برابر مطالعہ کرتے رہے۔

۱۹۵۰ء کے بعد کا زمانہ محمد میاں کے علم کا روشن زمانہ تھا، وہ اس وقت تک بہت کچھ پڑھ چکے تھے اور ہر وہ رسالہ یا کتاب ان کی نظر سے گزر چکی تھی جو اس گھر میں آتی تھی، ان کا مطالعہ وسیع اور انکی نظر عمیق ہو چکی تھی۔

مختلف علوم کی کتابیں :

علماء و مشاہیر کی آمد اور ان کی تصنیفات کی کثرت نے ہر علم و فن کے مطالعہ کا دروازہ کھول دیا۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کی تفسیر قرآن ان کی "انشاء ماجد" حکیم الامت" صدق جدید اور سچ کی فائلوں نے محمد میاں کی زبان و ادب کو نکھارنا شروع کر دیا، وہ فکر و ذوق میں اپنے عم مکرم مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی کے مشنّٰی اور زبان و ادب میں مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کے شاگرد ٹھہرے

محمد میاں کے والد ماجد سے قریبی تعلق رکھنے والے بزرگ مولانا عبدالباری صاحب سابق پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد کی وہ تصنیفات جو فلسفہ اور معاشیات پر تھیں اور وہ تصنیفات جو حضرت تھانویؒ سے تعلق قائم کرنے کے بعد ان کی تعلیمات پر تھیں جیسے جامع المجددین وغیرہ ان سب کو بغور پڑھا، خصوصاً انکی مذہبی کتابوں کو اپنے پاس رکھا۔

شعر و سخن :

سخن فہمی اور شعر کا ذوق ان کو آبائی ملا تھا، گھر ہی پر کئی شاعر گزرے تھے، ان کے پردادا مولانا فخرالدین صاحب خیالی صاحب مہر جہاں تاب، جدامجد مولانا سید عبدالحی صاحب، صاحب گل رعنا اور دادی محترمہ سیدہ خیرالنساء صاحبہ بہتر، پھوپھی امۃ اللہ تسنیم صاحبہ پر مشتمل افراد شاعر بھی تھے اور سخن فہم بھی۔ محمد میاں نے گل رعنا جو شعراء کے حالات اور ان کے کلام کے نمونوں پر مشتمل ہے بار بار پڑھی اسی طریقہ سے دادی صاحبہ کی باب رحمت، پھوپھی صاحبہ کی باب کرم، مولانا فخرالدین صاحب خیالی کا دیوان جو قلمی ہے مطالعہ میں رکھا، گھر کے باہر کے اہل سخن میں، اکبر، اقبال، جگر کے دیوانوں اور کلاموں کے بڑے شائق تھے آبِ حیات اور علامہ شبلی کی شعر العجم پڑھی، آخر میں زائر حرم حمید صدیقی کا دیوان نعت، گلبانگ حرم بھی بڑے ذوق و شوق سے پڑھتے تھے اور اس کے اکثر اشعار یاد تھے اور گنگناتے رہتے تھے۔ ان کتابوں کے علاوہ شاید

ہی کسی شاعر کا دیوان خواہ وہ قدیم ہو یا جدید ان کے مطالعہ سے بچا ہو، ان کو اُردو فارسی اور عربی اشعار یاد تھے اور دیوانوں کے کثرت مطالعہ اور خداداد ستھرے ذوق اور سخن فہمی سے ان میں یہ ملکہ پیدا ہو گیا تھا کہ وہ بروقت مناسب حال شعر پڑھتے تھے۔ اور کسی کے نتیجہ میں بے تکلف موزوں مصرعے کہہ دیتے تھے اور اشعار میں اصلاح بھی کر دیتے تھے اس کے باوجود وہ شاعر نہ تھے۔

ان ساری کتابوں کے پڑھنے سے ان کے دل و دماغ میں دین اور اہل دین کی عظمت زبان و ادب کی چاشنی قلم کی روانی علم کی وسعت اور گیرائی گہرائی کے نقوش ثبت ہو گئے۔

اسلوب اور فکر و نظر میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے مشنّٰی :

انھوں نے اپنے عم مکرم کی چھوٹی بڑی قدیم و جدید ساری کتابوں اور ان کے سارے مضامین کو جو مختلف رسائل اور ماہناموں میں چھپتے رہے تھے پوری توجہ اور انہماک سے پڑھا اور ان کے اسلوب طرز تحریر، فکر و ذوق، احساسات و خیالات کو اپنا کر اپنے قلم میں ان کو سمو دیا اور ان کو اپنا مثل اعلیٰ بنا کر قلمی جہاد شروع کر دیا اور یہ جہاد تادم مرگ کرتے رہے جس کی انتہا اس مضمون پر ہوتی ہے جو انھوں نے اپنے انتقال سے صرف ایک دن پہلے ندائے ملت کے لئے لکھا تھا جس کا عنوان تھا "سد سکندری کی نہیں بلکہ سد ایمانی کی ضرورت ہے" جس میں انھوں نے بڑی صاف گوئی اور جسارت و قوت کے ساتھ ایمان کی دعوت دی تھی، محمد میاں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ۱۹۴۹ء سے ۱۹۷۹ء تک تقریباً تیس سال مسلسل پڑھتے رہے اور لکھتے رہے۔ یہ ان کی زندگی کا عزیز ترین مشغلہ تھا، اور اسی طرح جہاد بالقلم کرتے کرتے انھوں نے اپنی جان کو جان آفریں کے سپرد کر دیا، لیکن اس مسلسل جہاد اور تھکا دینے والی مصروفیت کے باوجود ان کا ہر بُن مو کہتا رہا۔

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

اس میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں کہ زبان و قلم فکر و ذوق، احساسات و خیالات اور قلب و نظر کی کیفیت اور جسم و جاں کی یگانگت حتی کہ رسم خط طرز ادا میں ان دونوں چچا و بھتیجے میں ایسا حسین، ایسا جمیل اور ایسا دلکش امتزاج پیدا ہو گیا تھا کہ دونوں یک جاں دو قالب

بن کر رہ گئے تھے، اور ان دونوں کی زبان حال گویا ہونے لگی تھی۔

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی
تا کس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

(زیرِ تصنیف کتاب کا ایک اقتباس)

نفاذِ شریعت

ہم نفاذ شریعت میں صرف چور کا ہاتھ کاٹنے اور زانی کو سنگسار کرنے ہی کا مطالبہ نہیں کرتے ہیں بلکہ اس کے اسباب و محرکات کے سدباب کا بھی مطالبہ کرتے ہیں...
.... شرعی قوانین کے نفاذ کا مطالبہ ہم حکمرانوں سے کرتے ہیں، عام راہ پر چلتے ہوئے آدمیوں سے کرتے ہیں، نگہبان اور رعیت کے تمام گوشوں میں نفاذ شریعت کا مطالبہ کرتے ہیں اور زندگی کے تمام میدانوں میں ماہم مربوط اور مضبوط کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں۔

(مولانا محمد الحسنی ندوی مرحوم)

وہ فیضانِ حق کا نمونہ تھے

ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی

محمد میاں، ایک جواں صالح، خدا ترس و خدا مست مرد مجاہد تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کے اندر غیر معمولی صلاحیتیں جمع کر دی تھیں، اللہ کے دین کی حمیت ان کو وراثت میں ملی تھی، اسلام کی خدمت کا جذبہ اور غیرتِ حق ان کے رگ و ریشہ میں سرایت کی ہوئی تھی، ان کا خمیر تعلق باللہ، تقویٰ اور انابت الی اللہ سے تیار ہوا، بقول مولانا عبدالماجد دریابادیؒ، اللہ نے ایسی پاک مٹی سے انہیں بنایا ہے جو تیم کے لائق ہو لیے قدرت کی فیض بخشی نے ان کے فکر میں تازگی اور قلم میں جولانی عطا کی تھی، ان کے قلم سے ڈھلے ڈھلائے جملے ایسے نکلتے تھے جن میں فطری آمد تھی، جوش و صدقِ احساس کا ایک ابال تھا جو صفحۂ قرطاس پر بکھر جاتا۔ انہوں نے کسی عرب ملک میں تعلیم نہیں پائی تھی بلکہ سوائے حج کے کوئی بلاد عربیہ کا سفر بھی نہیں کیا تھا، اور حج کا سفر بھی بہت بعد میں کیا جب کہ عربی ماہنامہ "البعث الاسلامی"، کی اشاعت کے کئی سال پورے ہو چکے تھے، مگر عربی تحریر پر وہ قدرت تھی کہ عربی کے مسلم صحافی اور اہل قلم ان کے قلم کا لوہا مانتے تھے، ایک فیضانِ حق کا نمونہ تھا، ایک وہبی صلاحیت تھی جس کا سرا محض اللہ کی بخشیدہ صلاحیت سے تھا، زور بازو کو اس میں دخل نہیں تھا، یہ بات ان کے معتقدوں ہی کو نہیں بلکہ معاند کو تسلیم کرنا پڑتی تھی۔ ان کے معاند بھی ان کی ذات کے معاند نہیں تھے، ان سے کسی کو گزند نہیں پہونچا تھا کہ کوئی ان کا حریف ہوتا، ان کا معاند وہی تھا جس کو دین سے عناد تھا، اور اسلام سے جو بغض رکھتا تھا۔ ان کی تحریروں کی قوت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ اسلامی فکر رکھنے والے عرب نوجوان ان کے مقالات کو اپنے ذاتی خطوط میں نقل کر کے مصر و شام کے دوستوں کو بھیجا کرتے تھے کیونکہ ان ممالک میں "البعث الاسلامی"، کا داخلہ بند تھا، اور شام و عراق میں آج بھی بند ہے۔ "البعث الاشتراکی"، کے داعی "البعث الاسلامی" کی دعوت کیونکر برداشت کر سکتے ہیں، عربی زبان پر ان کی ماہرانہ دسترس ہمیں مولانا محمد علی جوہر کی یاد دلاتی ہے جنھیں انگریزی زبان[1]

---

[1] حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ، کے ذکر میں یہ جملہ مولانا دریابادیؒ نے لکھا ہے۔

میں ایسا انداز تحریر ملا تھا جس پر انگریز اہل زبان رشک کرتے تھے،

محمد میاں کے قلم نے کسی کلمہ گو پر کبھی حملہ نہیں کیا، کسی کی پگڑی اچھالنا، مذاق اڑانا، طنز و تعریض کرنا تو دور کی بات ہے اشارۃً "کنایۃً" بھی کسی کی توہین کا ارتکاب ان سے نہیں ہوا۔ ہاں جب معرکۂ حق و باطل پیش آیا اور عرب ممالک میں قومیت غربیہ کے نعرہ نے اسلام کے متوازی Panalleel جگہ بنانا شروع کی تو وہ اس قومیت کے خرمن پر آگ بن کر برسے اور بجلی بن کر گرے، اسی طرح بعض عربؔ دانش وروں" نے جب مادی فلسفوں کی تبلیغ شروع کی اور جان پول سارٹر کے ادب وجودی کو ایک اعلیٰ فکری نمونہ بنا کر پیش کرنے لگے تو محمد میاںؒ کا قلم غیرتِ حق سے بے تاب ہو گیا اور اس پر مسلسل حملے کئے اور کامیاب حملے کئے۔

انہوں نے نوعمری میں امتیازی حیثیت حاصل کر لی تھی، ان کا پہلا مضمون عربی کے بہت ہی سنجیدہ اور معیاری دینی ماہنامہ "المسلمون" میں شائع ہوا جس کا عنوان تھا "الاسلام علیٰ مفترق الطرق" "اسلام راستوں کے موڑ پر" اس رسالہ کے اڈیٹر ڈاکٹر سعید رمضان نے یہ مقالہ نمایاں طور پر شائع کیا اور مقالہ نگار کا نام ان القاب کے ساتھ لکھا جو ایک معمرؔ عالم دین اور کہنہ مشق ادیب کے لیے موزوں ہو سکتا تھا پھر جب وہ لکھنؤ آئے تو انہوں نے محمد میاںؒ کو دیکھا جن کی عمر ۲۱-۲۲ سال کی تھی۔ چہرے سے بھولا پن اور سادگی نمایاں تھی، ڈاکٹر سعید رمضان کو یقین دلانے کی ضرورت پڑی کہ واقعی اس مقالہ کے مصنف یہی صاحبزادے ہیں۔

چہرے بشرے کے بھولے پن کا جہاں تک تعلق ہے وہ ایک متقی، صالح اور عفیف انسان میں ہمیشہ قائم رہتی ہے، ان کی عمر اب چالیس سے متجاوز ہو چکی تھی، مگر ظاہری وجاہت پر صباحت غالب تھی، ان کی نگاہیں بلند تھیں، اور آنکھیں حیا و مروت سے ہمیشہ سے نیچی رہتی تھیں، چالاکی، فن کاری اور کاروباری انداز کی تہمت ان پر کوئی دشمن بھی نہیں لگا سکتا تھا، ان کی وفات سے قدرتاً ذہن اُن باکمال انسانوں کی طرف منتقل ہوتا ہے جو عمر کی اسی لپیٹ میں دنیا سے رخصت ہو گئے مگر ان کے کام کی مقدار اور معنویت اتنی ہے کہ اگر کوئی عمر طبعی پا کر بھی اتنا کام کر جائے یا اس سے نصف بھی کر لے تو اس کو ناکام نہیں کہا جا سکتا، ہاں حسرت یہ ضرور ہوتی ہے کہ اگر کہیں وہ عمر طبعی لے کر اس دنیا میں آئے ہوتے تو امت کے لئے کیا کام کر جاتے۔ مولانا محمد میاں بلاشبہ انہی باکمال افراد امت میں تھے، انہوں نے اپنی مختصر عرصۂ حیات میں بڑے کام کئے، متعدد کتابوں کے ترجمے کئے، مستقل تصنیفیں کیں، ان کا آخری ترجمہ سیرۃ النبیؐ کا اردو ترجمہ تھا، یہ کتاب حضرت مولانا سید ابوالحسن علی

مدظلہ، کی تالیف ہے جو اصلاً عربی میں لکھی گئی اور اس کا ترجمہ محمد میاں نے نبی رحمت کے نام سے کیا ہے۔ اللہ کی رحمت سے امید ہے کہ آج وہ یہ نذرِ عقیدت اپنے دونوں ہاتھوں سے صاحب سیرتؐ کے حضور میں پیش کر رہے ہوں گے، کہ ان کی زندگی کا یہی آخری کام ہے۔

محمد میاں اپنے عم نامدار حضرت مولانا کے جگر گوشہ اور قرۃ العین تھے، جنھیں دیکھ کر حضرت مولانا کو خود اپنے اندر توانائی محسوس ہوتی ہوگی، ان کی زبان حال محمد میاں کو خواجہ حافظ کی زبان میں مخاطب کرتی ہو تو حیرت کی بات نہیں ہے کہ ؎

ہر چند پیر و خستہ دل و ناتواں شدم ہر گہ کہ بادِ روئے تو کردم جواں شدم

ان کی طرف سے فرزندانہ سعادت مندی بھی اسی درجہ کی تھی جس کی توقع ایک بامروت، متقی اور شکر گزار دل رکھنے والے سے کی جا سکتی ہے۔ محمد میاں اپنے عم نامدار کے نقش آور آئینہ بن چکے تھے، ان کی تحریر مولانا کی تحریر سے، اور قلم مولانا کے قلم سے مل گیا تھا، خاندانی و موروثی صفات بدرجۂ اتم ان کے اندر موجود تھیں، اپنے آبا، کی مسند کے لئے موزوں ترین فرد تھے۔ اللہ کی طرف سے بخشی ہوئی سکینت جو اہل اللہ کو حاصل ہوتی ہے اور اللہ کا نام پاک ان کے زخمی دلوں کے لئے ٹھنڈے مرہم کا کام کرتا ہے۔ آج اس خانوادہ کا سرمایہ اور یہی ڈھارس ہے۔

شرط اولیں

فتح و کامرانی کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ محاذ پر کھڑے لشکر کو قائد اور لیڈر اور جنرل معاصی کے ارتکاب اور محرمات سے دور رکھیں، جس طرح ظہیر الدین بابر نے کیا تھا۔ اپنی تمام تر توجہات و کوششوں کے ذریعے لشکر کے فتح و کامرانی کے منافی چیزوں سے پاک کر دیں چاہے وہ واضح اخلاقی گناہ ہو یا عملی زندگی میں ہو یا عقیدہ و فکر کے میدان میں یا تشکیک و الحاد و گمراہی ہو۔

(مولانا محمد الحسنی ندوی مرحوم)

محمد میاں حسنی

صفات وخصوصیات

از محمد رابع حسنی (ندوی)

عزیز بھائی محمد میاں حسنی جن کو آج بجائے سلمہ کے رحمۃ اللہ علیہ لکھنا پڑ رہا ہے، یہ اندازہ نہ تھا کہ اس قدر جلد داغ مفارقت دے جائیں گے، اور ہمارے خاندان کا یہ عزیز ترین رکن اور ہماری جماعت کا یہ ممتاز فرد دیکھتے دیکھتے نظروں سے اوجھل ہوجائے گا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

محمد میاں مرحوم ابھی جوان ہی تھے، لیکن انھوں نے اپنی چھوٹی سی عمر میں خاصا تحریری وفکری کام انجام دیا، ان کی عمر کو دیکھتے ہوئے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ فکر وادب کا جتنا ذخیرہ اس نوجوان قلم نے اب تک پیش کیا ہے آئندہ متوقع عمر میں کم از کم اتنی ہی مقدار کا ضرور اضافہ کرے گا، لیکن تقدیر الٰہی میں ان کی عمر مختصر تھی۔

محمد میاں نے شمسی تاریخ سے ۴۴ سال اور قمری تاریخ سے ۴۵ سال کی عمر پائی، اس میں سعی وعمل کی ۲۵ سالہ عمر انھوں نے ساری کی ساری خدمت، دعوت فکر اسلامی میں گزاری۔ ان کا قلم اس پوری مدت جوش وجذبہ کے ساتھ رواں دواں رہا، ان کا ذہن رسا، ہمت بلند، ذوق ستھرا اور ادراک قوی تھا، وہ عمر کے آخری دن تک لکھتے اور کام کرتے رہے اور جب چند گھنٹوں کی علالت کے بعد اس دنیا سے اچانک رخصت ہوئے تو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے ایک انہونی تھی جو پیش آگئی جو سنتا تھا تعجب کرتا تھا، اور رنج سے مغلوب ہوجاتا، لوگ کہتے کہ ابھی کل تک تو صحت ونشاط کے عالم میں ملاقات ہوئی تھی، ابھی کل تک ان کو مرنجاں مرنج دیکھا اور پایا تھا، لیکن واقعہ واقعہ تھا، قضا وقدر کا معاملہ، اللہ تعالیٰ کی مرضی۔ للہ ما اخذ ولہ ما اعطی وکل شی عندہ باجل مسمی، اللہ ہی کا ہے جو اس نے لیا اور اس نے دیا اور ہر شے اس کے یہاں ایک مدت کے ساتھ ہے۔

محمد میاں اپنی کئی بہنوں کے درمیان تنہا بھائی تھے اور سب بہنوں سے چھوٹے تھے، لہٰذا ان کی پیدائش نہ صرف ان کے والدین بلکہ ان کی بہنوں اور ان کے اہل تعلق کے لیے بے حد مسرت کا باعث تھی، چنانچہ ان کے

نشأ ونما کا زمانہ والدین کی خصوصی شفقت اور بہنوں کی خصوصی محبت میں گزرا، لیکن اس کے باوجود نشأ ونما کے زمانہ میں بھی ان کے عادات وصفات پسندیدہ رہے۔ ان کے بڑوں کے دل میں ان کی محبت نہ صرف یہ کہ قائم رہی بلکہ اس میں اضافہ ہوتا رہا، اپنے والدین کی سب سے چھوٹی اولاد ہونے کی وجہ سے محمد میاں کو کم عمری ہی میں اپنے والدین کے انتقال کا غم سہنا پڑا۔ والدہ کے انتقال کے وقت وہ صرف ۲۲ سال کے اور والد کے انتقال پر ۲۶ سال کی عمر کے تھے۔ اس طرح پر نوعمری میں، ان پر گھریلو ذمہ داری کا بڑا بوجھ پڑ گیا۔ انھوں نے اس سلسلہ کی ذمہ داری کو خوبی کے ساتھ اٹھایا اور اپنے والدین کے خلف الصدق ثابت ہوئے۔

محمد میاں کی شعوری عمر کا نصف حصہ ان کے عظیم والد ڈاکٹر مولانا سید عبدالعلی حسنی کی سرپرستی اور تربیت میں گزرا۔ یہ ان کے نشأ ونما کا دور تھا، اس میں ان کے علم وادب اور بنیادی اخلاق وافکار کی بنیاد پڑی، ان کی تعلیم وتربیت کا بیشتر کام ان کے فاضل والد نے خود اپنے تجربوں کی روشنی میں اور خصوصی اہتمام سے انجام دیا، انھوں نے عربی تعلیم کا جو طریقہ اختیار کیا وہ بالکل اچھوتا تھا، انھوں نے صرف ونحو کے بجائے خود زبان ہی کو اصول اور زبان ہی کو اساس بنایا، ان کی نظر میں زبان کو فطری طریقہ سے سکھانے کا یہی صحیح طرز تھا، انھوں نے محمد میاں کو اس طرز کے ذریعہ عربی دانی اور عربی نگاری کی کامیاب منزل تک پہنچا کر اپنے اصول کی کامیابی کا ثبوت فراہم کردیا، محمد میاں کی عربی صلاحیت کی ساری اساس اسی مذکورہ بالا طرز پر ہی قائم تھی جس کی صحت وتاثیر کا خراج ان کو سارے عالم عربی سے ملا۔

محمد میاں کے فاضل والد مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب جنھوں نے علوم دینیہ کی مکمل تعلیم حاصل کرنے کے بعد عصری تعلیم میں بھی نمایاں معیار سے کامیابی حاصل کی تھی، علم وتعلیم کا بہت اچھا تجربہ وذوق رکھتے تھے، انھوں نے یہ نظریہ قائم کیا تھا کہ دنیاوی نظام تعلیم مسلمان کے انسانی ودینی کردار وشخصیت کو ایک ضرر پہنچا دیتا ہے جس کا مکمل ازالہ زندگی بھر نہیں ہوپاتا، اور یہ کہتے تھے کہ یہ ضرر مجھ کو بھی ہوا ہے میں باوجود کوشش کے اب تک اس کو دور نہیں کرسکا ہوں، چنانچہ انھوں نے اپنے بیٹے کو جو ان کے اختیار میں تھے، عصری علوم کی درس گاہوں میں نہیں بھیجا اور مادی مستقبل کی فکر سے بے نیازی اختیار کی، تعلیم کے حصول میں ان کا نقطۂ نظر علم کی فکر زیادہ اور سند کی پرواہ نہ کرنے کا تھا، چنانچہ ان نظریات پر عمل انھوں نے خود اپنے بیٹے پر پورے اخلاص سے کیا، حالانکہ ایک کامیاب ایم، بی، بی، ایس ڈاکٹر ہونے کے ناطے وہ بہتر سے بہتر مادی تعلیم دلا سکتے تھے، یہاں یہ تذکرہ مناسب ہوگا کہ مذکورہ بالا طرز عمل کی وجہ سے محمد میاں کی تعلیم

بالکل نئے طریقہ سے ہوئی جس میں کسی تعلیم گاہ میں نام کے اندراج و سند کے حصول سے بالکل بے نیازی تھی اسی طرح محمد میاں کے اخلاق و نیک نفسی ان کے والد کی تربیت و توجہ کا بڑا حصہ ہے۔ متعدد خوبیاں اپنے والد سے ورثہ میں پائیں اور متعدد صفات ان کے والد کی خصوصی تربیت کا نتیجہ ہیں۔

محمد میاں کی شعوری عمر کا بقیہ نصف حصہ ان کے فاضل یگانہ چچا مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کی سرپرستی اور رہ نمائی میں گزرا، انھوں نے اپنے عم معظم سے بہت سی باتیں اخذ کیں، طرز زندگی میں ان کا نمونہ اختیار کیا، تصنیف و تالیف و ادب کی راہ سے دین و دعوت دین کی خدمت کو اپنا نصب العین بنایا۔ محمد میاں کی زندگی کے ماوی تکفل کے لیے ڈاکٹری پیشہ اور طبی مشغولیت آبائی ورثہ تھا، خاندان کے بزرگ بھی ان کی معاشی زندگی کے لیے یہی راہ پسند کرتے تھے، اور اسی کو تجویز کرتے تھے، لیکن انھوں نے اس سلسلہ میں کسی کی تجویز و اصرار کو منظور نہیں کیا، بعض تعلق والوں کی ناگواری برداشت کرنے کے لیے تیار ہو گئے، لیکن یہ قبول نہیں کیا، کہ وہ کوئی ایسا کام اختیار کریں جس کی مشغولیت ان کو علم و ادب کے دعوتی راستہ پر گامزن ہونے سے مانع بنے۔

محمد میاں نے اپنے عم معظم کے طریقہ کو ایسے ذوق و شوق سے اختیار کیا کہ تعبیر و زبان میں ان کے مثنی بن گئے مولانا سید ابوالحسن علی صاحب حسنی مدظلہ کی تحریر و زبان میں خواہ عربی ہو یا اردو محمد میاں کی تحریر و زبان کا جوڑ بالکل محسوس نہیں ہوتا ۔ فکر سے فکر تحریر سے تحریر مل گئی ہے، انھوں نے اپنے عم معظم کی جن عربی کتابوں یا مضامین کا اردو میں اور جن اردو کتابوں یا مضامین کا عربی ترجمہ کیا ہے لوگ یہ بتانے ہی پر مان سکے کہ وہ ترجمہ ہے ورنہ وہ اصل مصنف کی عبارت ہی سمجھی جاتی تھی اس طرح پر وہ اپنے مفکر و داعی عم معظم کے لیے بڑے اچھے معاون اور کامیاب نائب ثابت ہوئے اور ان کے دعوتی ادبی کاموں میں بڑی تقویت کا باعث تھے۔

محمد میاں کی رحلت صرف ایک ایسے بھائی یا دوست یا محب کی رحلت نہیں، جو کم عمری میں اس دنیا سے رخصت ہو کر دلوں کو ملول کر گیا ہو بلکہ یہ رحلت اس داعی کی ہے جو اپنی طاقتور مؤثر تحریروں سے مسلمان ذہنوں کی آبیاری کرتا تھا، وہ مسلمانوں کی ذہنی و عملی بے راہ روی کو چوٹ پہونچاتا اور صحیح ذہن و اخلاق کا محل بناتا تھا، وہ ایک طرف غلط ذہنی رجحانات پر حملہ کرتا تھا دوسری طرف نوجوان مسلم نسل کے لیے فکری رہنمائی کی راہیں بناتا تھا، اس کے قلم کی جولانگاہ اردو اور عربی دونوں تھیں لیکن عالم عربی میں محمد میاں کو جو شہرت

حاصل ہوئی اور وہاں ان کے مضامین کی جو قدر ہوئی وہ اردو کے مقابلہ میں کہیں زیادہ عظیم ہے، محمد میاں نے ۱۹۵۶ء میں اپنے بعض دوستوں کی رفاقت میں عربی ماہنامہ "البعث الاسلامی" کا اجرا کیا یہ ہند و پاک میں اپنے معیار کا پہلا عربی رسالہ تھا، پرچہ نکالنے والے کی ہمت تھی کہ عربی صحافت کے بالکل اجنبی ماحول میں اس نے ایسا جرأت مندانہ اور حوصلہ مندانہ اقدام کیا، وسائل کی کمی اور حالات کی ناسازگاری کے باوجود عربی صحافت کے اس پودے نے درخت بننا شروع کیا اور چند سال ہی میں محمد میاں کے مضامین کی گونج عالم عربی میں سنائی دینے لگی اور "البعث الاسلامی" نے شہرت حاصل کرنا شروع کر دی۔ اس پرچہ کی ہمت افزائی کرتے ہوئے ندوۃ العلماء نے اس کو اپنا ترجمان بنا لیا اور آج جبکہ اس عربی ماہنامہ کی عمر کے ۲۳ سال گزرے ہیں اس کا روح رواں اس دنیائے فانی سے دار باقی کو رحلت کر گیا۔ البعث الاسلامی کی شہرت و مقبولیت میں ان افتتاحیوں کا بڑا دخل ہے جو محمد میاں نے ۲۳ سالہ مدت میں تحریر کیے۔ البعث میں ان کے قریبی رفیق و شریک کار مولانا سعید الرحمٰن صاحب ندوی رہے جن پر اب البعث الاسلامی کے کام کا بار بڑھ گیا ہے

محمد میاں کے لکھے ہوئے مذکورہ بالا افتتاحیوں کا جو پہلا مجموعہ "الاسلام المستعلن" کے نام سے سال گزشتہ مصر سے شائع ہوا، اس نے موجودہ عالم اسلام کی مؤثر کتابوں کی صف میں ممتاز جگہ بنائی ہے مضامین کا دوسرا مجموعہ بھی "الاسلام بین لا و نعم" کے نام سے اشاعت کے لیے ناشر کے پاس بھیجا جا چکا ہے، محمد میاں نے البعث الاسلامی کے علاوہ عربی پندرہ روزہ الرائد کے لیے بھی بالتسلسل مضامین لکھے جو عالم عربی میں شائع ہونے والے رسالوں اور اخباروں میں بار بار نقل کیے گئے اور ان کے اثرات و طاقت کو محسوس کیا گیا، اس اخبار کے بھی اجرا کے وقت سے محمد میاں نے اس سے دلچسپی رکھی اور معاونت کی اور اس کی ترقی و تحسین کے سلسلہ میں بڑا تعاون کیا۔ الرائد میں محمد میاں صفحہ اول پر الاضواء کے عنوان سے مستقل کالم لکھتے تھے جو دلچسپ اور مؤثر ہوتا تھا، انھوں نے اس کے لیے آخری بار ایک بہت اچھا اور فکر انگیز کالم تحریر کیا تھا، ان کے انتقال کے بعد بلکہ ان کے انتقال کی خبر کے ساتھ شائع ہوا۔

اردو میں محمد میاں کے قلم کا اصل میدان ندوۃ العلماء کا پندرہ روزہ "تعمیر حیات" بنا۔ وہ اس کے اجرا کے وقت سے عرصہ تک اس کے فعال مدیر رہے، وہ اس کو اپنے طاقتور مقالوں کے ذریعہ اپنی زندگی کے آخری وقت تک مدد پہنچاتے رہے۔ "تعمیر حیات" کے علاوہ پندرہ روزہ "ندائے ملت" میں بھی محمد میاں کے مضامین شائع ہوتے رہے جن سے ندائے ملت کے قارئین کو فکری و اسلامی غذا ملتی رہی، اس کے لیے بھی محمد میاں نے اپنی زندگی

کے آخری دن تک مضمون لکھا، ان کا آخری مضمون اس میں ان کے انتقال کے بعد شائع ہوا۔

محمد میاں کی تصنیفات اور ترجموں میں ان کی تصنیفی صلاحیت اور زبان کی خوبی نے پڑھنے والوں سے خوب داد لی، انھوں نے سادات حسنی کے ایک بڑے مورث حضرت شاہ علم اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح لکھی، انھوں نے بانی ندوۃ العلماء کی ایک وقیع سوانح بھی مرتب کی، انھوں نے ندوۃ العلماء کے جشن تعلیمی کی روئداد "روداد چمن" بڑے اثر انگیز انداز میں مرتب کی جو ان کے زور قلم اور خوبی کی ایک اچھی مثال ہے ——— ان کی اور بھی کئی تصنیفات ہیں، ان کے ترجمے اُردو سے عربی اور عربی سے اردو دونوں زبانوں میں ہوئے، ان میں سے بعض ترجمے مستقل تصنیف کی حیثیت کے مالک ہیں، تصنیف و ترجمہ ملا کر محمد میاں کی ۱۹ کتابیں ہیں۔

محمد میاں کو نوجوان مسلم نسل میں زندگی کا صحیح شعور پیدا کرنے اور ان کو دعوت اسلامی کے لئے متحد کرنے کا بے حد جذبہ تھا، اس سلسلہ میں ان کا ذہن نئی اسکیمیں سوچتا جن کے بنیادی اشارے وہ اکثر صفحۂ قرطاس پر بھی لے آتے، ان کے ذہن میں ایک ایسی تربیت گاہ کی بھی ضرورت ابھرتی رہتی، جس کے ذریعہ نئی نسل میں صحیح دینی شعور، حقائق زندگی کی صحیح فہم، تجزیاتی علوم میں امتیاز و کمال اور دعوت اسلامی کا جذبہ اور حکیمانہ مہارت پیدا کیا جانا آسان ہو۔ اس سلسلہ میں عربی کے پندرہ روزہ الرائد میں، ان کا آخری مضمون جامعۃ البعث الاسلامی ان کے مطمح نظر کی پوری تصویر پیش کرتا ہے، ندوۃ العلماء کی تحریک کو انھوں نے اپنی تحریروں میں بہت سراہا ہے اور اس سے بڑی توقعات قائم کی ہیں، انھوں نے اپنی کئی کتابوں میں اس کے پیغام اور کام کی وکالت اور مؤثر ترجمانی کی ہے، ان کی اس سلسلہ میں یہ تمنا رہی کہ اس کے بانیوں کے تیار کیے ہوئے نقشہ کے وہ پہلو بھی نافذ العمل ہو سکتے جو مختلف موانع اور دشواریوں کے باعث ابھی تک عمل میں نہیں آسکے۔

محمد میاں کے ذوق میں نفاست اور اتیج تھی، ان کی نظر تنسیق و ترتیب حسن و جمال کی طرف بآسانی پہونچتی، نئی اسکیم ترتیب دینے میں ان کا ذہن بہت اچھا چلتا تھا، ان کی یہ خوبی ان کے رفقا اور دوستوں کو معلوم تھی چنانچہ ایسے موقعوں پر ان کے مشوروں سے بہت فائدہ حاصل ہوتا تھا۔

محمد میاں نے آج سے پندرہ بیس سال قبل نوجوانوں کی دعوتی وحدت کی خاطر ایک بین الاقوامی ادارہ کی تشکیل بھی کی تھی جس کا نام انھوں نے "الرابطۃ الاسلامیۃ الدولیۃ" ICIO رکھا تھا، اس ادارہ نے ایک سہ لسانی پندرہ روزہ بھی نکالنا شروع کیا تھا جو صحیح الفکر مسلم نوجوانوں میں جذبہ یک جہتی پیدا کرنے میں اچھا ذریعہ بنا تھا۔ یہ ادارہ متعدد دشواریوں کی بنا پر زیادہ ترقی نہ کر سکا۔ اور حالات کے تقاضے

نے اس کے کام میں افسردگی پیدا کر دی۔

محمد میاں اخلاق و محبت میں اپنے تمام ہم عمروں میں ممتاز اور نمایاں تھے، کسی شخص سے ان کی کشمکش یا لڑائی نہ تھی، وہ اس طرح کے کسی امکان سے بہت دور تھے، اگر کسی وقت ایسی کوئی صورت پیدا ہونے لگتی تو اس سے بہت خوبی کے ساتھ بچنے کی تدبیر اختیار کر لیتے خواہ اس سلسلہ میں ان کو اپنے جائز فائدوں سے دست بردار ہونا پڑتا، بعض وقت ان کو اپنے جائز احساسات و جذبات کا خون کرنا پڑتا، یہ ان کی افتاد طبع تھی دراصل وہ اس کے قائل تھے کہ

آسائش دو گیتی تفسیر ایں دو حرف است
با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا

غریبوں، حاجتمندوں کی مدد وہ اخفاء کے ساتھ کرتے رہتے حتی کہ متعدد ضرورتمندوں کی ان سے غیر محسوس طریقہ پر وابستگی ہو گئی تھی، اعزاء کے ساتھ ان کا معاملہ اسلام کے صلہ رحمی کی تعلیمات کے مطابق تھا اور یہ بات انھوں نے اپنے والد اور دادا سے ورثہ میں پائی تھی اور خود ان کے عم معظم کا طرز عمل ان کے لیے نمونہ تھا، اپنے چھوٹوں کے ساتھ ایسا خاطر و شفقت کا تعلق رکھتے، جس میں بے تکلفی اور خوش طبعی کا رنگ چھایا رہتا، اور اپنے بڑوں کے ساتھ خواہ وہ ان سے دو چار سال ہی بڑے ہوں، محبت و احترام کا رویہ رکھتے تھے، یہ احترام خشک احترام نہ ہوتا، بلکہ اس میں انس و انبساط کی آمیزش ہوتی، چنانچہ خاندان کے چھوٹے و بڑے سب ان سے خصوصی انس و محبت و لحاظ کا معاملہ رکھتے تھے۔

محمد میاں نے بزرگوں کے واقعات اور دل میں دینی گداز پیدا کرنے والی کتابوں کا مطالعہ کچھ عرصے بڑھا دیا تھا۔ اس مطالعے سے نیز اہل دل کے پاس وقتاً فوقتاً جانے سے ان کی زندگی میں تقویٰ، مالی معاملات میں احتیاط اور لوگوں کے ساتھ غیر ضروری اختلاط سے پرہیز بڑھ گیا تھا، سخاوت کا مزاج شروع ہی سے تھا، اس نئے رنگ کے بعد مال کی بے وقعتی اور دوسرے کی مدد کا رجحان زیادہ ہو گیا تھا۔

چند سال قبل سے ہی ان پر دنیا سے بے رغبتی کا اثر غالب ہونا شروع ہو گیا تھا، اس سلسلہ میں کئی سال پہلے انھوں نے لکھنؤ قیام کی ذمہ داریوں سے سبکدوشی اختیار کر کے اپنے بزرگوں کے وطن مالوف تکیہ کلاں، رائے بریلی جا کر یکسوئی کا قیام اختیار کر لینے کا فیصلہ کر لیا تھا، لیکن جب ان کے عم معظم خال معظم مولانا ابوالحسن علی ندوی صاحب نے ان کی لکھنؤ ہی میں رہ کر اپنی دعوتی و تحریری کوششوں کو قائم رکھنے کی تاکید

کی تو انھوں نے اطاعت کے جذبہ سے اپنا فیصلہ بدلا۔

محمد میاں میرے حقیقی ماموں زاد بھائی تھے، وہ مجھ سے عمر میں کچھ چھوٹے تھے لیکن کم عمری سے ان کا میرا ساتھ رہا تھا جس کی وجہ سے نیز ان کے انبساط و محبت کے طرز کی وجہ سے میرا ان سے صرف برادرانہ ہی نہیں، بلکہ ایک طرح سے دوستانہ تعلق بھی پیدا ہو گیا تھا، پھر دینی فکر و نظر اور علمی و ادبی ذوق میں توافق کی وجہ سے مزید ربط و بے تکلفی دانس قائم ہو گیا تھا۔ چنانچہ ایک نہایت مختصر بیماری کے بعد جب انتقال ہوا تو سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ واقعہ پر کیسے یقین کیا جائے، اور کیسے اس تصور کو حقیقت مانا جائے کہ محمد میاں اب ہمارے درمیان نہیں رہے اب کیسے ہمارے فکر و ذوق کی دلکش محفلیں آباد رہیں گی۔ اب کیسے ہماری عربی تحریر و ادب کی دلچسپیاں قائم رہیں گی، اب کیسے ذوق و شوق کی تازگی باقی رہے گی، محمد میاں اپنے ہم ذوق رفقار کے لیے شمع انجمن تھے، یہ شمع اب خاموش ہے۔ ۱۲ جون کی صبح سے ان کو پیٹ میں معمولی درد کا احساس ہوا، اس کے لیے انھوں نے دوا استعمال کی، لیکن اس درد میں کوئی کمی نہیں ہوئی، ان کے خالہ زاد بھائی مولانا سید ابو بکر حسنی موجود تھے، انھوں نے مختلف معالجین سے رجوع کیا جن میں ایک ایلوپیتھک ڈاکٹر نیز حکیم عبدالقوی صاحب دریابادی اور ڈاکٹر اشتیاق حسین صاحب قریشی تھے، ڈاکٹر اشتیاق حسین صاحب جب سہ پہر کے وقت آئے تو ان کے اتفاق و تائید سے اسپتال لے جانا طے ہوا، تاکہ بتدریج کم ہوتی ہوئی طاقت کو سنبھالنے کی کوشش کی جا سکے، اسپتال میں کوششیں کی گئیں لیکن تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد شب جمعرات ۱۳ جون سوا نو بجے دل کی حالت بگڑ جانے پر وہ اس دار فانی سے دار بقار کو رحلت کر گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

محمد میاں نے اردو عربی میں مضامین اور کتابوں کی شکل میں علمی یادگار چھوڑی ہے، اسی کے ساتھ ان کی سعادت مند اولاد ان کی بڑی یادگار ہے۔ ان کے تین بیٹوں میں سے بڑے بیٹے سید عبداللہ الحسنی تعلیم سے فراغت حاصل کر چکے ہیں، ان کے علمی و ادبی ذوق میں ان کے والد کے اثرات ہیں اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان کی اولاد کو ان کا نعم البدل بنائے اور دینی جد و جہد کے میدان میں ان کی وفات سے جو خلا پیدا ہوا، اس کو دور فرمائے (آمین)

وما ذٰلك على الله بعزيز

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے نام تعزیتی مکتوب

مولانا عبدالماجد ندوی
اُردو سکشن، سعودی ریڈیو، جدہ

"حادثۂ فاجعہ" کی اطلاع آج دس بجے صبح کو برادر عزیز مولوی سلمان عابد شمسی نے مدینہ منورہ سے فون پر دی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون، دل دھک سے ہو گیا۔ "خبر" پر کسی طرح یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا، میں نے سوالات کے بوچھار کر دیئے، کب ہوا، کیسے ہوا، کیوں کر ہوا۔ ذریعۂ اطلاع کیا ہے؟ وہ جواب دیئے گئے۔ دو روز پہلے ہارٹ فیل ہو گیا، حضرت شیخ کے پاس ٹیلکس آیا ہے، میں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ پھر کریدا کیا۔ چاہتا تھا کہ ذریعہ اطلاع میں کوئی شبہ کی گنجائش نکل آئے اور اس طرح پھر اپنے دل کو بہلا دوں۔ مگر جب انھوں نے مکرر یقین دہانی کی تو ٹیلیفون کا ریسیور رکھ کر اپنی جگہ آ کر بیٹھ گیا۔ بالکل ساکن و ساکت۔ جیسے تیسے دفتر کا ضروری کام کیا اور وقت سے پہلے ہی گھر آ گیا کہ آپ کو تار بھجوا دوں اور جب بچوں نے آ کر اطلاع دی کہ تار ہو گیا تو قدرے سکون ہوا، لیکن طبیعت کی بے چینی اور رنج و غم بدستور باقی رہے کسی کروٹ چین نہ مل سکا اور عصر سے اس وقت دس بجے رات تک یہی سوچتا رہا کہ آپ کو تعزیت کا خط لکھوں، مگر سمجھ میں نہیں آیا کہ لکھوں بھی تو کیا لکھوں؟ تعزیت کا تار تو دے ہی چکا ہوں، اس میں بطور خاص یہ کلمہ بھی لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو صبر جمیل کی توفیق بخشے۔ اب میری تحریر سے کیا آپ کے رنج و الم میں کچھ تخفیف ہو سکے گی؟ میں کیا ہوں اور میری حیثیت کیا؟ پھر بھی اس وقت دس بجے رات کو خط لکھنا شروع کر دیا ہے اور اب تک جو کچھ لکھا ہے وہ اپنے ہی دل کے واردات لکھے ہیں۔

استاذی وسیدی! معلوم نہیں حادثہ کے وقت آپ پر کیا گزری، اور اب جبکہ تین یا چار روز گزر چکے ہیں آپ پر کیا بیت رہی ہے، حادثہ بہت عظیم ہے اور آپ کی بہ نسبت عظیم سے عظیم تر۔ سوچتا ہوں کہ اس وقت آپ کی کیا کیفیت رہی ہوگی۔ بیس سال پہلے کے اس حادثہ کو یاد کرتا ہوں جب ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ کا انتقال ہوا تھا، آپ گھر پر نہیں تھے، جنازہ لکھنؤ سے تکیہ کلاں (رائے بریلی) لے جایا گیا۔ ۱۸ گھنٹے کے انتظار کے بعد گھر میں لوگوں کی رائے یہی ہوئی کہ اب مزید تاخیر نہیں کرنی چاہیئے۔ آپ اس کے چھ گھنٹے کے بعد تکیہ پہونچے۔ میں نے آتنا دیکھا کہ محمد میاں کو آپنے اپنے سینہ سے لگا لیا اور وہ آپ کے گلے میں چمٹ گئے آپ کے منہ سے رلائی کی ایک آواز نکلی اور پھر سسکنے لگے۔ یہ حالت بھی دو تین منٹ سے زیادہ نہیں رہی۔ پھر دیکھا کہ آپ سراپا صبر و شکر بنے ہوئے ہیں، جی بھر کر رو لیتے تو شاید کچھ طبیعت ہلکی ہو جاتی، یہ اپنے اوپر قیاس کر کے کہہ رہا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ آپ کے لئے سب کچھ تھے عمر کی تفاوت کی وجہ سے آپ انھیں بڑا بھائی نہیں بلکہ باپ سمجھتے تھے اور وہ بھی آپ کے ساتھ کچھ اسی نوعیت کی شفقت فرماتے تھے۔ اس وقت آپ نے اس غم کو سہار لیا۔ اس واقعہ پر قیاس کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے اس بات کی توقع کرتا ہوں کہ اس وقت بھی اُس نے آپ کے دل کو بے قابو ہونے نہیں دیا ہوگا، وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اگرچہ دونوں واقعات میں بہت بڑا فرق ہے، اس وقت ایک باپ کے مانند سن رسیدہ بڑے بھائی کا غم تھا اور اس وقت ایک صلبی بیٹے کے مانند جواں سال بھتیجے کے فراق کا غم ہے۔ اس وقت آپنے اپنے آنسوؤں کو ضبط کرنا چاہا ہوگا تو دل خون خون ہو گیا ہوگا اور جگر زخموں سے چور۔ مجھے اس وقت جگر مرادآبادی مرحوم کا ایک شعر یاد آرہا ہے اور وہ یہ ہے اور آپ کے بالکل حسب حال ہے ؎

نہ جانے آہ کہ اُن آنسوؤں پہ کیا گزری
جو دل سے آنکھ تک آئے مژہ تک آ نہ سکے

استاذ محترم! اللہ تعالیٰ نے آپ کو کوئی اپنی صلبی اولاد نہیں دی کہ وہ اپنی حکمت و مصلحت کو خود ہی بہتر جانتا ہے، مگر آپ کے یہ ہونہار بھتیجے جو آہ کہ اب مرحوم ہو چکے۔ اس کمی کو بدرجہ اتم پوری کرتے تھے۔ خاص کر ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ کی وفات کے بعد تو کلیتہً اسی حیثیت میں آگئے تھے۔ نہ ان کا کوئی اب دوسرا باپ رہا تھا اور نہ آپ کا کوئی دوسرا بیٹا۔ اب آپ ہی ان کے باپ تھے اور وہ

ہی آپ کے بیٹے۔ آپ اُن سے اور وہ آپ سے "انا منه وهو مني" کے بمصداق۔ آپ کو اس جواں سال جواں مرگ بھتیجے کی جدائی کا جتنا بھی غم ہو کم ہے۔ اس حادثہ نے آپ کی کمر توڑ کر رکھ دی ہوگی، ان کی وجہ سے اپنی کبر سنی میں جو رعنائی آپ محسوس کرتے تھے وہ اب اس بقیہ زندگی میں شاید ہی محسوس ہو۔ معلوم نہیں آپ کی نمناک آنکھیں کب خشک ہوں گی اور ہوں گی کہ نہیں۔ کون جانے۔ بس اللہ ہی آپ کے دل کی تشفی کر سکتا ہے، وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

آپ کے ساتھ گھر کے سبھی افراد سوگوار ہوں گے۔ مجبی مولانا محمد رابع صاحب اور برادر عزیز مولوی واضح صاحب کے ایک ایک بازو کٹ گئے اور جہاں تک ان کی بہنوں کا تعلق ہے تو پانچوں بہنوں میں وہ تنہا اور منفرد ایک بھائی تھے، اور سب سے چھوٹے۔ سب بہنیں اپنی اپنی جگہ پر حضرت خنساءؓ بنی ہوئی ہوں گی، اور عجب نہیں کہ اُن سب کو حضرت خنساءؓ کے یہ دلدوز اشعار یاد ہوں اور دل ہی دل میں پڑھتی ہوں ؎

أعينيَّ جودا ولا تجمدا — الا تبكيان لصخرِ النَّدى
ألا تبكيان الجريءَ الجميلَ — الا تبكيان الفتى السيدا
طويل النجادِ رفيع العماد — ساد عشيرته أمردا
إذا القوم مَرّوا بأيديهم — الى المجد مد اليه يدا
فنال الذى فوقَ أيديهم — من المجد ثم مضى مَصعدا
ويحمل للقوم ما عالهم — وان كانَ اصغرَهم مولدا

اللہ تعالیٰ آپ کے یہ دونوں خواہرزادوں (مجبی مولانا محمد رابع اور برادر عزیز مولوی واضح رشید) کو سلامت رکھے۔ ان دونوں میں آپ تسلی کے بہت سے اسباب پائیں گے، کہ یہ دونوں بھی اپنی اپنی جگہ بہرحال ایک حیثیت رکھتے ہیں اور آپ سے اتنے قریب ہیں جتنا کہ مرحوم قریب تھے۔ برادرزادہ اور خواہرزادہ میں چنداں فرق تو نہیں بلکہ بسا اوقات بوجوہ خواہرزادہ زیادہ عزیز ہوتا ہے۔ مگر اس باوجود مختلف اسباب کی بنا پر ان میں سے کوئی ان کا بدل نہیں ہو سکتا، بقول حالی ؎

ہم جس پہ مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور
عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں؟

یہ تو تھی مرحوم کی آپ سے نسبی و قرابت کی بات اور حیثیت۔ دوسری حیثیتوں سے آپ کے لئے وہ کیا کچھ تھے اسے زیادہ بہتر آپ ہی سمجھتے ہوں گے، کسے معلوم کہ وہ کیا تھے اور عمر طبعی کو پہونچتے پہونچتے کیا سے کیا بنتے۔ بس ہم تو اتنا جانتے ہیں کہ خوش درخشید ولیکن شعلۂ مستعجل بود۔

"البعث الاسلامی" جب انھوں نے نکالا تو شروع شروع میں بلاشک آپ ان کی عربی کی اصلاح فرماتے تھے مگر جلد ہی وہ خود کفیل ہوگئے، اور اس حد تک کہ آپ مکمل طور پر ان پر اعتماد کرنے لگے۔ اس وقت ان کی عمر ہی کیا تھی؟ مگر ؎

بالائے سرش ز ہوش مندی می تافت ستارۂ بلندی

جلد ہی ان کے فکر و فن (تحریر) میں پختگی پیدا ہوگئی، اور پھر تو وہ اپنی تحریر میں ایسی سحر آفرینی دکھانے لگے کہ بہتوں کو کوسوں اپنے پیچھے چھوڑ آئے۔ اس وقت میرے سرہانے ان کی کتاب "الاسلام الممتحن" رکھی ہے، جو ان کی حمیت اسلامی، غیرت ایمانی اور عربی انشاء پردازی کی زندہ دلیل ہے۔ "آفتاب آمد دلیل آفتاب" آپ نے "تقدیم" کے نام سے جو اس پر مقدمہ لکھ دیا ہے، وہ "ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا" کے مکمل مصداق ہے۔ انھوں نے کس "دارالعلوم" میں تعلیم حاصل کی؟ کس "خانقاہ" میں "تزکیہ" کے لئے گئے۔ کس معلم سے "وجوہ اعراب" سیکھے، کہاں سے اسلامی حمیت اور ایمانی غیرت کے جذبات ان کو حاصل ہوئے۔ نیکی و شرافت کی بات ان کے اندر کہاں سے پیدا ہوئی ــــ؟ آداب مجلس اور فرق مراتب کے اصول کہاں سے سیکھے؟ یہ سارے کمالات ان کے اندر کیوں کر اور کس طرح پیدا ہوئے۔ یہ سب باتیں آپ نے جستہ جستہ اپنی "تقدیم" میں لکھ دی ہیں۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ ان سب باتوں کے ساتھ ان کی اپنی خداداد صلاحیت تھی جس نے انکو اس بلند مقام پر پہنچایا۔

یہ تقدیر الٰہی تھی کہ ان کی وفات سے ڈیڑھ دو سال پہلے ہی آپنے ان کی سیرت و کردار، تعلیم و تربیت اور جوش عمل کے بارے میں چند صفحات لکھ دیئے۔ اب اگر کچھ لکھنا چاہیں تو شاید نہیں لکھ پائیں گے بھلے ہی کوئی اس کا ترجمہ کردے تو کردے۔ آپنے ان کی جن خوبیوں کا ذکر کیا ہے، وہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے بخشی ہوئی تھیں۔ ان خوبیوں کے علاوہ ان کے اندر دوسری خوبیاں بھی تھیں جن کو آپ اتنی تفصیل سے نہیں جانتے اور نہ جان سکتے تھے، جتنی تفصیل سے ان کے ہمسر

اور ہم عصر دوست و احباب جانتے ہیں۔ ہم عصروں اور برابری والوں کے ساتھ نہ بغض و حسد، نہ کینہ و عداوت، نہ رشک و منافست، نہ برتری کا احساس اور احساس کہتری کا شکار، وہ اپنے دوستوں میں ایک اعجوبہ روزگار تھے، نہ کسی کی غیبت، نہ کسی کی چغلی، نہ افترا پردازی، نہ دشنام طرازی، سب کے ساتھ اخلاص و محبت سے پیش آنے والے، بڑوں کی توقیر اور چھوٹوں سے شفقت کرنے والے، نہ بحث و تکرار کے عادی تھے، نہ جنگ و جدال کے خوگر، وہ تو سب سے میٹھی باتیں کرتے تھے، ایک پیکر اخلاق اور مجسمہ اخلاص تھے۔ ان کی کن کن خوبیوں کو یاد کرکے روؤں۔ "دامان نگہ تنگ گل حسن تو بسیار" اسوقت مجھے ایک واقعہ "بڑوں کی توقیر" کی مناسبت سے یاد آگیا ہے، اس کا ذکر کرتا ہوں۔ یاد نہیں، کسی مضمون کا عربی ترجمہ میں نے کیا اور وہ ان کے رسالہ "البعث الاسلامی" میں چھپا۔ پرچہ مجھے ملا تو دیکھا کہ "لن یرضی" کی اصلاح کرکے "لن یرض" بنا دیا گیا ہے۔ میں نے مجبی مولانا محمد رابع صاحب سے دوستانہ انداز میں کہا کہ دیکھئے محمد میاں اپنی عربی تحریر اور انشاء پردازی میں اوج کمال پر پہنچے ہوئے ہیں، مگر چونکہ انھوں نے باضابطہ تعلیم حاصل نہیں کی ہے اور نہ صرف و نحو پڑھی ہے۔ اس لئے ایک صحیح کلمہ کو اصلاح دے کر غلط بنا دیا۔ اس پر مجبی مولانا محمد رابع نے ان کو ایک طرح سے ڈانٹا اور کہا کہ خبردار جو آئندہ سے مولوی عبدالماجد صاحب کے کسی مضمون یا ترجمہ میں تم نے قلم لگایا۔ بعد کو معلوم ہوا کہ یہ "کام" اُن کا نہ تھا خواہ مخواہ مولانا محمد رابع صاحب کا عتاب اُن پر نازل ہوا جس کا مجھے افسوس بھی ہوا، مگر واہ ری ان کی عالی ظرفی، انھوں نے مجھ سے یہ شکایت بھی نہیں کی کہ آپنے بلا تحقیق مجھے مجرم گردان دیا۔ ایک دوسری مثال ان کی "بحث و تکرار سے پرہیز" کی ہے، اس کا ذکر بھی نامناسب نہ ہوگا۔ ۱۹۶۷ء کی جنگ سے کوئی چھ ماہ پہلے مولانا یوسف بنوری مرحوم قاہرہ تشریف لے گئے تھے، واپسی پر انھوں نے اپنے رسالہ "البینات" میں مصر کے حالات پر کچھ بے اطمینانی کا اظہار فرمایا۔ اس کے چھ ماہ بعد اکتوبر ۱۹۶۷ء کی جنگ پیش آئی اور اسرائیل نے اچانک حملہ کرکے مصری فضائیہ کو بالکل تہس نہس کر دیا۔ جہاں عبدالناصر کی ساری ڈینگیں پانی کے بلبلے اور نقش بر آب ثابت ہوئیں۔ مرحوم مجھ سے کہنے لگے کہ "یہ ہے فراست مومن" مولانا بنوری نے اسی اندیشہ کا اظہار کیا تھا" میں نے انھیں ٹوکا اور کہا کہ "یہ فراست مومن" نہیں ہے، چھ ماہ نہیں بلکہ سال بھر ڈیڑھ سال پہلے سے یہ خطرہ منڈلا رہا تھا اور لوگ بہ چشم سر دیکھ رہے تھے کہ ؎ نامت نوطیر مصر عن

ثعالبها" آپ کو یاد نہیں کہ دو ڈھائی سال پہلے جب مولانا یوسف بنوری قاہرہ کی یاترا کر کے آئے تھے تو اسی رسالہ البینات میں مصری حکومت اور مصری حکام خاص کر جمال عبدالناصر کی مدح سرائی کرتے نہیں تھکے تھے، اس وقت اگر یہ بات کہتے تو بے شک اسے مومنانہ فراست کہا جا سکتا تھا بیچارے مرحوم میری اس تقریر کو سن کر دنگ رہ گئے، میرے کسی ایک جملہ کا انھوں نے جواب نہیں دیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ میری اس تقریر سے ان کی رائے بدلی تھی یا نہیں، بظاہر مطمئن ہو گئے تھے یا پھر خاموشی ہی کو انھوں نے تقاضائے ادب سمجھا، وہ مجتبیٰ مولانا محمد رابع صاحب کے رشتہ سے مجھے بھی اپنا بڑا سمجھتے تھے یہ ان کی شرافت تھی، ایسا نیک طینت انسان کہاں ملے گا۔ "بڑوں" کا پاس ادب، بزرگوں کا احترام، والدین کی اطاعت و فرمانبرداری، ان کی اس طاعت گزاری اور نیک طینتی کو دیکھ کر اگر ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ ان سے کہتے ہوں کہ ؎

اذا کان اولاد الرجال حزازۃ
فانت الحلال الحلو والبارد العذب

تو کوئی تعجب نہیں۔ انھوں نے جو یہ "آداب فرزندی" سیکھے تو وہ کوئی مدرسہ و خانقاہ کی کرامت نہ تھی، بلکہ ان کے اپنے مشفق باپ کی تربیت اور اپنے شفیق "چچا میاں" کی نظر عنایت تھی، کہ وہ کندن بن کر نکلے۔ رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً۔ وہ صحیح معنیٰ میں برٌّ بالوالدیہ اور غرس طاب غارسہ فطابا کے مصداق تھے۔

سنا ہے اور آپ اس کو زیادہ بہتر جانتے ہوں گے کہ ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ اپنی اولاد کی تربیت میں خاص اہتمام فرماتے تھے، وہ اپنے گھر میں ناول وغیرہ کی کتابیں آنے نہیں دیتے تھے، فرماتے تھے کہ کسی مخرب اخلاق ناول کی کتاب کا گھر میں آنا ایک بیسوا کے آنے سے زیادہ برا ہے۔

غالباً ۵۰ء کی بات ہے جب میں درجہ تکمیل ادب سے فارغ ہوا تو رمضان کی چھٹیوں میں مولانا ابواللیث کی خواہش پر رام پور چلا گیا، وہاں ڈاکٹر نجات اللہ صاحب صدیقی۔ ڈاکٹر عبدالحق صاحب ڈاکٹر اشفاق وغیرہ علی گڑھ سے آ کر دھرنا دیے بیٹھے تھے کہ لیجئے اب ہمیں پڑھایئے، میں نے وہاں سے مجبی مولانا محمد رابع صاحب کو ایک کارڈ لکھا تو آخر میں باب النسیب کا ایک شعر لکھ دیا، شعر یہ تھا۔

صحائف عندی للعتاب طویتها ستنشر یوما والعتاب طویل

بھلا اس میں کون سی بات تھی، مگر ڈاکٹر صاحبؒ اس معاملہ میں "مجھ" سے بھی بہت زیادہ حساس تھے۔ کارڈ ضبط فرما لیا، یہی ان کی تربیت تھی جس کی وجہ سے محمد میاں چاند بن کر طلوع ہوئے مگر افسوس کہ مہ کامل بننے سے پہلے ہی غروب ہو گئے۔ خوش درخشید و لے شعلۂ مستعجل بود۔

طالب علمی کے زمانے میں تو میں ڈاکٹر صاحبؒ کے قریب بھی نہ پھٹکا، کبھی دوا اور علاج کے لیے بھی ان کے پاس جانے کی نوبت نہیں آئی، جو کچھ تعلق تھا آپ سے تھا، آپ کو پکڑ پکڑ ہوسٹل میں چائے کے بہانے لے آتا تھا۔ مگر ۵۵ء میں اپنی تقرری کے بعد مجبی مولانا محمد رابع صاحب کے رشتہ سے کبھی کبھی آنے جانے لگا۔ ۵۶ء میں ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ نے مجھے بکارندہ کلکتہ بھیجا۔ وہاں سے کامیاب واپس آنے کے بعد مزید کچھ قریب ہوا۔ پھر اہلیہ محترمہ کے انتقال کے بعد اور زیادہ قریب ہو گیا، وہ مجھ سے بڑی شفقت و محبت فرماتے، پہلے میں ان سے رعب کھاتا تھا، لیکن جب قریب ہوا تو انھیں لین العریکہ اور دمث الخلق پایا۔ مجھے ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ میں ایک خاص بات نظر آتی تھی اور وہ یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات طیبہ میں جو یہ آتا ہے کہ "مَن رَاٰہُ بَدِیہَۃً (اوبداھۃً) ھَابَہٗ وَمَن خَالَطَہٗ مَعرِفَۃً اَحَبَّہٗ" مجھے اس کی کچھ پرتو ان میں نظر آتی تھی "کچھ" اس لئے کہہ رہا ہوں کہ یہ ادب کا مقام ہے۔ میں نے ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ کی وفات پر ایک مضمون لکھنا چاہا تھا مگر بعض لوگوں کی مبینہ رخنہ اندازی کے باعث نہیں لکھ سکا۔ ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ کے مجھ پر بہت سے احسانات ہیں۔ ایک مرتبہ ان کی طرف سے عمرہ کیا تھا، اس کے سوا اب تک کچھ نہیں کر سکا۔ آپ کو شاید یاد ہو کہ ایک مرتبہ میں سخت بیمار پڑا تھا، ملیریا ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر دھون نے کونین کی ٹکیاں دیدیں اس سے میری طبیعت اور خراب ہو گئی، آپ ڈاکٹر صاحب کو مجھے دیکھنے کے لئے ندوہ لے آئے تھے پھر انھیں کے علاج سے میں الحمدللہ شفایاب ہوا، اس سے پہلے میں جب بورڈنگ کا نگراں تھا تو ایک طالب علم سخت بیمار پڑا، اس کے پاس علاج کے لئے پیسے بھی نہ تھے مگر میں جب ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ کے پاس گوئن روڈ گیا تو وہ اسے دیکھنے کے لئے تشریف بھی لے آئے، دوائیں تو وہ ندوہ کے طلبہ کو اپنے پاس سے دیتے ہی تھے، دوائیں دیں اور دارالعلوم سے اس کے لئے کچھ روپیوں کی منظوری بھی دے دی۔ اللہ تعالیٰ باپ بیٹے دونوں پر اپنی رحمت کی بارش کرے اور اپنی خاص نعمتوں سے نوازے۔

استاذ محترم! محمد میاں کی جدائی آپ کے لئے بہت ہی شاق ہوگی، پھر ایک ایسے ہونہار

فرزند کی۔ معلوم نہیں آپ کے سینے میں غم کے کتنے طوفان امنڈ رہے ہوں گے، شاید کچھ ایسی ہی نوعیت اس بے چاری عورت کی رہی ہوگی جس نے اپنے ہونہار بیٹے کے مرنے پر اپنے مرثیہ میں یہاں تک کہہ ڈالا کہ ؎

من شاء بعدك فليمت وعليك كنتُ احاذرُ

آپ ایسی بات تو ہرگز نہیں کہیں گے مگر آپ کے دل کی کیفیات کچھ اسی قسم کی ہوں گی، اللہ تعالیٰ آپ کو صبر و سکون بخشے، اور زیادہ نڈھال نہ ہونے دے۔ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ وما ذلك على الله بعزيز۔

استاذی الجلیل! میں نے یہ تعزیتی خط تار دینے کے بعد رات کو لکھنا شروع کیا تھا مگر زیادہ لکھ نہ سکا، دوسرے روز ۱۷ جون کو تو قلم بھی نہیں پکڑا، بار بار طبیعت بھر آتی رہی، کل ۱۸ جون کو لکھا، اور آج ۱۹ جون کو اسے اتنے ہی پر ختم کر رہا ہوں۔ ان کی نیکی، شرافت، صلاح و تقویٰ، اور علم و استعداد پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے ؎ "سفینہ چاہئے اس بحر بیکراں کے لئے" مگر تعزیتی خط لکھ رہا ہوں، ان پر کوئی مضمون نہیں لکھ رہا ہوں، پھر بھی یہ اتنا طویل ہو گیا، حدیث لذیذ بود دراز تر گفتم۔

آہ! محمد میاں! (یہ سطریں لکھتے ہوئے آنکھیں پھر اشک آلود ہو گئیں) الوداع اور رخصت الی رحمۃ اللہ وفسیح جناتہ۔ آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے، اللہ کی ذات سے امید ہے کہ آخرت میں تم اپنے والدین اور چچا میاں کے لئے "فرط" ثابت ہوگے اور جنت الفردوس میں ان سب کا استقبال کروگے۔

رحمہ اللہ اعظما دفنوھا بسجستان طلحۃ الطلحات

تم بلاشبہ "طلحۃ الطلحات" تھے۔ اب ہم تمہیں اسی نام سے یاد کریں گے۔

حزین القلب

ناچیز

عبدالماجد ندوی

محمد میاں مرحوم

حکیم عبدالقوی دریابادی

مولوی محمد الحسنی معروف بہ محمد میاں مدیر عربی ماہنامہ البعث الاسلامی (ندوۃ العلماء لکھنؤ) چند گھنٹوں کی مختصر لیکن شدید علالت کے بعد ۱۳ جون، چہار شنبہ کا دن گزر کر شب کے ابتدائی گھنٹوں میں یکایک سفر آخرت پر روانہ ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ عمر صرف ۴۴ سال کی تھی۔ یہ مولانا حکیم سید ڈاکٹر عبدالعلی حسنی سابق ناظم دارالعلوم ندوۃ العلماء کے فرزند دل بند اور مبلغ اسلام سید ابوالحسن علی ندوی کے بھتیجے تھے۔ انتہائی سعید و صالح ملت کے ہونہار ترین اہل قلم میں ان کا بجا طور سے شمار ہوتا تھا۔ عربی اور اردو دونوں زبانوں پر قادر، عربی کی مشق کچھ اور بڑھی ہوئی اہل نظر کی نظر میں ان کی عربی تحریر اثر و گداز اور گہری اسلامیت کے لحاظ سے قطب شہید مصری مرحوم کی ٹکر کی ہوتی تھی۔ خود مولانا علی میاں مدظلہ، کے بیان کے مطابق ان کی بعض عربی تحریریں خود ان کی تحریروں سے بھی بڑھ کر ہونے لگی ہیں۔

عربی، اردو و انگریزی کی ساری تعلیم کسی مدرسہ یا اسکول، کالج یا دارالعلوم میں نہیں، متعدد ماہر فن اساتذہ سے نہیں صرف ایک شخص اپنے فاضل والد ماجد ڈاکٹر عبدالعلی صاحب سے انتہائی خاموشی کے ساتھ حاصل کی۔ ان کے گھر والوں حتیٰ کہ خود مولانا علی میاں کو بھی شروع شروع میں ان کی علمی صلاحیتوں و تحریری قابلیتوں کا اتنا اندازہ نہ تھا۔ صرف ایک استاد جو اپنی کم سخنی کے لئے شہرت رکھتا تھا کہ تعلیم و تربیت کا فیض حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے ذاتی مطالعہ سے ایسی استعداد نوعمری میں حاصل کر لی جو پختہ عمروں کو بھی شائد و باید نصیب ہوتی ہے۔

آسٹرین نومسلم محمد اسد (سابق نام لیوپولڈ ویس) کے سفرنامہ عرب روڈ ٹو مکہ کا سلیس اردو ترجمہ "طوفان سے ساحل تک" کے جاذب نظر عنوان سے سلیس و شگفتہ زبان میں کیا، بانی دارالعلوم ندوۃ العلماء مولانا محمد علی مونگیری کی سوانح، خوب مفصل و مستند لکھ کر مصنف و سوانح نگار کی حیثیت سے شہرت حاصل کی۔ آخر میں جشن ندوۃ العلماء کی تفصیلی روداد کے سمندر کو "روداد چمن" کے کوزہ میں بند کیا۔ ان کی اس

تصنیف پر مرحوم مدیر "صدق جدید"، مولانا عبدالماجد دریابادی اپنی علالت کے آخری زمانہ میں تبصرہ کرتے ہوئے مرتب کو جو داد دھتی وہ ان کے سے تنقید نگار قلم سے بہت کم نوعمر اہل قلم کو ملی ہوگی یہ آخری مکمل تبصرہ تھا جو مولانا مرحوم کے قلم سے "صدق جدید" (اشاعت ۲۲ اکتوبر ۱۹۷۶ء) میں نکلا تھا جس میں کتاب کو بہت ہی جید و بلیغ اور بہت ہی موثر قرار دینے کے بعد آخری فقرہ یہ بھی لکھا تھا:۔

"لکھنے والے کے قلم کا اعجاز یہ ہے کہ کتاب لٹریچر تو خیر ہی ہے باقی کتاب کے جو اجزاء پروپیگنڈے کے ہیں ان پر بھی گمان لٹریچر کا ہوتا ہے"

اردو میں ان کی تحریریں ہفتہ وار ندائے ملت اور پندرہ روزہ "تعمیر حیات" میں کثرت سے نکلتی رہی تھیں۔ آخری اردو مضمون ندائے ملت میں سد سکندری کی نہیں سدا ایمانی کی ضرورت ہے کے بلیغ اور موثر عنوان کے ساتھ عین وفات کے دن طبع ہو رہا تھا اور اس سے دو ہی ایک ہفتہ قبل ماہنامہ البعث الاسلامی میں ان کا اس سے بھی زیادہ موثر مضمون یا مصرا شکری ولا تکفری کے عنوان سے نکلا تھا۔

یہ اپنے والد ڈاکٹر عبدالعلی مرحوم کی آخری اولاد تھے۔ پانچ صاحبزادیوں کے بعد ۱۹۳۵ء میں پیدا ہوئے۔ تعلیم جیسا کہ اوپر لکھا کہ گھر ہی میں اپنے والد سے انتہائی خاموشی اور مستعدی سے حاصل کی، جس کی تفصیل سے لوگ عام طور سے ناواقف ہی رہے۔ سن رشد پر پہونچنے کے کچھ ہی عرصہ بعد جہاں ان کی دینداری نظروں کے سامنے آتی گئی وہیں ان کی قابلیت کے چھپے جوہر بھی کھلتے اور شہرت حاصل کرتے گئے۔ زندگی ہمیشہ انتہائی سادہ گزاری۔ نام و نمود کی کبھی پروانہ کی۔ ۱۹۶۱ء میں ان کے والد کا انتقال ہوا تو پہلے یہی خیال تھا کہ وہ ان کے مطب میں بیٹھ کر ہومیوپیتھک کی پریکٹس کریں گے اس فن میں بھی انہوں نے خاصی دستگاہ حاصل کر لی تھی لیکن جلد ہی نظر آگیا کہ اس پیشہ سے انھیں کوئی دلچسپی نہیں وہ اس سے کہیں بڑے کاموں کے لئے بنائے گئے ہیں۔ ان کی دلچسپی کی چیز تصنیف و تالیف ہے۔ چنانچہ وہ اسی کے ہو کر رہے اور جلد ہی ان کا شمار اردو کے ساتھ بہترین عربی لکھنے والوں میں ہونے لگا۔ بلکہ اہل الرائے حضرات کے نزدیک ان کی عربی ان کی اردو سے بہتر اور پُر اثر ہونے لگی تھی۔ مولانا علی میاں کی متعدد اردو کتب ارکان اربعہ وغیرہ اور مقالات کے عربی ترجمے ایسے کیے کہ ان کی اور علی میاں کی تحریر میں سرمو فرق نہیں رہ گیا تھا۔ ان کے انتقال کے بعد خود علی میاں سے اس کا علم ہوا کہ ان کی بعض اہم کتابوں کے تکملے اور اضافے ان کے اسی نوجوان عزیز نے

ان کی فرمائش و ہدایت پر کہنا چاہیئے کہ برجستہ لکھے تھے اور ایسے لکھے تھے کہ ان پر مولانا مدظلہ کو قلم اصلاح پھیرنے کی ضرورت ذرا بھی محسوس نہیں ہوئی۔

خود ان کی عربی تصنیفات میں الاسلام الممتحن کو سب سے زیادہ شہرت ہندوستان سے بھی زیادہ عرب ممالک کے اسلام پسندوں میں حاصل ہوئی تھی۔ اس کتاب کے اب تک تین اڈیشن مصر وغیرہ سے شائع ہو چکے ہیں اور ماہنامہ البعث الاسلامی میں ان کے قلم سے نکلے ہوئے مضامین بھی اس کے حلقہ خیداراں میں بڑے ذوق و شوق سے ملک کے اندر اور باہر پڑھے جاتے تھے۔

یہ والد ہی کی طرح خلوت نشین اور کم سخن تھے لیکن جن ہم مذاق لوگوں سے ان کے روابط تھے۔ اُن سے وہ بڑی ہی دلچسپ گفتگو کرتے تھے مطالعہ بڑا وسیع تھا خصوصاً اسلامیات و سیاسیات حاضرہ کا۔ انگریزی کی استعداد بھی کثرت مطالعہ سے اچھی خاصی حاصل کر لی تھی۔ ان کی تحریریں خواہ مذہبی ہوں یا سیاسی ادب و انشاء کی خوبیوں کے ساتھ انتہائی پُر معلومات بھی ہوتی تھی۔

افسوس کہ وہ اس قدر جلد دنیا سے اٹھ گئے اور جو جگہ وہ خالی کر گئے اس کا پُر ہونا بہت دشوار نظر آتا ہے۔ !!

ایک دوست جس کو کبھی بھلایا نہیں جاسکتا!

(مولانا سعید الاعظمی الندوی)

ایک ایسے رفیق، دوست اور زندگی کی تمام سرگرمیوں میں پورے ۲۶ سال تک ہم آہنگ رہنے والے مخلص ساتھی کی اچانک جدائی کا غم کوئی ایسا معمولی واقعہ نہیں ہے جو آسانی سے بھلایا جاسکتا ہو، جس کی محبت و اخلاص کے نہ مٹنے والے نقوش ذرہ ذرہ میں پتہ پتہ اور بوٹہ بوٹہ پر ہر جگہ نمایاں ہوں، جسکی پاکیزہ سیرت، اعلیٰ ترین کردار، اور کوثر و تسنیم سے دھلی ہوئی، صاف و شفاف زندگی، آنکھوں میں بسی ہوئی اور دل میں جاگزیں ہو، جسکی حوصلہ مندی، عالی ہمتی، سچی دینداری، عالی ظرفی، فہم سلیم، غیر معمولی ذہانت اور وسیع النظری کی شہادت ہر شخص کی زبان پر ہو، اور جو وسعت فکر و نظر کے ساتھ اقلیم قلم پر بھی حکمرانی کرتا رہا ہو، اور اپنی مسیحا نفسی سے اس نے مشرق و مغرب کے ویران دلوں کو آباد کیا ہو اور مردہ جسموں میں روح ڈالی ہو، ایک ایسے جامع صفات شخص کے اچانک اٹھ جانے سے جو مستقبل کا مرد کامل اور تاریخ کا جوہر شب تاب تھا، اہل تعلق کے دلوں پر کیا کچھ نہ گذری ہوگی، اس کا صحیح اندازہ صرف وہی کرسکتا ہے جو جانے والے سے صحیح طور سے واقف ہو اور جس نے قریب سے ان کو اچھی طرح دیکھا اور برتا ہو،

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ۱۹۵۲ء میں دار العلوم ندوۃ العلماء کے شیخ الحدیث حضرت مولانا شاہ حلیم عطا صاحب کے درس حدیث میں ایک ایسے طالب علم بھی شریک ہوتے تھے جن کی صورت و سیرت فرشتوں جیسی تھی، نیکی اور بھولاپن ہر چیز سے نمایاں تھا اور عام طلبہ سے وہ بالکل الگ ایک حیثیت رکھتے تھے، دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ ناظم ندوۃ العلماء مولانا سید عبد العلی حسنی (رحمۃ اللہ علیہ) کے صاحبزادے اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ العالی کے بھتیجے جناب محمد میاں صاحب ہیں، میں دار العلوم میں برابر ان کو دیکھتا تھا اور کچھ دنوں کے بعد کچہری روڈ پر واقع اصلاح و تبلیغ کے مرکز میں جہاں ہر اتوار کو حضرت مولانا کا درس قرآن ہوا کرتا تھا وہاں وہ دکھائی دینے لگے، ہمارے بعض ساتھیوں نے ان سے راہ و رسم پیدا کرلی تھی اور حقیقت ہے کہ انھیں کی وساطت سے ہمارا ان کا تعارف بھی ہوا، اور کبھی کبھار ملاقاتیں بھی ہونے لگیں، اتوار

کے درس میں خاص طور سے ہم لوگ ایک دوسرے سے ملنے کی کوشش کرتے۔ اس کے کچھ ہی دنوں بعد انہوں نے ایک عربی مجلس قائم کی جس کا نام "المنتدی الادبی"[1] رکھا، ازراہ کرم انہوں نے مجھے بھی اس کا ممبر بنایا اور ہر جمعہ کو اس کے عربی جلسہ میں شرکت کے لئے ان کا خصوصی دعوت نامہ بھی آنے لگا۔

"المنتدی الادبی" ہی دراصل ہماری علمی اور ادبی سرگرمیوں کا نقطۂ آغاز ثابت ہوئی، اسی کے ذریعہ تعلقات میں وسعت اور گہرائی پیدا ہوئی، اور اسی کی وجہ سے عموماً عربی اخبارات و رسائل اور ادبی کتابوں کے مطالعہ کا شوق پیدا ہوا، اس کے ہفتہ وار جلسوں کے لئے مضامین لکھنے کے سلسلہ میں آپس میں تبادلۂ خیال بھی ہونے لگا، اور اسی بہانے ملاقاتوں کا سلسلہ بھی وسیع ہوا اور ہر ایک کو دوسرے سے مختلف مشوروں اور کاموں میں مدد ملنے لگی۔

المنتدی الادبی کے ہفتہ وار جلسوں میں شرکت کرنے اور ان کے لئے مضامین لکھ کر سنانے کا حوصلہ تمام ممبران میں بڑھنے لگا، جب بہت سے مضامین پڑھے جاچکے تو خیال ہوا کہ اگر یہ سارے مضامین کسی ایک مجموعہ میں جمع کرکے طبع کرادیے جائیں تو ایک یادگار اور دلچسپ کتاب بن جائے گی۔ اس خیال نے کسی اور کو متاثر کیا ہو یا نہ کیا ہو لیکن صدیق مرحوم کے دل میں تو یہ بات راسخ ہوگئی اور ہم دونوں نے اس سلسلہ میں مزید مشورہ کیا، اور طے یہی پایا کہ جس طرح بھی ہو یہ کام کرنا ہے۔ ابھی اس فکر کو عملی جامہ پہنانے کی تدبیریں سوچ ہی رہے تھے کہ ایک یہ خیال بھی سامنے آیا کہ کیوں نہ ایک عربی میگزین کے طرز کی چیز نکالنے کے امکان کا جائزہ لیا جائے، اکثر ممبران مجلس نے اس خیال کی تائید کرنے سے گریز کیا، ہمارے ایک ممبر دوست نے تو اسے شیخ چلی کے محل سے تعبیر کیا اور فرمایا کہ: خیال است و محال است و جنوں، تاہم اس خیال میں کوئی تزلزل نہیں پیدا ہوا، ادھر مولانا محمد میاں صاحب مرحوم نے اپنے والد ماجد ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے مشورہ کیا، انہوں نے پرزور تائید فرمائی اور ہر قسم کی مدد کا وعدہ بھی فرمایا، ادھر مربی معظم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی دامت برکاتہم نے اس خیال کی ترحیب فرمائی اور اس کا نام بھی "البعث الاسلامی" تجویز فرماکر گویا اس تجویز کو عملی جامہ پہنادیا۔

لیکن یہ بات بھی اپنی جگہ پر بالکل صحیح ہے کہ کسی ماہنامہ کے نکالنے کا کام اور اس کے ابتدائی انتظامات کو پایۂ تکمیل تک پہونچانا کوئی آسان کام نہیں، چنانچہ کئی مہینے اس کی تیاری اور سرکاری منظوری وغیرہ حاصل کرنے

---

[1] اس کے صدر مولانا سید محمد طاہر حسینی تھے جو اب مددگار ناظم ندوۃ العلماء ہیں۔

میں لگ گئے، پھر سب سے بڑا مرحلہ اس کی کتابت و طباعت کا تھا، مواد کی طرف سے ایک حد تک اطمینان تھا، لیکن سردست ہاتھ سے کتابت کر کے لیتھو پر چھپوانے کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں تھا، بہت غور و خوض کے بعد عربی کے ایک کہنہ مشق کاتب جناب قاری عبدالعلیم صاحب سے معاملہ طے پایا اور انہوں نے بخوشی اس ذمہ داری کو قبول بھی کر لیا۔ شروع میں صرف ۳۲ صفحے کی ضخامت کا پرچہ نکالنے پر سب کا اتفاق ہوا، اور اگست ۱۹۵۵ء میں پرچہ مرتب کر کے کاتب صاحب کے حوالہ بھی کر دیا گیا، کتابت عربی رسم الخط میں ٹائپ کے انداز پر ہوئی، طباعت کے لئے تنویر پریس، تجویز ہوا اور اسی کا نام پرچہ کے لئے ڈیکلریشن (DECLARATION) حاصل کرنے کی تفصیلات میں دیا گیا، رئیس التحریر کے لئے مولانا محمد میاں صاحب کے نام پر سب نے اتفاق کیا، ادارۃ التحریر میں راقم سطور اور جناب راشد صاحب ندوی (جو اب ڈاکٹر راشد ندوی صاحب ہیں) اور جناب اجتبا، صاحب ندوی حسینی کا نام طے ہوا، مگر عجیب اتفاق کہ ڈاکٹر راشد صاحب پرچہ شائع ہونے سے پہلے ہی دمشق یونیورسٹی کے کلیۃ الشریعۃ میں بغرض تعلیم دمشق چلے گئے اور ادارہ میں ان کا نام نہ آسکا، صرف میرا اور ڈاکٹر اجتبا، صاحب ندوی کا نام باقی رہا، لیکن کچھ ہی مدت کے بعد ڈاکٹر اجتبار صاحب بھی دمشق چلے گئے، اور تنہا میرا ہی نام نائب رئیس التحریر کی حیثیت سے باقی رہا اور بعد میں مدیر التحریر کی حیثیت سے آنے لگا،

ستمبر ۱۹۵۵ء کے آخری ہفتہ میں البعث الاسلامی کا پہلا شمارہ تیار ہو کر یکم اکتوبر کو منظر عام پر آیا، اس وقت تک صرف اشتہار و اعلان کی مدد سے ۵۰ سے زائد خریدار بن چکے تھے، دراصل ہندوستان کے اس وقت کے حالات میں کسی معیاری عربی مجلہ کا نکالنا ایک جرأتمندانہ قدم تھا، اس عالی ہمتی کا سہرا سب سے پہلے ہمارے مرحوم دوست مولانا سید محمد الحسنی صاحب کے سر ہے، انہیں کی ہمت اور عزم کو دیکھ کر دوسروں نے بھی عزم و ہمت سے کام لیا، مجھے یاد ہے کہ پرچہ کی تیاری اور تحریر و طباعت کے کسی مرحلہ میں بھی مجھے کوئی ادنیٰ بھی مایوسی نہیں ہوئی، بلکہ شانہ بشانہ میں ہر لمحہ ان کے ساتھ رہا اور بھرپور تعاون میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا، یہی وجہ تھی ان کو مجھ سے بہت زیادہ مناسبت ہوئی اور ابتداءً ایک رفیق کار کی حیثیت سے پھر ایک مخلص دوست کی حیثیت سے آخر تک ہمارا ان کا ساتھ رہا اور باوجود اتنی طویل رفاقت کے کبھی کوئی معمولی اختلاف یا کوئی ایسا واقعہ پیش نہیں آسکا جو کسی کی گرانی یا ناگواری یا اذیت کا باعث بنتا اور تعلقات پر اثر انداز ہوتا۔

یکم اکتوبر ۱۹۵۵ء کی صبح کو پرچہ نکلتے ہی پہلے سے طے شدہ پروگرام کے ماتحت ہم دونوں پرچہ کی

توسیع اشاعت کے سلسلہ میں ایک تجرباتی سفر پر نکلے، یہ سفر کے سلسلہ میں ہمارا پہلا تجربہ تھا، دونوں ہی سفروں کے نشیب و فراز سے ناآشنا تھے۔ اور ہمارے لئے یہ سفر ایک مہم جوئی کی حیثیت رکھتا تھا، سفر لکھنؤ سے شروع ہوا اور کانپور پہلی منزل قرار پایا۔ وہاں رات گذار کر ہم دوسرے دن صبح کو آگرہ کے لئے روانہ ہوئے، وہاں ہماری کسی سے آشنائی نہیں تھی لیکن آگرہ پہنچ کر ہم نے امام صاحب جامع مسجد سے ملاقات کی اور ان کے ذریعہ کچھ لوگوں سے تعارف ہوا، میکش اکبرآبادی سے بھی ملاقات ہوئی۔ انہوں نے پرچہ کو دیکھا اور اسے پسند کیا، کچھ اور دوستوں سے بھی ملاقات ہوئی اور دو ایک خریدار فراہم ہو سکے، ہم نے آگرہ پہونچ کر تاج محل اور قلعہ کی بھی زیارت کی اور بچپن سے جو کچھ تاج محل کے بارے میں سنتے آئے تھے وہ آج آنکھوں سے دیکھ بھی لیا مولانا محمد میاں صاحب نے وہاں پہونچکر یہ شعر پڑھا اور بار بار پڑھا ؎

اے تماشاگاہ عالم روئے تو تو کجا بہر تماشا می روی

جو وقت اور مناسبت کے لحاظ سے بہت برمحل معلوم ہوا،

آگرہ میں مختصر وقت گذارنے کے بعد ہم لوگ پہلی بار مسلم یونیورسٹی دیکھنے اور وہاں اپنے پرچہ کا تعارف کرانے کی غرض سے علی گڑھ پہونچے، وہاں طبیہ کالج میں ہمارے ایک ندوی دوست جناب ظل الرحمٰن صاحب بھوپالی ملے جو اب حکیم ظل الرحمٰن صاحب ہیں، انہوں نے باصرار ہم کو اپنا مہمان بنایا اور اپنے کمرہ ہی میں ازراہ کرم ٹھہرایا بھی، ان کے ذریعہ علی گڑھ میں اسلامک اسٹڈیز کے اس وقت کے سربراہ جناب ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب سے ملاقات ہوئی، جو بعد میں وائس چانسلر ہو گئے تھے، انہوں نے البعث کو بڑے تعجب اور غور سے دیکھا اور بیک وقت کئی سوال کر ڈالے، کیا آپ ہی لوگ اسے نکال رہے ہیں؟ کیا یہ جاری رہ سکے گا؟ اگر جاری رہنے کی امید ہو تو ایک سال کے لئے مجھے خریدار بنا لیجئے، اور ان کا نام خریداروں کی فہرست میں شامل کر لیا گیا، ان کے علاوہ اور بھی بہت سے لوگ خریدار بنے، کچھ طلبا نے بھی خریداری قبول کی، اور عربک ڈیپارٹمنٹ کے ہیڈ اور شیخ مامون دمشقی جو اسلامک اسٹڈیز میں باقاعدہ استاذ کی حیثیت سے وہاں مقیم تھے خریدار بنے، اور اس اقدام پر بہت ہی مسرت کا اظہار کیا،

علی گڑھ میں دو تین دن رہ کر ہم لوگ دہلی چلے گئے، وہاں مولانا سید محمد واضح رشید صاحب ندوی کے مہمان کی حیثیت سے انہیں کے مکان فراش خانہ میں قیام ہوا، مولانا واضح صاحب ندوی اس زمانہ میں

آل انڈیا ریڈیو کے عربی شعبہ میں اناؤنسر اور مترجم تھے، یہ زمانہ ان کے وہاں کے ابتدائی قیام کا تھا، دہلی میں البعث کافی پھیلا، وہاں کے عربی مدارس کے ساتھ جامعہ ملیہ میں بھی لوگ خریدار بنے، اور انفرادی طور پر بھی خاصی اشاعت ہوئی، دہلی کے بعد دیوبند جانا ہوا، دیوبند میں شیخ الاسلام مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے مکان پر قیام ہوا، اور حضرت مدنیؒ کے مہمان کی حیثیت سے ہم لوگ وہاں کئی دن ٹھہرے۔ طلبہ اور اساتذہ سے ملاقاتیں ہوئیں، اس زمانہ میں وہاں عربی ادب اور صحافت کا اتنا چرچا نہیں تھا جتنا آج ہے، ایک بہت ہی نشیط طالب علم اسماعیل افریقی صاحب تھے، جنھوں نے النھضۃ الادبیۃ کے نام سے اپنے طور پر افریقی اور بیرونی ممالک کے طلبہ کی انجمن بنا رکھی تھی، وہ مع اپنے رفقاء کے دارالعلوم کے احاطہ سے باہر شہر کے ایک مکان میں رہتے تھے اور وہیں سے وہ لوگ اپنی ادبی سرگرمیاں جاری رکھتے تھے ایک قلمی دیواری اخبار عربی میں الیقظۃ کے نام سے نکالتے تھے، انہوں نے ہمارے پرچہ کا بہت شاندار استقبال کیا اور خود بھی خریدار بنے اور بہت سے دوسرے طلبہ بھی ان کی وجہ سے خریدار بن سکے، اسی زمانے میں مولانا عبداللہ سورتی صاحب بھی دارالعلوم میں تھے جو جامعہ فلاح دارین ترکیسر گجرات کے اب مہتمم اعلیٰ ہیں، انہوں نے بھی ہماری بڑی مدد کی اور ساتھ دیا۔

اسی زمانے میں مولانا محمد میاں صاحب کے عزیز مولانا محمد سالم صاحب ہنسوی بھی دارالعلوم دیوبند میں زیر تعلیم تھے، وہ ہمارے پہونچتے ہی ہمارے رفیق و کرم فرما بن کر ساتھ ہو گئے، ان کی وجہ سے بھی بڑی سہولت ہوئی اور نئے نئے لوگوں سے ملاقاتیں ہو سکیں، پھر وہ رام پور تک ہمارے ساتھ رہے۔

دیوبند کے بعد سہارنپور جانا ہوا، وہاں سے رڑکی، مراد آباد، رام پور تک اس سفر کا سلسلہ دراز ہوا اور ہم لوگ اپنے مشن میں بڑی حد تک کامیاب رہے، ہر جگہ ہمارا استقبال ہوا، اس زمانہ میں عربی زبان میں کوئی ماہنامہ نکالنا ایک بالکل نئی بات تھی۔ "الضیاء" کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ ہندوستان میں ایک عربی، معیاری ماہنامہ نکلا اور ہر حیثیت سے اس نے خراج تحسین حاصل کیا،

یہ سفر ہم دونوں کے لئے مزید ہم آہنگی اور تعلقات میں استواری کا باعث ہوا، اس میں بے تکلف زندگی گذارنے اور ہر ایک کے لئے دوسرے کو آزمانے اور اس کے عیب و ہنر کو جانچنے کا موقع ملا، لمبے سفروں میں لوگ عموماً اختلاف کا شکار ہو جاتے ہیں، ہمارا یہ سفر بھی بہت طویل اور ایک طرح کا طوفانی دورہ

تھا، لیکن مقصدیت کی روح شروع سے آخر تک اس طرح کارفرما رہی کہ کسی اختلاف اور باہمی آویزش کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہو سکا، سفر شروع ہونے سے پہلے اور دوران سفر ہمیں سب سے زیادہ جن مشوروں سے فائدہ پہونچا وہ استاد مکرم مولانا سید محمد رابع صاحب ندوی کے مشورے تھے، جن کو اصابت رائے کی دولت سے اللہ تعالیٰ نے خاص طور سے نوازا ہے،

اس سفر سے واپسی کے بعد ہماری ملاقاتیں بہت وسیع ہوئیں، البعث کے سلسلہ میں خاص طور سے مشورے اور اس کی ذمہ داریوں کی انجام دہی کے بارے میں روزانہ شام کو ایک ملاقات تقریباً فرض کے درجہ تک پہونچ گئی تھی، اس موقع پر یہ وضاحت بھی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ البعث الاسلامی کا پہلے ندوۃ العلماء سے صرف اخلاقی تعلق تھا، اور اصلاً وہ محمد میاں صاحب ہی کی تحویل میں تھا، ندوۃ العلماء سے باقاعدہ تعلق ۱۹۶۱ء میں ہوا اور اس کا دفتر جو پہلے گوئن روڈ پر مولانا مرحوم کے مکان میں تھا اب دارالعلوم کی عمارت میں منتقل ہو گیا، لیکن البعث ندوۃ العلماء کی تحویل میں جانے سے پہلے گوئن روڈ سے لیتھو کی طباعت پر ڈیڑھ سال تک نکلا، اسکے بعد ندوۃ العلماء نے ایک معمولی عربی پریس قائم کرنے کی اجازت دیدی تھی جس کے ابتدائی سارے انتظامات ہم لوگوں نے مولانا جمیل احمد ندوی دوسرے مددگار ناظم ندوۃ العلماء کے تعاون سے کئے تھے اور ندوۃ العلماء کے دفتر نظامت میں جو گوئن روڈ ہی پر تھا اس کی ابتداء ہو گئی تھی۔ پریس قائم تو ہو گیا لیکن عربی کمپوزنگ کے لئے کوئی کمپوزیٹر دستیاب نہیں تھا، بہت کوشش کے بعد ایک اردو کمپوزیٹر عبداللطیف خاں صاحب سے اس سلسلہ میں ملاقات کی گئی۔ انہوں نے تعاون کیا اور خود ہی خارج وقت میں عربی کمپوزنگ کا کام شروع کیا، مگر وہ عربی سے ناواقف ہونے کے باعث ہم لوگوں کے لئے اتنے مفید نہ ہو سکے جتنے کی ضرورت تھی، ہوتا یہ تھا کہ مولانا محمد میاں صاحب اور کبھی میں گھنٹوں ان کے پاس کھڑے رہ کر ان سے کمپوز کراتے تھے، ایک ایک لفظ پڑھ پڑھ کر ان کو بتاتے تھے اور اسی کے مطابق وہ حروف اٹھا اٹھا کر جوڑتے تھے، پھر بھی صحیح کمپوزنگ بہت ہی دشوار بات تھی، یہ سلسلہ ایک عرصۂ دراز تک قائم رہا، اسی اثناء میں کچھ لوگوں کو عربی کمپوزنگ سکھانے کی بھی کوشش کی گئی، اس میں ایک صاحب نے کافی حد تک اس کی مشق کر لی اور وہ ہمارے لئے معاون ثابت ہوئے، لیکن جلد ہی وہ بھی الگ ہو گئے، پھر جب پریس دارالعلوم کی عمارت میں ۱۹۵۹ء میں منتقل ہوا تو ایک کوشش بعض طالب علموں کو سکھانے کے

سلسلہ میں کی گئی اس میں بھی خاطر خواہ کامیابی نہ ہوسکی، اور بدقت تمام خاں صاحب ہی سے کمپوز کرا کے کسی طرح ۳۲ صفحے کا پرچہ نکالنے کا سلسلہ جاری رہا، مگر چونکہ اس میں کافی وقت لگتا تھا اور پورے مہینہ بھر میں ۳۲ صفحے کی کمپوزنگ انتہائی محنت صرف کرنے کے بعد بھی نہیں ہو پاتی تھی اس لئے پرچہ ماہ بماہ نکلنے کی پابندی پر قائم نہ رہ سکا اور موخر ہونا شروع ہوا، یہانتک کہ جلد پنجم تک پہونچتے پہونچتے دس مہینے موخر ہوگیا، اس کی تلافی کی صورت یہی رہ گئی تھی کہ پورے ایک سال کا ناغہ مان کر از سر نو تاریخ کے مطابق ہر مہینہ کی پہلی تاریخ کو پرچہ شائع کرنے کے انتظامات کر کے عزم کے ساتھ اس پر قائم رہنے کی کوشش کی جائے، خدا کا شکر ہے کہ اس میں کامیابی ہوئی اور اس کے بعد سے پھر آج تک پرچہ وقت پر نکل رہا ہے۔ فرق اتنا ضرور ہوا کہ ایک سال کا نقصان ہونے کی وجہ سے ایک جلد ہم پیچھے رہ گئے اور اب جب کہ اکتوبر ۵۵ء کے لحاظ سے جلد ۲۵ ہونی چاہیئے جلد ۲۴ ہی چل رہی ہے۔

۱۹۶۲ء میں جب پریس بھی دار العلوم میں تھا اور البعث کا دفتر بھی یہیں تھا باہر کے کچھ لوگوں کو کمپوزنگ سکھانے کی طرف توجہ ہوئی اور تجربہ کامیاب رہا، مئو ضلع اعظم کے انوار احمد صاحب نے بہت اچھی مشق حاصل کر لی اور وہ مستقل کمپوزیٹر کی حیثیت سے ہمارے پریس میں آگئے، ان کی وجہ سے البعث کے صفحات بھی بڑھانے کی طرف توجہ ہوئی اور پریس کو وسیع کرنے کا خیال بھی پیدا ہوا اور اس میں خاصی کامیابی ہوئی، البعث ۴۰ صفحے کا کیا گیا، پھر جلد ہی ۶۰ صفحات پر نکلا اور اس کے بعد ۸۰ صفحے کا پرچہ شائع ہوا ہوا پھر ۱۰۰ صفحے تک اس کی ضخامت پہونچی جو آج بھی بحمد اللہ قائم ہے۔

ان تمام کاموں میں اصل مشورہ اور صحیح رہنمائی مولانا مرحوم ہی کی تھی، انہوں نے اپنی محبت کی بنا، پر مجھ پر مکمل اعتماد کر کے پوری طرح مجھ کو ذمہ دار سمجھا، میں نے اللہ تعالیٰ کی توفیق و تائید سے اپنا پورا وقت لگایا اور البعث کی تحریر و طباعت کی ذمہ داری کے ساتھ مربی مخدوم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی دامت برکاتہم کے بعض رسائل و پمفلٹ کی طباعت میں بھی حصہ لینا شروع کیا، اور ۱۹۶۳ء میں حضرت مولانا دامت برکاتہم کی ایک اہم ترین تصنیف "موقف العالم الاسلامی تجاہ الحضارۃ الغربیۃ" کے نام سے اس پریس میں طبع ہوئی، اس کتاب کی طباعت دراصل پریس کی بڑی کامیابی سمجھی گئی اس لئے کہ کتاب اتنی اچھی چھپی کہ باہر کے پریس میں چھپی ہوئی کتابوں سے کسی طرح کم

نہیں تھی۔ یہی کتاب بعد میں کافی ترمیم و اضافہ کے بعد "الصراع بین الفکرۃ الاسلامیۃ والفکرۃ الغربیۃ" کے نام سے بیروت سے شائع ہوئی اور بہت مقبول ہوئی، اس کتاب کی تصنیف کا اصل محرک یہ تھا کہ راقم السطور نے حضرت مولانا دامت برکاتہم سے البعث الاسلامی کے لئے کسی نئے اور تازہ مضمون کی درخواست کی تھی، حضرت مولانا نے از راہ شفقت درخواست منظور فرمالی اور مضمون شروع فرمایا لیکن موضوع بہت اہم تھا اس لئے وہ بجائے مختصر مضمون پر منتہی ہونے کے پوری ایک کتاب کی شکل اختیار کر گیا اور پھر اس کی اہمیت کے پیش نظر اس کی فوری طباعت بھی ضروری سمجھی گئی جو اسی پریس میں اُس وقت ممکن ہوسکی۔

البعث کی ترقی اور تنوع کے ساتھ پریس بھی وسیع ہوتا رہا، اور پہلے کے مقابل میں اب وہ کافی پھیل چکا ہے، اس میں بہت سی کتابیں (اور بعض بہت اہم کتابیں) چھپ کر منظر عام پر آئیں، خاص طور سے حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب دامت برکاتہم کی کئی اہم کتابیں طبع ہوئیں، مثلاً مقدمہ اوجز المسالک، تراجم البخاری، لامع الدراری، اور بذل المجہود کی ۶ جلدیں، نیز مختصر کتابیں جیسے فضائل الصلاۃ، فضائل التبلیغ والدعوۃ، فضائل القرآن، اسباب سعادۃ المسلمین وشقاءہم، اور اس وقت الکوکب الدری زیر طبع ہے، اس کی تین جلدیں چھپ چکی ہیں، آخری جلد بھی انشاء اللہ مستقبل قریب میں شائع ہو جائے گی۔

البعث الاسلامی کی برکت سے ہمارا تعلق اتنا وسیع اور مستحکم ہوا کہ ہر ایک کو دوسرے سے ملنے اور گفتگو و مشورہ کرنے کا ہر وقت انتظار رہا کرتا تھا۔ اس ملاقات میں اس قدر پابندی ہوئی کہ اگر کبھی کسی مجبوری کی وجہ سے ملاقات نہ ہوسکی تو ایک خلا محسوس ہوتا تھا، لوگوں میں ہمارے اس مخلصانہ تعلق کا چرچا ہوا اور آخر میں ہماری دوستی ضرب المثل بن گئی، جو لوگ شروع میں تنقید کرتے تھے بعد میں وہ بھی قائل ہو گئے، اس مخلصانہ محبت اور تعلق کا اثر یہ ہوا کہ نہ صرف علمی امور میں ہم لوگ آپس میں تبادلۂ خیال کرتے تھے بلکہ زندگی کے سارے معاملات میں مشورہ ضروری سمجھتے تھے، ہر ایک کو دوسرے کے مشوروں سے بہت تقویت حاصل ہوئی اور متعدد مواقع پر بڑی قیمتی رہنمائی ملی۔

۱۹۵۶ء کے شروع میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی دامت برکاتہم کے حکم سے

مجھے عراق کا ایک خالص علمی اور تعلیمی سفر کرنا پڑا، حضرت مولانا نے میرے لئے عربی ادب اور نحو و بلاغت کے موضوع پر مزید مطالعہ اور استفادہ کے لئے استاد جلیل ڈاکٹر تقی الدین الہلالی کی خدمت میں بھیجا تھا، اس وقت ان کا قیام بغداد میں تھا وہ بغداد یونیورسٹی کے ٹیچر ٹریننگ کالج میں پروفیسر تھے، میں نے ایک سال سے کچھ کم مدت ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں رہکر استفادہ کرنے میں پوری مشغولیت کے ساتھ گذاری، اس زمانہ میں اخوان کی تنظیم وہاں بھی ممنوع قرار پاچکی تھی اس لئے وہ لوگ جمعیۃ انقاذ فلسطین کے نام سے مرکز قائم کر کے دعوتی سرگرمیاں انجام دیتے تھے، میرا قیام اسی مرکز میں ہوا، جمعیۃ کے رئیس شیخ محمد محمود الصواف تھے، مگر وہاں اسی زمانہ میں ایک خونیں انقلاب برپا ہوا اور شاہی نظام حکومت کے خاتمہ کے ساتھ انقلابیوں نے پورے شاہی خاندان کو موت کے گھاٹ اتار دیا، اس زمانہ میں نوری سعید وزیر اعظم اور عبد الاآہ ولی عہد تھے۔ ان دونوں کی لاشیں سڑکوں پر گھسیٹی گئیں اور ان کے ساتھ نہایت بُرا سلوک کیا گیا، پوری قوم اس انقلاب سے خوش تھی، قائد انقلاب عبد الکریم قاسم اور عبد السلام عارف تھے، مگر افسوس کہ اول الذکر نے کمیونزم کو پورے ملک پر مسلط کرنے میں بڑا رول ادا کیا، اور پھر اپنے کمیونسٹ دوستوں ہی کے ہاتھوں مارا بھی گیا۔

اس سفر کی وجہ سے ہم دونوں کے لئے ایک دوسرے سے دوری بہت شاق ہوئی، لیکن اسکے دینی، اور دعوتی پہلوؤں اور علمی ترقی کی توقع میں اسے گوارا کرنا پڑا، سفر کے موقع پر ہم لوگوں نے کئی بار اس کو زیادہ سے زیادہ مفید بنانے اور کم وقت میں زیادہ فائدہ اٹھانے کے سلسلہ میں آپس میں مشورہ کیا، البعث کی توسیع اشاعت بھی سفر کا ایک اہم مقصد بنایا گیا، اس کی ایجنسی وہاں پہلے سے قائم بھی تھی، اور ہمارے کرم فرما اور دینی دوست ڈاکٹر صالح مہدی سامرائی وہاں اس کے پوری طرح وکیل تھے اور جمعیۃ انقاذ فلسطین کے مرکز ہی میں رہتے تھے، جب ہم وہاں پہونچے تو ان کے ساتھ ہی رہنا ہوا، اگرچہ ہم الگ کمرہ میں مقیم تھے لیکن دن رات کا ساتھ تھا اور عموماً دعوتی اجتماعات میں انھیں کے ساتھ جانا ہوتا تھا، سفر کے دوران مولانا محمد میاں صاحبؒ کے خطوط میرے لئے بڑا سہارا تھے وہ اپنے قیمتی مشوروں سے نوازا کرتے تھے اور ہمت افزائی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے تھے، سفر شروع ہونے سے پہلے انہوں نے اس ملک کا جو نقشہ کھینچا تھا وہ سو فیصد صحیح نکلا، اس سے جہاں ان کی فراست کا پتہ چلتا ہے وہیں ان کے وسیع مطالعہ اور عالم اسلام سے گہرے تعلق اور محبت کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔

مولانا کی شادی کم عمری ہی میں ہوگئی تھی، البعث کے نکلنے کے ایک مہینے کے بعد عقد ہوا، شاید ۲ر نومبر ۱۹۵۵ء کی تاریخ تھی، میں اس زمانے میں اپنے وطن مؤضلع اعظم گڑھ چلا گیا تھا اس لئے شرکت نہ کر سکا تھا، اتنی کم عمری میں ان کی شادی اس وقت لوگوں کے لئے ذرا تعجب کا باعث تھی، اس لئے کہ خاندان کے عام رواج سے ہٹ کر ایسا ہوا تھا، پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو جلد ہی اولاد کی دولت سے بھی نوازا، اور ۲۹ر جنوری ۱۹۵۷ء کو ان کے پہلے صاحبزادے عبد اللہ[1] پیدا ہوئے، سب نے یہ خبر خوشی اور مسرت کے ساتھ سنی، اہل تعلق نے مبارکباد دی، دوستوں نے اظہار مسرت کیا اور بزرگوں نے دعائیں دیں، اور وقت پر عقیقہ کیا گیا، اہل تعلق دعوت عقیقہ میں شریک ہوئے، ڈاکٹر صاحب (مولانا کے والد معظمؒ) نے اس کا اہتمام فرمایا۔ اس موقع پر سب سے زیادہ خوشی (اہل خاندان کے بعد) جس کو ہو سکتی ہے وہ راقم سطور تھا، دوسرے صاحبزادے عمار سلمہٗ ۲ر اکتوبر ۱۹۶۴ء کو پیدا ہوئے۔ اللہ کا شکر ہے اب وہ بھی حافظ ہیں، تیسرے صاحبزادے بلال سلمہٗ کی تاریخ پیدائش یاد نہیں، وہ بھی ماشاء اللہ دینی تعلیم کے میدان میں ہیں۔

بغداد سے میری واپسی تقریباً گیارہ ماہ کے بعد ہوئی، مولانا سراپا شوق و انتظار تھے۔ ایک طویل عرصہ کی غیر حاضری کے بعد ملاقات ہوئی تو خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا، اس عرصہ میں البعث کا دعوت اسلامی نمبر تیار ہو کر شائع ہو چکا تھا، اور وہ مضامین کے تنوع اور معلومات کی کثرت نیز طباعت و ترتیب کے لحاظ سے بہت معیاری تھا، حیرت ہوئی کہ مولانا نے تنہا اتنا بڑا کام کیسے کر لیا جب کہ اس وقت ٹائپ پر طباعت کی سہولت بھی بہت کم میسر تھی، یہ خاص نمبر بہت مقبول ہوا اور اس کی اشاعت بھی خوب ہوئی۔

مولانا مرحوم کا ذہن عالم اسلام کے مسائل و حالات سے کبھی فارغ نہیں رہتا تھا، وہ ہر وقت وہاں کی دینی اور دعوتی تحریکوں، اور سرگرمیوں کا بغور مطالعہ کرتے رہتے اور نت نئے حالات کا جائزہ لیتے رہتے تھے، وہاں سے جو لٹریچر اور جرائد و مجلات اور نئی کتابیں آتیں ان کو غائر نظر سے پڑھنے اور

---

[1] مولوی عبد اللہ حسنی صاحب دار العلوم ندوۃ العلماء سے کئی سال پہلے فارغ ہو کر اب مدرس کی حیثیت سے یہاں کام کر رہے ہیں اور الرائد کے سکریٹری التحریر بھی ہیں، ان کو اردو اور عربی میں مضامین لکھنے کی اچھی مشق ہے، اپنے والد مرحوم اور بزرگوں کے نقش قدم پر ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی اور سب بھائیوں کی عمر اور علم و عمل میں برکت عطا فرمائیں۔

نتائج اخذ کرنے میں خاص ملکہ رکھتے تھے، فکری حیثیت سے وہ اتنے بلند تھے کہ بڑے سے بڑے اہل فکر بھی ان کی بلند پروازی کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے، وہ فکری حیثیت میں اپنے عم مخدوم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی دامت برکاتہم سے بہت زیادہ مشابہت رکھتے تھے، اس سلسلہ میں بارہا اس کا تجربہ ہوا کہ کسی مسئلہ کے بارے میں جو خیال انہوں نے ظاہر کیا بعینہٖ وہی خیال حضرت مولانا دامت برکاتہم کی زبان سے سننے میں آیا۔ بعض دفعہ تو الفاظ اور اسلوب بیان میں بھی سو فیصد یکسانیت دیکھنے میں آئی،

نہ صرف عالم اسلام بلکہ دنیا کی تہذیبوں اور مختلف تحریکوں اور مادی وغیر مادی دعوتوں اور سرگرمیوں سے خاص طور سے مغربی تہذیب و ثقافت سے اس حد تک واقفیت رکھتے تھے جیسے وہ ان چیزوں کا مشاہدہ کر چکے ہوں، اور ان کے تمام عیب و ہنر ان کی نظروں کے سامنے ہوں، وہ انگریزی زبان سے بھی واقف تھے اس لئے انگریزی اخبارات و رسائل اور کتابوں کا بھی مطالعہ کرتے تھے۔ نومسلم خاتون مریم جمیلہ نے جب ۱۹۶۳ء میں اسلامی موضوع پر لکھی ہوئی اپنی پہلی کتاب (ISLAM VERSUS THE WEST) حضرت مولانا دامت برکاتہم کی خدمت میں بھیجی تو مولانا محمد میاں صاحبؒ نے اس کو پڑھکر اس کے مختلف حصوں کا عربی میں ترجمہ کیا، جو البعث کے متعدد شماروں میں چھپا تھا، اس سے پہلے وہ محمد اسد صاحب کی کتاب (ROAD TO MECCA) کا ترجمہ اور اس کی تلخیص بھی کر چکے تھے جو "طوفان سے ساحل تک" کے نام سے مجلس تحقیقات و نشریات اسلام سے اسی زمانہ میں چھپ گئی تھی۔

جنوری ۵۹ء کے اواخر میں، میں اپنے عراق کے سفر سے واپس آیا، تو دوران گفتگو ہم لوگوں نے ایک ایسی انجمن بنانے کے بارے میں سوچا جو عالم اسلام کے حالات و واقعات سے تعلق رکھے اور اسکے ذریعہ ایک دعوتی اور ثقافتی رابطہ قائم کیا جا سکے، کافی غور و خوض کے بعد اس نتیجہ پر پہونچے کہ سردست اسکو باہر ہی کے کام کے لئے خاص رکھا جائے اور ممبران بھی سب باہر کے ہوں، چنانچہ اس کا نام عربی میں "الرابطة الاسلامية الدولية" اور اردو میں انجمن رابطہ اسلامی رکھا گیا، اس کے لئے ایک مضمون تیار کرنا پڑا جس میں سارے مقاصد اور انجمن قائم کرنیکے دواعی و محرکات کی تفصیل آگئی، وہ مضمون عربی ٹائپ میں چھپوا کر بطور خط بہت سے منتخب لوگوں کے پاس بھیجا گیا، اور کچھ دنوں کے بعد جوابات آنے کا سلسلہ شروع ہوا، لوگوں نے اس کی بڑھ چڑھ کر ترحیب کی اور ایسا معلوم ہوا کہ جیسے ایک خلا ہو جسے پُر کرنے

کے لئے لوگ بے چین ہوں، ان جوابات سے ہم لوگوں کی زبردست ہمت افزائی ہوئی اور اللہ کا نام لیکر یہ انجمن قائم کر دی گئی، اس کا دفتر گوئن روڈ ہی پر دفتر نظامت ندوۃ العلماء والی عمارت میں اوپر کے حصہ میں قائم ہو گیا، اور الحمد للہ انجمن کی سرگرمیاں بھی شروع ہو گئیں، ہم دو ہی آدمی اس کے بھی سارے کاموں کو انجام دیتے تھے، ایک خبرنامہ شائع کرنا شروع کیا گیا جو عربی، انگریزی میں ہوتا تھا، اس کا نام بھی "الرابطة الاسلامية الدولية" رکھا گیا۔ بعد میں جب لوگوں نے انجمن کی افادیت محسوس کی تو مقامی طور پر بھی اس کی ایک شاخ قائم کر دی گئی اور ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی صاحب اس کے صدر منتخب ہوئے، اس کے اجتماعات بھی ہوتے رہے، اس میں زیادہ تر طلبہ نے حصہ لیا، میڈیکل کالج کے طلبہ ڈاکٹر صاحب کی وجہ سے کافی مانوس ہوئے۔ اسی زمانے کے ایک طالب علم جناب محسن شمسی صاحب بہت سرگرم رکن تھے، اب وہ ڈاکٹر محسن شمسی صاحب ہیں اور لکھنؤ کنٹونمنٹ کے علاقہ میں ایک سرکاری فوجی اسپتال میں اپنی خدمت انجام دے رہے ہیں۔

انجمن رابطہ اسلامی کی سرگرمیاں عرصہ تک قائم رہیں، لیکن کام کے آدمیوں کی کمی اور سرمایہ نہ ہونے کی وجہ سے افسوس کے ساتھ اس کے کام کو موقوف کرنا پڑا، اس کے فوراً بعد مکہ مکرمہ میں رابطہ العالم الاسلامی کا قیام بھی عمل میں آیا، اس کے مقاصد اور کاموں، اور ہماری انجمن کے مقاصد میں بہت حد تک یکسانیت تھی، یہ صحیح ہے کہ یہ بہت بڑے پیمانے پر شروع ہوا اور ایک ایسے اسلامی ادارہ کے طور پر معرض وجود میں آیا جس کی پشت پناہی دنیا کی ایک عظیم الشان حکومت کر رہی ہے،

مولانا ایک خالص علمی اور دعوتی عالی گھرانے سے تعلق رکھنے کی بناء پر تصنیف و تالیف کا بھی بہت اونچا اور معیاری ذوق رکھتے تھے، ان کی سب سے پہلی تصنیف "سیرت مولانا محمد علی مونگیری" ہے جو انہوں نے ۶۴ء میں لکھی تھی، اگرچہ اس سے پہلے ہی ان کا ترجمہ "طوفان سے ساحل تک" چھپ کر مقبول بھی ہو چکا تھا، اس کے بعد انہوں نے اپنے خاندانی بزرگ شیخ علم اللہ جو ایک زبردست عالم ربانی تھے کی سیرت پر اپنی کتاب "تذکرہ شاہ علم اللہ" کے نام سے تصنیف کی، ۱۹۵۹ء ہی کی بات ہے کہ ایک بار ہم لوگوں نے عربی میں ایک ایسی کتاب لکھنے کا خاکہ تیار کیا جو مکمل طور پر اسلام کی صحیح نمائندگی کر سکے، اور جو موجودہ دور کی ذہنی اور تہذیبی تبدیلیوں کو پیش نظر رکھ کر ایسے انداز میں لکھی جائے کہ وہ نئے تعلیم یافتہ طبقہ اور خاص طور سے

نوجوانوں کے لئے اسلام کا صحیح تعارف پیش کر سکے اور ان کے ذہنوں کو اپیل کر سکے، کتاب کا ابتدائی خاکہ تیار کر لیا گیا تھا مگر افسوس کہ دوسرے مشاغل کی وجہ سے اس کے لئے وقت میں گنجائش نہیں نکل سکی اور وہ خواب شرمندۂ تعبیر ہونے سے رہ گیا۔

مولانا کے قلم میں ایسی طاقت و تاثیر تھی جو مردہ دلوں میں زندگی پیدا کر دیتی تھی، ان کے عربی اور اردو کے مضامین، زبان و بیان اور اسلوب و نگارش کے لحاظ سے اعلیٰ ترین معیار پر پورے اترتے تھے، البعث الاسلامی کے ہر شمارہ میں ان کا افتتاحیہ ہی دراصل پرچہ کی جان ہوتا تھا، مجھے ذاتی طور پر معلوم ہے کہ عرب نوجوانوں اور اہل قلم کی ایک بڑی تعداد ان کے اداریوں کے لئے بے چین رہتی تھی، جب ان کو یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ تحریر ایک ایسے نوجوان عالم و ادیب اور صاحب قلم کی ہے جس نے عرب ممالک میں کوئی تربیت نہیں حاصل کی ہے اور نہ کسی عرب ملک میں وقت گذارا ہے تو ان کے تعجب کی انتہا نہیں رہتی تھی، مصر و شام اور اردن و حجاز کی دینی جماعتوں سے تعلق رکھنے والے عرب علماء و ادبا اور اخوانی نوجوانوں کو اچھی طرح معلوم ہے کہ جب دنیا کے کسی حصہ میں جمال عبدالناصر کے غلط تصرفات اور اسکی اسلام کشی کے خلاف کوئی آواز اٹھانے کی ہمت کسی میں نہیں تھی تو تنہا محمد الحسنی مرحوم نے عبدالناصر کی حقیقت کو آشکارا کرنے کا بیڑا اٹھایا تھا اور باوجود خطرات و موانع کے وہ اس مقدس فریضہ سے باز نہیں آئے، جس کا جی چاہے البعث کے وہ مضامین اور افتتاحیے پڑھ لے جس میں انہوں نے قومیت کے بت تراش آزر کے ساتھ پنجہ آزمائی کی ہے اور اسے آخری انجام تک پہونچا کر دم لیا ہے۔

یہی نہیں بلکہ جب بھی عالم اسلام کے کسی گوشے میں کوئی آزر دمانی، کوئی فرعون و نمرود، کوئی مسیلمہ کذاب، کوئی چنگیز و ہلاکو، کوئی ہٹلر و مسولینی، کوئی لینن و اسٹالن نمودار ہوا، یا کوئی غلط تحریک و دعوت ظاہر ہوئی تو بلا تاخیر مولانا کے قلم کا سیل رواں جوش میں آیا اور پوری قوت کے ساتھ اس کو کچلنے اور حقیقت آشکارا کرنے کی کوشش کی۔ وہ قلم کو ایک مقدس امانت سمجھتے تھے اور اس کو بہت ہی احتیاط کے ساتھ دعوت حق اور فکر اسلامی کی ترویج و اشاعت میں اور باطل کی سرکوبی اور اس کو پسپا کرنے میں صرف کرتے تھے، ان کا قلم عربی اور اردو دونوں زبانوں میں یکساں مہارت رکھتا تھا اور وہ اپنی اس صلاحیت کو بروئے کار لانے میں کوئی پس و پیش کبھی نہیں کرتے تھے، اسی بناء پر جب ۱۹۶۳ء میں دارالعلوم کے

شعبۂ تعمیر و ترقی کی طرف سے ایک پندرہ روزہ پرچہ "تعمیر حیات" نکالنے کا فیصلہ ہوا تو اس کی ادارت کے فرائض انجام دینے کے لئے اپنی تمام مشغولیتوں کے باوجود تیار ہو گئے، یہاں بھی انہوں نے مجھ کو اپنی رفاقت سے محروم نہیں رکھا، اور باصرار میرا نام بھی معاون اڈیٹر کی حیثیت سے سرورق پر طبع کرایا، اور البعث کے ساتھ ساتھ تعمیر حیات کی تحریر و طباعت کی ذمہ داری بھی عرصہ تک ہم دونوں کے سر رہی،

۱۹۶۷ء میں وہ پہلی بار حضرت مولانا دامت برکاتہم کی معیت میں حجاز گئے اور مدینہ منورہ میں چھ ماہ سے زائد عرصہ تک قیام کیا، اس دوران انہوں نے فریضۂ حج بھی ادا کیا، دوسری بار وہ ندوۃ الشباب العالمیۃ کی کانفرنس میں شرکت کی غرض سے اس کی دعوت پر ۱۹۷۲ء میں ریاض گئے اور حرمین شریفین میں بھی وقت گذارا اور عمرہ کی سعادت حاصل کی تیسری اور آخری بار پھر وہ حضرت مولانا دامت برکاتہم کے رفیق سفر کی حیثیت سے حجاز گئے، یہ مئی ۱۹۷۴ء کا واقعہ ہے، اور کم و بیش ایک ماہ کے بعد واپس آئے،

مولانا مرحوم کو اپنے اس ساتھی کے باہر کے سفروں کا بھی بڑا اہتمام ہوا کرتا تھا، وہ اسے ہر حیثیت سے زیادہ سے زیادہ مفید بنانے کے بارے میں سوچتے تھے اور اس سلسلہ میں وہ پورا تعاون کرتے تھے، انہوں نے ہر بار سفر کے موقع پر بہت ہی خوشی کا اظہار کیا، اگرچہ سفر شروع ہونے کے وقت ساتھ چھوڑنے کا ایک عارضی غم ضرور ہوتا تھا، لیکن وہ اسے ہر قیمت پر برداشت کرتے تھے، مہرجان تعلیمی کے موقع پر اگست ۱۹۷۵ء کے شروع میں جب ہمارے باہر کے سفر کا پروگرام بنا اور عالم اسلام کی بڑی شخصیتوں کو دعوت دینے اور مہرجان کے سلسلہ میں ذہن تیار کرنے اور زمین ہموار کرنے کے لئے ہمارا انتخاب ہوا تو انہوں نے اس پر بہت زیادہ مسرت کا اظہار کیا اور اپنے گراں قدر مشوروں سے نوازا، یوں تو مہرجان کے سلسلہ میں تقریباً ۱۰ ماہ پہلے ہی سے ہم لوگ اس کی تیاریوں میں مصروف تھے، مولانا علمی اور فکری حیثیت سے اس کو کامیاب بنانے کی راہ ہموار کر رہے تھے، اسی ضمن میں البعث الاسلامی کا ندوۃ العلماء نمبر نکالنے کا فیصلہ بھی کیا گیا جو مہرجان سے پہلے ہی بحمداللہ نہایت کامیابی اور خوبصورتی کے ساتھ ایک وقیع دستاویز کی شکل میں منظر عام پر آگیا دوسرا نمبر مہرجان کی تفصیلی کارروائیوں اور مقالات پر مشتمل تھا جو ضخامت میں پہلے نمبر سے کم نہ تھا یہ بعد میں نکلا، ان دونوں خاص نمبروں کی ترتیب و تحریر میں اصلاً مولانا ہی کا ذہن کام کرتا رہا اور انھیں کی توجہ سے یہ نکل سکا، مہرجان کے بعد انہوں نے حضرت مولانا دامت برکاتہم کے حکم سے "روداد چمن" لکھ کر اپنی

عظیم الشان صلاحیت اور فنی خصوصیات کا سکہ جما دیا، یہ کتاب بھی ان کی ایک عظیم یادگار رہے گی،

باہر کے سفروں کے دوران مجھے ایک دفعہ کسی عرب دوست نے البعث کے افتتاحیوں کا مجموعہ تیار کرکے اسے الگ سے کتابی شکل میں چھپوانے کی طرف توجہ دلائی۔ اس کا ذکر میں نے مولانا مرحوم سے کیا انہوں نے اسے پسند کیا اور اس کی طرف توجہ کی، چنانچہ پہلا مجموعہ "الاسلام الممتحن" کے نام سے کئی سال پہلے قاہرہ میں چھپا اور تھوڑے ہی عرصہ میں اس کے بہت سے اڈیشن نکل گئے، اس کتاب کو عرب نوجوانوں نے بہت ہی شوق سے ہاتھوں ہاتھ لیا اور وہ کافی پسندیدگی کی نظر سے دیکھی گئی، اس کے علاوہ "الی القیادۃ العالمیۃ"، اور "الاسلام بین لا ونعم"، کے مسودے بھی تیار ہیں جو انشاء اللہ تعالیٰ عنقریب قاہرہ سے شائع ہونگے، مولانا نے مجھے بھی کئی بار مشورہ دیا کہ میں اپنے "البعث" میں شائع شدہ مضامین کو موضوع کے لحاظ سے مختلف مجموعوں میں جمع کر دوں۔ ایک دفعہ انہوں نے خود ہی فہرست بنادی اور کہا کہ تمہارے اتنے مجموعے تیار ہوسکتے ہیں، پھر باصرار ان سب کو اکٹھا کرنے کی ترغیب دلاتے رہے مگر سوائے ایک مجموعہ کے جو "فی رحاب العارفین" کے نام سے قاہرہ سے شائع ہوا، کسی اور مجموعے کے تیار کرنے کی توفیق اب تک نہ ہوسکی، افسوس کہ یہ کتاب بھی ان کے سانحۂ ارتحال کے بعد چھپ کر آئی اور وہ دیکھ بھی نہ سکے، ایک دفعہ انہوں نے مجھ سے کہا کہ موسیقی اور گلنے کے بارے میں ایک تحقیقی مضمون لکھنے کی ضرورت ہے تاکہ البعث میں شائع کیا جاسکے، ادھر عرب نوجوانوں میں رقص وسرود اور نغمہ وموسیقی پر فریفتگی کا رجحان کافی بڑھ گیا ہے اور مرض کی حد تک وہ اس میں مبتلا ہو رہے ہیں، انہوں نے مجھ سے کہا کہ تم اس موضوع پر کتاب وسنت کی روشنی میں ایک مضمون لکھو، چنانچہ میں نے "الغناء والموسیقی فی الاسلام" کے عنوان سے یہ مضمون لکھا اور وہ البعث میں کئی قسطوں میں شائع ہوا، اسی طرح وہ ہمیشہ اس بات کے متمنی ہوتے تھے کہ میں فقہی اور علمی موضوعات پر ضرور لکھا کروں، ان کے علمی مشورے میرے لئے ہمیشہ مشعل راہ رہیں گے، کبھی ایسا بھی نہیں ہوا کہ انہوں نے افتتاحیہ یا کوئی مضمون لکھا ہو اور نہایت اہتمام سے اس پر تبادلۂ خیال نہ کیا ہو، اکثر وہ اس کام کے لئے چائے کی مجلس کا اہتمام کرتے اور مضمون پر پوری آزادی سے میری رائے معلوم کرتے تھے۔

مہرجان کے موقع پر پیام ندوۃ العلماء کے نام سے ایک مختصر کتاب ترتیب دی اور وہ چھپ کر مقبول ہوئی، اس کتاب میں ندوۃ العلماء کے بارے میں ان کا نقطۂ نظر کھل کر سامنے آگیا ہے، وہ اس عظیم الشان

اسلامی ادارہ کو کس شکل میں دیکھنا چاہتے تھے اور کس انداز کے علماء کی جماعت کے وہ متمنی تھے اور اس سلسلہ میں ان کے کیا مشورے تھے، یہ سب باتیں اس کتاب کے مطالعہ سے اچھی طرح سمجھ میں آجاتی ہیں، دراصل وہ ابتداہی میں بانی ندوۃ العلماء مولانا سید محمد علی مونگیری رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح اور حالات لکھ کر ندوۃ العلماء کے قیام کے صحیح مقاصد اور اس کی روح سے خوب واقف ہو گئے تھے،

حضرت مولانا دامت برکاتہم کی سیرت کے موضوع پر مہتم بالشان کتاب "السیرۃ النبویۃ" عربی میں شائع ہوئی تو اس کا نہایت سلیس وشگفتہ اردو ترجمہ مولانائے مرحوم نے کیا اور یہ کتاب اردو میں "نبی رحمتؐ" کے نام سے شائع ہوئی، اس کی زبان سے کسی حال میں یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ وہ کوئی ترجمہ ہے، یہی حال ان کے سارے تراجم کا ہے جیسے "ارکان اربعہ" "اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش"، "جب ایمان کی بہار آئی"، "ربانیہ لا رہبانیہ"، اسکے علاوہ اور بہت سے رسائل وپمفلٹ کا ترجمہ انہوں نے اس طرح کیا ہے کہ پڑھنے والے کو جب تک بتایا نہ جائے کہ یہ ترجمہ ہے، وہ کبھی از خود نہیں سمجھ سکتا،

وہ اپنے علمی، ادبی اور فکری کمالات کے ساتھ انسانی عظمت کے تمام پہلوؤں میں یکتائے روزگار تھے، اخلاق کی بلندی، کردار کی پاکیزگی، گفتار ورفتار کی سنجیدگی اور نرمی ان کا خاص وصف تھا، ان کو کسی نے کبھی کسی سے لڑتے ہوئے یا سخت کلامی کرتے ہوئے نہیں دیکھا، پاکبازی، خاموشی، حسن سلوک اور بڑی حد تک گوشہ نشینی اور خلوت پسندی میں وہ بے مثال تھے، بغض وحسد، کینہ وعداوت، نفرت وحقارت اور دوسرے تمام مذموم اوصاف سے وہ کوسوں دور تھے، وہ نہ کسی کو اپنے عمل یا کلام سے ایذا پہونچاتے تھے اور نہ کسی کی عیب جوئی اور غیبت کرنا اور سننا پسند کرتے تھے، ہمارا ان کا تعلق بہت بے تکلفانہ اور مخلصانہ تھا مگر کبھی انہوں نے کوئی ایسی بات نہیں کہی جس سے تعلقات پر کوئی اثر پڑ سکے، وہ کام کرنے والوں اور ذمہ داری کا احساس رکھنے والوں سے بہت خوش اور مطمئن رہتے تھے، کبھی کسی اپنے چھوٹے سے بھی حکم دیکر یا بڑا بن کر کوئی کام نہ لیتے، اور جو شخص بھی ان کا کوئی کام کر دیتا اس کے وہ ہمیشہ ممنون رہتے، وہ پرہیزگاری اور پاکبازی کا نمونہ تھے، کمزوروں کی مدد کرنا، غریبوں کے دکھ درد میں شریک ہونا اپنا اخلاقی فرض سمجھتے تھے اور بہت سے لوگوں کی وہ خفیہ طور پر مستقل مدد کیا کرتے تھے، کم سے کم کام زیادہ سے زیادہ حق المحنت دئے جانے کے داعی اور مبلغ تھے،

مئی کے آخری ہفتہ میں ریاض کی جامعۃ الامام محمد بن سعود کی طرف سے استاد زائر (Visiting Prophesor) کی حیثیت سے شام کے مشہور محدث و عالم جو جامعۃ الامام میں استاذ حدیث ہیں دارالعلوم میں دو ہفتے کے لئے اسلامی موضوعات پر لکچر دینے کے لئے تشریف لائے تو مولانائے مرحوم نے اپنا پورا وقت ان کے لکچروں سے استفادہ کرنے میں ایک طالب علم کی طرح گذارا اور وہ صبح سے شام تک دارالعلوم میں رہا کرتے تھے، میں کسی وقت البعث کے پروف وغیرہ کی اصلاح میں مشغولیت کے باعث درس میں نہ پہونچ سکا تو وہ گرفت کرتے تھے کہ تم کہاں رہ گئے۔ شیخ ۵ رجون ۷۹ء کو واپس تشریف لے گئے تو ہم سب لوگ ساتھ ہی ہوائی اڈہ ان کو رخصت کرنے گئے، واپسی کے بعد وہ دارالعلوم تشریف لائے اور دیر تک ہمارا ان کا ساتھ رہا، پھر میں ان کو رخصت کرنے کے لئے اس دن ڈالی گنج تک گیا، اس زمانے میں حضرت مولانا دامت برکاتہم اور مولانا معین اللہ صاحب نائب ناظم ندوۃ العلماء اور مولانا اسحٰق جلیس ندوی مرحوم پیام انسانیت کے سلسلہ میں کرناٹک کا دورہ فرما کر بمبئی تشریف لے گئے تھے — ان حضرات کو سفر کے وقت رخصت کرنے کے لئے ہم لوگ لکھنؤ کے چار باغ اسٹیشن گئے تھے، مگر افسوس کہ راستہ میں اس قدر بھیڑ بھاڑ تھی کہ ہمارا رکشہ کافی دیر میں اسٹیشن پہونچا اور مولانا اپنے عم معظم دامت برکاتہم کے آخری دیدار سے بھی محروم رہ گئے، اور حضرت مولانا کی واپسی سے پہلے ہی ۱۳ رجون کی صبح کو ناشتہ کے بعد اچانک پیٹ میں درد اٹھا اور آناً فاناً شام تک سب کچھ ہو گیا جس کی کسی کو توقع نہ تھی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ حضرت مولانا کو اطلاع کی گئی، بمبئی تشریف لا چکے تھے مگر لکھنؤ پہنچے تو سب کچھ ہو چکا تھا اور مولانا محمد میاں صاحب مرحوم اپنی آخری آرام گاہ تک پہونچ چکے تھے، ان للہ ما أخذ ولہ ما أعطیٰ، وکل شئ عندہ الیٰ أجل مسمی،

مارچ ۷۹ء کے اخیر میں ہمارا بھی خلیج، کویت اور سعودیہ کا سفر ہوا تھا[1] اور واپسی نصف مئی میں ہوئی تھی، اس کے بعد ہی سے برابر مجھے اپنی والدہ صاحبہ سے ملنے کی غرض سے وطن جانے کا تقاضا تھا، مگر یہ سفر ٹلتے ٹلتے ۱۲ رجون تک ٹلا۔ ۱۲ رجون کو ہماری ان سے حسب معمول ملاقات ہوئی دیر تک باتیں ہوئیں پھر ہم نے ان کو اپنے سفر کے ارادہ سے مطلع کیا اور خیال تھا کہ ایک ہفتہ میں واپسی ہو جائے گی، ان سے اچھی طرح مل کر رخصت ہوئے، کون جانتا تھا کہ یہی ہماری ان کی آخری ملاقات تھی، ابھی گھر پہونچ کر کپڑے بھی نہ بدل سکے تھے کہ فون کے ذریعہ حادثہ کی اطلاع ہوئی اور دل پر جو کچھ گذر گئی اس کا اندازہ کس کو ہو سکتا

[1] اس سے پہلے ۷۷-۱۹۷۶ء میں ہمارے سفر مصر کے موقع پر بھی مولانا مرحوم نے بڑے اہتمام سے رخصت کیا تھا اور اپنے مفید مشوروں سے نوازا تھا، اس سفر میں میں، مولانا سید محمد واضح صاحب ندوی ساتھ تھے، دوانِ سفر انہوں نے دل چسپ خطوط لکھے اور اپنے گراں قدر مشوروں سے نوازا۔

ہے۔ اسی وقت الٹے پاؤں لکھنؤ بذریعہ ٹیکسی واپس آیا، جنازہ رائے بریلی جا چکا تھا، سیدھا وہاں گیا تو میرے عزیز و معزز دوست ہمیشہ کے لئے ہم سے جدا ہو چکے تھے اور اپنی آخری آرام گاہ تک پہونچ چکے تھے، انا للہ وانا الیہ راجعون،

اتفاق سے مولانا مرحوم کے گھر کے لوگ (اہل خانہ) بھی اس زمانے میں لکھنؤ سے رائے بریلی کئی ہفتے پہلے جا چکے تھے، مرحوم نے بارہا مجھ سے کہا تھا کہ میں رائے بریلی جانا چاہتا ہوں مگر برابر کوئی نہ کوئی رکاوٹ پیش آجاتی ہے، ان کا خیال تھا کہ حضرت مولانا کی باہر کے سفر سے واپسی پر وہ ساتھ ہی رائے بریلی جائیں گے، مگر اللہ تعالیٰ کو کچھ اور ہی منظور تھا، کون جانتا تھا کہ وہ ہمیشہ کے لئے وہاں چلے جائیں گے اور کسی سے بھی ملاقات اب نہ ہو سکے گی، یہانتک کہ اہل خانہ کو اچانک اس حادثہ کا علم جنازہ کے رائے بریلی پہنچنے سے کچھ دیر پہلے ہی ہوا، ان سب لوگوں کے دلوں پر کیا کچھ گذر گئی ہوگی اس کا اندازہ کون کر سکتا ہے، اگر اللہ تعالیٰ کی حکمت و مصلحت پر یقین نہ ہوتا اور اللہ کی طرف سے صبر میسر نہ آتا تو ایسے حادثہ پر کون صبر کر سکتا تھا، وہ کون سا وقت ہو سکتا ہے جس میں ان کی یاد نہ آئے، ان کی بہترین یادوں کے نقوش لوح قلب پر اس طرح نقش ہیں کہ کسی طرح مٹانے سے بھی وہ نہیں مٹ سکتے،

یذکرنی طلوع الشمس صخرا — واذکرہ لکل غروب شمس

فلولا کثرۃ الباکین حولی — علی اخوانھم لقتلت نفسی

خنساء نے تو یہ شعر اپنے بھائی کے متعلق کہا تھا، مگر میں اسکو اپنے دوست کے لئے پڑھ رہا ہوں جسمیں بڑی حد تک میرے سوگوار جذبات کی ترجمانی ہے۔

یہ ایک مختصر حکایت ہے اس مرد مومن کی ورنہ ۲۶ سال کی مسلسل رفاقت کا حق چند صفحات میں ادا ہونا بہت مشکل ہے[1]۔ امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ رحمت و مغفرت کا بہترین معاملہ فرمایا ہوگا اور وہ ان کی رحمتوں کے سایے میں راضی و مسرور ہوں گے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو صحیح اسلام پر زندہ رکھے اور ایمان و عمل صالح پر خاتمہ نصیب فرمائے۔ (آمین)

[1] انکی سوانح حیات پر مفصل کتاب مولانا محمد ثانی صاحب ندوی تصنیف فرما رہے ہیں جس کے عنقریب شائع ہونے کی امید ہے۔ مرحوم کی زندگی کے حالات و واقعات کے بہت سے اہم پہلو اس مختصر سے مضمون میں آنے سے رہ گئے، جس کا افسوس ہے۔

محمد حسنی

لوح وقلم[1] جن کے لئے نوحہ کناں ہیں

مولانا سید محمد واضح رشید ندوی

انتقال سے تقریباً ڈیڑھ ماہ قبل ایک شام کو ہم اور محمد میاں مرحوم حسب معمول گفتگو کر رہے تھے دن کی علمی اور تعلیمی مصروفیات، ملاقاتیں، عربی اخبارات کے تبصرے اور عالم اسلامی کے مسائل زیر بحث تھے۔ اسی شام کو جب ہم دونوں بے تکلف گفتگو میں مشغول تھے۔ محمد میاں مرحوم نے متمم بن نویرہ کے مشہور مرثیہ کے اشعار کے بارے میں کچھ استفسار کیا جو اس نے اپنے بھائی کے انتقال پر کہا تھا۔ وہ اشعار یہ ہیں۔

وکنا کندمانی جذیمة حقبة	من الدھر حتی قیل لن یتصدعا
فلما تفرقنا کانی ومالکا	لطول اجتماع لم نبت لیلة معا
فتی کان أحیی من فتاة حییة	واشجع من لیث اذا ما تمنعا

(مدتوں ہم لوگ جذیمہ کے ندیموں کی طرح ساتھ رہے۔ یہاں تک کہ یہ کہا گیا کہ یہ لوگ ایک دوسرے سے کبھی جدا نہ ہوں گے اور جب ہم بچھڑ گئے تو طول مصاحبت کے باوجود ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں نے اور مالک نے ایک رات بھی ساتھ بسر نہیں کی۔ میرا بھائی دوشیزہ سے زیادہ باحیا، اور شیر سے زیادہ بہادر اور خوددار تھا)۔

آج مجھے یاد آتا ہے کہ اس رات یہی اشعار موضوع گفتگو تھے، پھر گفتگو کا رُخ ام المومنین حضرت عائشہؓ کا ان کے بھائی کے انتقال پر ان اشعار سے تسکین حاصل کرنے اور امیر المومنین حضرت عمرؓ کا اپنے بھائی زید بن خطاب کے مرثیہ کے لئے متمم بن نویرہ سے فرمائش کرنے اور ابن نویرہ کے مرثیہ کہنے (جس سے حضرت عمرؓ کا غم دور ہوا) کی طرف مڑ گیا۔ پھر یہ سلسلۂ کلام دراز ہو کر جذیمہ کے ندیم اور ان کے بارے میں عربی ادب کے تاریخ نویسوں کے اختلاف تک پہنچا۔ محمد میاں کو ابن نویرہ کے ان اشعار کی اپنے

[1] اس سے مراد قلم و قرطاس ہے جن سے انہوں نے بہت کام لیا۔

ایک مضمون میں ضرورت تھی، اور میرے حاشیہ خیال میں بھی یہ نہ تھا کہ عنقریب ہم لوگ ہی ان اشعار کا مصداق بنیں گے اور میں اپنے اس عزیز ترین بھائی کی جدائی پر غم واندوہ کے اظہار کے لئے انہی اشعار کا سہارا لوں گا، اور ان کے انتقال پُر ملال پر آنسو بہاؤں گا اور کون ہے جو اس حادثہ کے بعد آنسو روک سکے۔ عربی شاعر کہتا ہے۔

ولیس لعین لم یفض ماءھا عذر

(جس آنکھ سے آنسو نہ ٹپکے ہوں اس کا کوئی عذر قابل قبول نہیں ہے)

جن لوگوں نے برادر عزیز محمد میاں کو قریب سے دیکھا ہے یا ان کی تحریروں سے استفادہ کیا ہے، ان سب کے لئے ان کی وفات ایک المناک حادثہ ہے۔ ان کی تحریر کی تاثیر سے سب واقف ہیں لیکن انکی گفتگو میں جو کشش اور تاثیر تھی اس کا اندازہ وہی لگا سکتا ہے جس کو ان سے ملنے اور بے تکلف گفتگو اور مشورہ کرنے کا موقع ملا ہو اور جو ان کی ساحرانہ شخصیت اور دلنواز مسکراہٹ سے واقف ہو، پھر وہ شخص جو ان کے ساتھ مستقل رہا ہو اور تا حین حیات ان کا رفیق کار رہا ہو اس کا ان کے فراق پر حسرت اور حزن و ملال کا کیا عالم ہوگا۔

محمد میاں کا ۴۴ سال کی عمر میں انتقال ہوا لیکن اصابت فکر، استقامت، سخاوت اور روزمرہ کی زندگی میں لغویات سے بعد و اجتناب میں وہ اس مقام تک پہنچے ہوئے تھے جس کی اکثر سن رسیدہ اور تجربہ کار لوگ تمنا ہی کرتے رہ جاتے ہیں۔ اپنی ان خصوصیات و کمالات میں جو انہیں بچپن سے پائے جاتے تھے وہ اپنے معاصرین سے بہت فائق تھے۔ اللہ والوں کے سے ان کے اخلاق تھے۔ اپنے ساتھیوں اور عزیزوں کی فروگذاشتوں کو انگیز کر لینا ان کا شیوہ تھا جس کے سبب وہ سب کے محبوب و ہر دلعزیز تھے۔ جو شخص ان سے ملتا اس کے اکرام و احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے بڑی خندہ پیشانی سے ملتے، اس کے قیمتی وقت کی پوری رعایت کرتے۔ وہ خوددار و غیور تھے بڑوں کی تعظیم کرتے اور چھوٹوں سے محبت کا معاملہ کرتے۔ ان کے احساسات کو ٹھیس پہنچانے سے گریز کرتے، کیونکہ یہ ان کے نزدیک ناقابل معافی جرم تھا۔ گھر کے چھوٹے بڑے سبھی افراد ان کے ساتھ محبت اور احترام سے پیش آتے۔ اسی طرح وہ چھوٹے بڑے، طلبہ و اساتذہ دوست و احباب سب کو محبوب اور اس کے ہمراز و دم ساز تھے۔

محمد میاں اپنے اہل وعیال اور ہر تعلق رکھنے والے کے ساتھ بڑے خلوص ومحبت سے پیش آتے ان کی ہمت افزائی کرتے، خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار اور ان کی آبیاری کرتے۔ ہر ایک کے مسائل سے دلچسپی لیتے اور صبر و دلچسپی سے اس کی گفتگو سنتے اور مشورہ دیتے اور اگر کسی تعاون کی ضرورت ہوتی تو پورا تعاون کرتے ان کے حوصلے بلند کرتے، اس میں اس کی رہنمائی کرتے، صلاحیتوں کو ابھارتے، اور کام کرنے کے میدان اس کے لئے تلاش کرتے۔ یہی سبب ہے کہ سب کے نزدیک وہ قول وعمل کی جامعیت دل کی نورانیت، عقل ودانش کی روشنی اور بصیرت کی تابانی کی جیتی جاگتی مثال بن گئے، اس کے ساتھ ساتھ اپنے کام میں پورا انہماک واستغراق تھا، اور لایعنی باتوں سے احتراز واجتناب۔ مشورہ اور مسائل کو حل کرتے وقت ان کا رویہ ہمیشہ مثبت ہوتا، سلبی تصور اور مداخلت سے ان کو مناسبت نہیں تھی۔

ہم دونوں کی پرورش ایک ہی گھر میں ہوئی۔ ان کے والد ڈاکٹر حکیم سید عبد العلی صاحب حسنیؒ میرے ماموں تھے، ہم دونوں نے عربی زبان ایک ساتھ سیکھنا شروع کیا اس فرق کے ساتھ کہ میں ندوۃ العلماء کا طالب علم تھا اور وہ اپنے والد کے مثالی مدرسہ کے قلیل مدت میں انہوں نے تعلیم مکمل کرلی۔ اپنے والد کی مثالی علمی وفکری رہنمائی میں وہ آگے بڑھتے رہے۔ اس پوری مدت میں وہ باوقار، خوددار، اور اپنے والد کے حد درجہ اطاعت شعار رہے۔ سولہ سال کی عمر میں عربی انشاء پردازی شروع کی پھر ندوۃ العلماء کے کبار اساتذہ اور مشائخ سے ایک سال تک علم حدیث اور دوسرے اسلامی علوم میں استفادہ کیا۔ اس اثناء میں وہ عربی میں مضامین لکھتے رہے یہاں تک کہ اسلامی رنگ کے انشاء پردازوں اور ادباء کی صف میں خاص امتیاز کے مالک بن گئے۔ ان کے مقالات توجہ سے پڑھے جانے لگے[1] وہ جو کچھ لکھتے وہ ان کے دل کی آواز ہوتی شہرت اور ناموری سے ان کو کوئی مناسبت نہ تھی۔ ان کے مقالات پڑھنے والے اور ان کی شخصیت اور فکر سے متاثر ہونے والے ان سے ملاقات کے شائق ہوتے مگر وہ اکثر ملاقاتوں سے گریز کرتے۔ تواضع اور انابت الی اللہ کے ساتھ اپنے کام میں مصروف رہتے۔ ہمیشہ اپنی نیت کا محاسبہ کرتے رہتے اور

[1] ان مقالات کا پہلا مجموعہ "الاسلام المتحن" کے نام سے مصر سے شائع ہوا اور دوسرا ایڈیشن ہندوستان سے شائع ہوا۔ دونوں ایڈیشن جلد ختم ہو گئے اور اس نے نوجوانوں کی فکر اور زندگی پر گہرا اثر ڈالا۔

ہر طرح کی آلودگی سے اس کی حفاظت کرتے۔ چند سال پہلے صالحین اور مجاہدین کی سیرت کے مطالعہ سے ان پر اس احتساب کا ایسا غلبہ ہوا کہ انہوں نے تزکیۂ وتربیت نفس کے لئے لوگوں کے ساتھ زیادہ اختلاط سے اجتناب کا ارادہ کرلیا تھا۔ ان کے ذہن میں اکثر یہ سوال پیدا ہوتا اور مجھ سے اکثر تذکرہ کرتے، ایک روز مجھ سے کہنے لگے تاریخ میں صرف انہی حق پرستوں کی اصلاحی خدمات کا تذکرہ ملتا ہے جنھوں نے اپنی زندگی کا ایک عرصہ اپنے نفس کی تربیت واصلاح میں گذارا۔ دعوت کا مرکز داعی کا قلب ہے اس لئے اس کے دل کو آئینہ کی مانند صاف وشفاف ہونا چاہیئے۔ ان کو اہل حق اور اہل قلوب سے بہت تعلق اور قلبی مناسبت تھی ان کی خدمت میں وقت گزارنے اور استفادہ کرنے کی جستجو رہتی، خاص اوقات میں خاص طور سے بعد مغرب اکثر گھنٹوں تدبر وتفکر میں گزارتے۔ اصلاح نفس، اخلاص عمل اور حسن نیت کے لئے ہر وقت کوشاں رہتے تھے اور اپنے ساتھیوں اور عزیزوں کو بھی اس رنگ میں دیکھنا چاہتے تھے لغویات سے اجتناب کرتے، باہم طنز ومزاح خواہ وہ صرف تفریح ہی کے لئے کیوں نہ ہو اور عیب جوئی سے احتراز کرتے اور اپنے رفقاء کو اس کی طرف متوجہ کرتے۔ اگر وہ کسی مجلس میں ہوتے اور لوگ ایسی گفتگو شروع کرتے جو ان کے ذوق ووجدان پر گراں ہوتی تو وہ خود ہی اس مجلس سے خاموشی یا کوئی عذر پیش کرکے اٹھ جاتے یا خاموشی اختیار کرلیتے اس طرح اکثر گفتگو کا رخ بدل جاتا اور کسی کو دل شکنی بھی نہ ہوتی۔ لوگوں کے محاسن تلاش کرنا اور کمالات کی بنیاد پر ان سے تعلقات استوار کرنا ان کی طبیعت ثانیہ تھی اسی لئے مختلف اور جدا جدا افکار وخیالات رکھنے والے اختلاف رائے وفکر کے باوجود ان کے شناسا اور ان سے متعارف تھے۔ ان سے تعلق رکھتے تھے اور اپنے معاملات میں ان سے مشورہ لیتے تھے۔

محمد میاں نے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز ۲۵ سال قبل ۱۹۵۰ء میں خال معظم حضرت مولانا مدظلہ کے ایک کتابچہ "صورت وحقیقت" کے عربی ترجمہ سے کیا۔ اس ترجمہ نے علمی حلقوں میں بڑی مقبولیت حاصل کی کیونکہ ان کا اسلوب اصل روح سے ہم آہنگ تھا بحیثیت انشاء پرداز عربی زبان میں یہ ان کی ابتدا تھی پھر انہوں نے مولانا مدظلہ کے بہت سے مقالات کا اردو سے عربی اور عربی سے اردو میں ترجمہ کیا، اسی کے ساتھ ساتھ خود بھی چند مقالے تحریر کئے جو سلامت فکر اور اصابت رائے کے آئینہ دار ہیں۔ بیسویں سال میں قدم رکھتے رکھتے وہ علم وادب کے حلقوں میں مشہور ومعروف ہو چکے تھے۔ انشاء پردازی میں

ان کا اسلوب دوسرے ادباء کے اسالیب کے مقابلہ میں لفظ و معنی کے جمال کی جامعیت، عقل و قلب پر اسکی قوت تاثیر، ضمیر کی بیداری اور اصابت فکر و صحت مقصد کے سبب، اور ترجمہ میں باریک بینی اور امانت داری کے سبب ممتاز و جداگانہ ہے۔ ان کو عربی اور اردو دونوں زبانوں میں درجۂ امتیاز حاصل تھا کہ ان کی تحریر لفظی روانی اور معنوی چاشنی کی غماز تھی۔ ان کی دوسری خصوصیت یہ تھی کہ وہ بیک وقت ترجمہ و تالیف اور سنجیدہ و دقیق علمی تحریر اور جذباتی اور قلب و دماغ کو اچک لینے والی تحریر دونوں کے جامع تھے ان کے اسلوب کا کمال یہ تھا کہ وہ دل پر احساس ہوئے بغیر اثر کر جاتا تھا پھر فکر و خیال پر اثر ڈالتا، اس پر تابندہ نقوش چھوڑتا اور اس کو عمل پر ابھارتا تھا۔

ایک روز میں نے ان سے سوال کیا، تمہاری تحریر ماموں جی مدظلہ، کی تحریر و فکر سے بہت مشابہ ہے اس کا کیا راز ہے ایک دوسرے کا کلام مشابہ ہوتا ہے لیکن اتنا مطابق ہونا کہ امتیاز مشکل ہو جائے اسالیب کی تاریخ میں کم ملتا ہے۔

انہوں نے جواب دیا کہ میں نے بچپن ہی سے چچا میاں کی اہم تصانیف کا گہرا مطالعہ کیا، اس حال میں ایک مثالی شخصیت کی حیثیت سے ان کی محبت میرے دل میں گھر چکی تھی۔ ان کے لکھے ہوئے لفظ پر میں غور کرتا اور اس کی ادبیت سے لطف اندوز ہوتا اور اس کو ادا کرنے کی فکر کرتا، اس لئے ان کا طرز تحریر اور اسلوب میرے ذہن و دماغ میں رچ بس گیا میرے خام و ناپختہ ذہن میں ان کی پختہ اور صحیح فکر نے گھر کر لیا، اس کے بعد انہوں نے عربی کا یہ شعر پڑھا ؎

أتاني هواها قبل أن أعرف الهوىٰ فصادف قلبا خاليا فتمكنا

(محبت کے عرفان سے پہلے اس کی محبت نے مجھے تاکا تو اسے ایک خالی دل ملا جو اسکا نشیمن بن گیا)

انہوں نے بالکل سچ کہا۔ مولانا مدظلہ، اور محمد میاں کی تحریریں پڑھنے والا ہر شخص اس کا اعتراف کریگا سب سے زیادہ جس بات نے محمد میاں کو اس صفت سے متصف کیا وہ مولانا ندوی مدظلہ، کی ہر تحریر پر ان کا بھرپور اعتماد اور اس کا صحیح استعمال ہے۔ اسلوب کی روانی، اس کی سحر انگیزی، نوجوانوں کے ایمانی جذبات کی برانگیختگی، ان کی نفسیات کی رعایت دعوتی طریقۂ کار سے واقفیت، اور عالم اسلام کے حالات پر گہری نظر غرض ہر چیز میں انھوں نے مولانا ندوی کے مکتبۂ فکر سے خوشہ چینی کی اور ان کی فکر اور اسلوب کے آئینہ دار

بن گئے بلکہ ان کے عزم و قوت اور جولانی طبع نے ان میں مزید گرمی اور قوت پیدا کر دی۔

محمد میاں نے ۱۹۵۵ء میں مجلہ البعث الاسلامی کا اجراء کیا وہ زمانہ اشتراکیت کے طوفان اور عرب قومیت کے فتنہ کے عروج کا زمانہ تھا اور ان نظریاتی اور فکری طوفانوں کا شکار زیادہ تر نوجوان تھے۔ انہوں نے اپنے اداریوں میں نوجوانوں کو مخاطب کیا۔ البعث الاسلامی کے مقاصد کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں، جس سے نوجوانوں کو متوجہ کرنے کی ضرورت اور اہمیت ظاہر ہوتی ہے۔

"موجودہ زمانہ میں مسلمان نوجوانوں کو اللہ پر ایمان، اس کے پیغام پر ناز و افتخار اور مستقبل پر اعتماد کی ضرورت ہے۔ ان کو سب سے زیادہ اتحاد و اتفاق کی ضرورت ہے اس طرح کہ باطل کے سامنے سب کے سب ایک اکائی بن جائیں مسلمان نوجوانوں کو علم و ادب کے خوشگوار آمیزہ کی ضرورت ہے ان کے ذہن و دماغ میں دنیا کی سب سے قیمتی متاع ان کا دین و ایمان ہونا چاہیئے۔

عرب نوجوانوں کو خاص طور سے عربی صحافت پر توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔

ہندوستان کے ترقی پذیر ادب کو صحیح علمی، ادبی، ثقافتی اور دینی رہنمائی کی ضرورت ہے۔ موجودہ نسل، دینی مدارس کے طلبہ اور مسلمان نوجوانوں کی یہ سب سے اہم ضرورت ہے۔ ایک ایسے وقت میں جس میں اسلام کو ہزاروں اہل قلم اور زبان شناس ادباء کی ضرورت ہے مسلمان نوجوان خواب غفلت میں مدہوش ہیں۔ دینی مدارس کے طلبہ جن کو زمام کار سنبھالنا چاہیئے تھا اور امت کی قیادت کرنی چاہیئے تھی وہ اسلامی قافلہ کی سب سے آخری صف میں نظر آتے ہیں۔ یہ دور ظلمت اب ختم ہونا چاہیئے اور ہم کو نئے سرے سے نئی زندگی کا آغاز کرنا چاہیئے۔"

البعث الاسلامی کے مقاصد بیان کرتے ہوئے انہوں نے اسی افتتاحیہ میں لکھا کہ "یہ رسالہ قاہرہ اور بیروت کے رسالوں کی طرح نہیں ہے جو ادب سے کھیلے اور مغربی آقاؤں کے گیت گایا کرے اور جس کو سوائے مدح و ثنا کے اور بادشاہ و امراء کا کلمہ پڑھنے کے اور کچھ نہ آتا ہو۔ البعث الاسلامی ایک دعوتی رسالہ ہے جس کا اپنا مقصد ہے اور اپنے اصول ہیں۔"

محمد میاں نے اپنے رسالے کو اسی نہج پر جاری رکھا اور البعث کا خصوصی نمبر "نحو التکوین الاسلامی الجدید" (نئی اسلامی تعمیر کی طرف) تک جو ان کے ہاتھ سے نکالا ہوا البعث کا آخری نمبر ہے اسی نہج کی نمائندگی کرتا ہے۔

انقلابی دور میں البعث الاسلامی نوجوانوں کا صحیح رہنما اور قائد تھا وہ ان کی ہمت افزائی کرتا، نئے بتوں کو توڑتا اور بھرپور عزم و حوصلہ اور بلندی کے ساتھ اسلام کی دعوت دیتا۔ اس طرح البعث عہد استبداد وجور میں زخموں سے چور اسلام پسندوں کے لئے مرہم کا کام کرتا تھا۔ اسلامی صحافت اس عظیم الشان خدمت کو فراموش نہیں کرسکتی جو الحاد و تشکیک بھرے زمانہ میں اس نوجوان ادیب نے اپنی قدرتی صلاحیتوں، پرسوز دل، جوش و جذبہ اور رواں دواں قلم کے ذریعہ انجام دی ہے، اس نے عرب قومیت کے علمبرداروں کی راتوں کی نیند حرام کردی۔ بلاشبہ ان کی تحریریں اس باضمیر اسلامی صحافت کے لئے مہمیز ثابت ہوئیں جو گذشتہ سالوں میں وجود میں آئی۔ جب استعماری طاقتوں نے اسلامی صحافت کی بیخ کنی شروع کی تو تنہا محمد الحسنیؒ کے قلم نے ان کی خبر لی۔ اس جدوجہد اور قلمی جہاد میں ان کے رفیق کار اور ان کے دوست مولانا سعید الرحمٰن صاحب ندوی تھے۔ دونوں کے درمیان گہرا تعلق تھا جو تاحیات باقی رہا۔

محمد میاں نے البعث کے اجراء ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے آل اسلامک ورلڈ لیگ (رابطہ اسلامیہ) کے قیام کی دعوت دی اور اندرون و بیرون ہند تمام جامعات اور مدارس کے نوجوانوں کی توجہ اس کی طرف مبذول کی اس لئے کہ انھیں یقین تھا کہ اسلامی ثقافت سے آراستہ مسلمان نوجوان ہی اسلامی انقلاب کا علم بلند کریں گے جیسا کہ انہوں نے البعث کے پہلے اداریہ میں لکھا ہے یہ فکر انہوں نے اس دور میں پیش کی جب کہ مسلمان نوجوان حیران و سرگرداں تھے۔

البعث کے اجراء کے سلسلہ میں پیش آمدہ رکاوٹیں ان کے عزم و حوصلہ کو کمزور نہ کرسکیں نہ ہی انھوں نے اپنی راہ بدلی بلکہ وہ ایک جانباز بہادر کی طرح ڈٹے رہے جو اپنی تلوار کو تیز کر کے میدان جنگ میں بے خوف و خطر کود پڑتا ہے۔ انھیں کامل اعتماد تھا کہ حق سربلند رہتا ہے سرنگوں نہیں۔ ان کا یہ اعتماد مشاہدہ اور چشم دید چیزوں پر اعتماد سے کم نہ تھا۔ عرب ممالک میں پائی جانے والی مغرب سے مسحور زندگی کی وہ ایسی تصویر کشی کرتے کہ مصر اور دوسرے عربی ممالک کے نوجوان جو اس تہذیب کے مضر اثرات کو اپنی آنکھوں

سے دیکھتے تھے انگشت بدنداں رہ جاتے انھیں ایسا لگتا تھا گویا اس زندگی کا عرصہ تک وہ تجربہ کرچکے ہوں۔ یہ تصویر کشی بغیر مشاہدہ کے ممکن نہ تھی، مگر ان کی بصیرت اور قوت ادراک دوسروں کی نگاہ اور مشاہدہ پر غالب تھی، ان کی تحریر عرب شاعر کے اس قول کی مصداق تھی:۔

"ہم اپنی بصیرت سے وہ سب کچھ دیکھ لیتے ہیں جو نگاہیں نہیں دیکھتیں"

مولانا محمد الحسنیؒ کا قلم شمشیر کے مثل تھا۔ انہوں نے دنیا پر یہ ثابت کر دکھایا کہ کبھی قلم تیر و تفنگ کا کام کرجاتا ہے حضرت حسان کا مشہور مصرعہ ہے ؎

ویبلغ ما لایبلغ السیف مذودی

(میری زبان وہ کام کرجاتی ہے جو تیر و تفنگ سے ممکن نہیں)

دوسرے ادباء اور انشا پردازوں کی طرح محمد میاں کا قلم محض بے باک و ناقد نہ تھا بلکہ وہ باوقار اور متین و سنجیدہ بھی تھا۔ چنانچہ اپنے ہر مضمون میں وہ تنقید و تبصرہ کے ساتھ مسئلہ کا حل اور اس کا علاج بھی پیش کرتے تھے اور ایک ذمہ دار ادیب کا یہی فرض ہے کہ وہ حالات و نتائج کا صحیح اندازہ لگائے اور اپنے قارئین کو دوراہے پر نہ چھوڑے، نہ ہی ان کے فرائض و ذمہ داریوں کی صراحت کیے بغیر ان کے جذبات و احساسات کو سرد ہونے دے۔ مولانا محمد میاںؒ کی پختہ فکر وسیع اور متوازن ذمہ دارانہ تحریر کا سب سے عمدہ نمونہ ان کا آخری مضمون ہے جو انہوں نے "جامعۃ البعث الاسلامی" کے عنوان سے تحریر کیا۔ اس مضمون میں انہوں نے تعلیم و تربیت اور مستقبل کے باشعور و ذمہ دار افراد ڈھالنے کا ایک وسیع خاکہ پیش کیا ہے کیونکہ وہ سمجھ چکے تھے کہ وہ دور بہت قریب ہے اور جلد ہی ظہور پذیر ہونے والا ہے۔

محمد میاں دعوت، جہاد اور تربیت کی کوششوں کے بارے میں بڑے پُرامید تھے دوسری طرف اللہ سے غایت درجہ ڈرنے والے اور پرہیزگار تھے۔ اپنے والد اور عم مکرم مولانا ندوی کی رہنمائی اور صحیح اسلامی دینی تربیت نے انھیں کندن بنا دیا تھا وہ دعوت کا کام کرنے والوں کے لئے خواہ جوان ہوں یا بوڑھے نمونۂ عمل تھے۔ اسلامی دعوت کے کاز کے لئے انہوں نے صحافت اور نشر و اشاعت کو اپنا میدان عمل بنایا اور اس پر ساری توجہ مرکوز کردی۔ بغیر کسی کی ملامت کی پرواہ کئے ہوئے وہ آزادانہ اپنا رول ادا کرتے رہے۔ مصائب نے ان کا منھ نہ موڑا نہ ہی کسی لالچ یا خوف نے انھیں اپنے مشن سے باز رکھا۔ انہوں نے

جب مصر میں بیداری کی لہر محسوس کی تو مصر کو اس کے نئے دور کے آغاز پر سب سے پہلے مبارکباد پیش کی اسی طرح ممالک خلیج اور سعودی عرب میں جب انہوں نے دیکھا کہ لوگ خوشحالی اور عیش کوشی میں غرق ہیں تو ان کے اخلاص اور ذمہ دارانہ احساس کو گوارا نہ ہوا اور انہوں نے ایک نہایت دردمندانہ مضمون "سؤال حاضر یحتاج الیٰ جواب" کے عنوان سے سپرد قلم کیا، اس پر خاص نمبر نکالا جو ان کی حیات کا آخری نمبر ہے۔

نشر و اشاعت کے ذریعہ اسلامی دعوت کے سلسلہ میں ان کے جوش و خروش اور لگن کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ بیک وقت چار رسالوں (دو اردو اور دو عربی) میں انہوں نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں طاقتور مضامین لکھنے شروع کئے اور یہ مضامین وہ اکثر بغیر فرمائش کے لکھتے اس لیے کہ دعوت کے لیے فرمائش کی ضرورت نہیں، وہ تو قلب کا تقاضا اور دل کی تڑپ تھی جو ان کو مضامین لکھنے پر آمادہ کرتی۔ اگر یہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ اکثر قارئین محض ان کے مقالات کے سبب ان رسالوں کے خریدار تھے۔ اس پر مستزاد یہ کہ وہ مولانا ندوی کی کتابوں کا اردو ترجمہ اور ذاتی تصنیف و تالیف بھی کیا کرتے تھے بیس سے زائد عربی کتابوں کا انہوں نے اردو یا عربی میں ترجمہ کیا۔

جلسوں اور کانفرنسوں میں شرکت سے محمد میاں کو زیادہ مناسبت نہ تھی وہ اکثر گریز کرتے اس لیے کہ وہ اس کو اپنے لیے رکاوٹ سمجھتے تھے، وہ اپنے آپ کو اس میدان کا آدمی ہی نہیں سمجھتے تھے، اس لیے عموماً وہ کانفرنسوں میں شرکت سے معذرت کر دیتے تھے۔ آخری دنوں میں انھیں قبرص کی اسلامی صحافتی کانفرنس اور ماسکو کی اسلامی کانفرنس میں شرکت کا دعوت نامہ ملا مگر انہوں نے معذرت کر دی دراصل وہ سکون کے ساتھ کام کرنے کے قائل تھے۔ پس پردہ وہ بڑی سے بڑی کانفرنس کی تنظیم کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے، ندوۃ العلماء کے تعلیمی جشن کا خاکہ بنانے اور دوسری کارروائیوں کی تکمیل میں ان کا بڑا حصہ رہا ہے، یہی حال ان کا دوسری تنظیموں کے ساتھ تھا وہ ہر ممکن شکل میں اسلامی مسائل کو حل کرنے میں لگے رہتے تھے بہت سی مسلم رفاہی تنظیموں کے قیام اور غیر سودی بنکوں کے وجود میں ان کا عملی حصہ تھا لیکن یہ ساری جدوجہد پردہ کے پیچھے سے تھی۔ بہت سے دینی اور علمی اور دعوتی کاموں میں ان کی شرکت کو سوائے ان کے اور مالک حقیقی کے جو سمیع و علیم ہے کوئی نہیں جانتا، بعض خدمات کو صرف صاحب تعلق ہی جانتے ہیں جن کا ان سے براہ راست واسطہ پڑا تھا۔

محمد میاں اگرچہ علمی حلقوں میں ایک متحمس و فعال نوجوان اور صاحب اسلوب قلم مدیر البعث الاسلامی کی حیثیت سے مشہور ہوئے لیکن ان کی ان وسیع خدمات کی وجہ سے جب چند گھنٹہ کے اچانک مرض کے بعد ان کی وفات کی خبر پھیلی تو اس حادثہ کا اثر متعدد اسلامی تحریکوں اور دینی و ملی سرگرمیوں پر پڑا اور ان کی وفات کو امت کا بڑا خسارہ تصور کیا گیا۔

قول و عمل میں اعتدال و ہم آہنگی، فکر میں گہرائی و گیرائی، حقوق اللہ اور حقوق العباد کی رعایت و حفاظت، ہر مسلمان کا اکرام، اور اس کے ساتھ معاملہ کی پاکیزگی اور تعلقات میں ترقی و سنجیدگی مرحوم کی بنیادی خصوصیات تھیں اور آج انہی خصوصیات کا موجودہ ادبار اور انشا پردازوں میں خصوصاً نوجوانوں میں فقدان ہے۔

اللہ تعالیٰ ان پر رحمت نازل فرمائے اور ان کو بہتر سے بہتر بدلہ نصیب فرمائے۔ آمین

(عربی سے ترجمہ، از سید محمد ظفر ندوی)

ایمان کا کرشمہ

اسی ایمان کے ذریعہ ربعی بن عامر رستم کے دربار میں گئے جعفر بن ابی طالب نجاشی کے دربار میں گئے دحیہ کلبی رومی سلطنت میں داخل ہوئے محمد فاتح نے قسطنطنیہ فتح کیا اور مجدد سرہندی اکبر کے دربار میں پہونچے، مثالیں بہت اور لاتعداد ہیں تاریخ قدیم و جدید دونوں اس سے مزین ہے۔

(مولانا محمد الحسنی ندوی مرحوم)

محمد الحسنی — میرا بھائی

ڈاکٹر محمد اشتیاق حسین قریشی

کسی ایسی شخصیت کا تذکرہ چند سطروں میں سمیٹنا جس کے ساتھ بیس سال گزرے ہوں بہت مشکل کام ہے نہ اس کے ساتھ انصاف اور نہ قارئین کے ساتھ۔ پھر ایسا ہمدم اور رفیق جو عزیزوں سے زیادہ محبوب ہو اور جس کے ساتھ شب و روز گزرے ہوں، سفر حضر ہر جگہ ساتھ رہا ہو، مکہ مکرمہ، منیٰ عرفات مسجد نبوی سے لے کر خدا معلوم کتنے مواقع ایسے آئے جب ہم صرف دونوں ہوئے صرف ایک قدر مشترک "اسلام کی سربلندی" پیار محبت دلسوزی اور دردمندی کے ان لمحات کا خیال آتا ہے تو بس ایک خواب معلوم ہوتا ہے۔

انھیں لوگ مولانا علی میاں کے بھتیجے ڈاکٹر عبدالعلی صاحبؒ کے صاحبزادے، تعمیر حیات، اور البعث الاسلامی کے ایڈیٹر ایک ادیب اور صحافی کی حیثیت سے جانتے ہیں لیکن وہ کچھ اور ہی تھے۔ ساری زندگی ان کی شخصیت پر معصومیت، دلنوازی، سادگی اور تصنیف و تالیف کے پردے پڑے رہے عام طور پر یہ دستور ہے کہ جب کبھی ایسی شخصیت کا تذکرہ لکھا جاتا ہے تو ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ وہ کوئی مافوق الفطرت شخصیت ہے یا اس کی کمزوریاں اتنی نمایاں کی جاتی ہیں کہ خوبیوں کو شرم آنے لگتی ہے۔ اگر ان میں دو کمزوریاں نہ ہوتیں تو وہ اپنی اس کم عمری میں دنیائے اسلام کی سحر انگیز ممتاز ترین اور طاقتور ترین شخصیت کی حیثیت سے ابھرتے۔ اور پورے عالم اسلام پر چھا جاتے، ایک سفر کرنے سے وحشت دوسرے تقریر کرنے سے عدم مناسبت۔

ان کی عبقریت میں دراصل اسلام کے احیا و تجدید کی وہ روح کارفرما تھی جو کسی ملک تک محدود نہیں رہنا چاہتی، ان میں اپنے اسلاف کا وہ جوہر سمٹ آیا تھا جو دعوت و جہاد کا مرکب تھا۔ وہ پوری زندگی سرحد اسلام کے محافظ اور نگراں کا رول ادا کرتے رہے۔ تلوار کا کام قلم کی نوک سے لیا اور خون جگر کی

روشنائی پوری بے جگری اور دل سوزی سے اس راہ میں صرف کرتے رہے "خنجر چلے کسی پر تڑپتے ہیں ہم امیر" کا وہ حقیقتاً مصداق تھے۔

ناصری فتنہ جس نے آندھی طوفان کی طرح پورے عالم اسلام کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا دانشوروں کے قلم، پریس و صحافت سب خس و خاشاک کی طرح اس طوفان میں بے بسی کا شکار تھے بڑے بڑے سورماؤں نے گوشۂ عافیت ہی کو غنیمت سمجھا تھا، شیر دل جیلوں میں تھے یا تختہ دار پر جا چکے تھے، لیکن خدا کے اس بندے نے اس طوفان کا رُخ پھیرنے میں اہم رول ادا کیا، اپنے چچا محترم مولانا علی میاں کے نقش قدم پر بلکہ بقول حکیم عبدالقوی قلم بہ قلم اس جہاد کی پہلی صف میں تھے، ہندوستان کے صرف واقف حضرات ہی صحیح اندازہ رکھتے ہیں کہ یہ کیسا مشکل اور عزیمت کا کام تھا اور عالم اسلام کی کتنی عظیم خدمت ہوگی، یہ قلم پوری طرح بیدار رہا اور کسی وقت آنکھ نہیں جھپکائی، پوری بے سروسامانی اور محدود ترین وسائل کے ساتھ وہ پورے عالم اسلام کے صاحب ضمیر، صاحب ایمان علماء اور دانشوروں کی طرف سے یہ فرض کفایہ انجام دیتے رہے، لیکن اس نوجوان نے اپنی اس خدمت کا کوئی صلہ طلب نہیں کیا۔ کیسی ممبری، کیسا اعزاز اس کے دل میں اس کا خیال تک نہیں گزرا۔ باہر کے ملکوں سے دعوت نامے بھی آتے رہے اور ہوائی جہاز کے ٹکٹ بھی لیکن وہ دوسروں کی ہمت افزائی کرتے اور خود صرف ایک مرتبہ ہی گئے۔

ان کے وہاں بڑے سے بڑے سفر میں سفر کے لوازمات کا بالکل اہتمام نہیں تھا، خود ہی کوئی فکر کرے ورنہ وہ بالکل بے نیاز اپنی دھن میں مست۔

ہند و پاکستان اور پورے عالم عربی میں جو دعوتی و فکری اور تخریبی کام ہوتے رہے تھے اس پر پوری نظر رکھتے اور باخبر رہنے کی کوشش کرتے تھے اور جب ضرورت ہوتی خود لکھتے اور دوسروں سے لکھواتے، ان کی تحریروں کی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ مولانا علی میاں اور ان کی تحریروں میں فرق کرنا مشکل ہوتا، ان کا کمال یہ تھا کہ زبان کے ساتھ خط بھی بالکل مولانا علی میاں کی طرح تھا ان کے دستخط اور مولانا کے دستخط میں بڑے سے بڑا ماہر بھی فرق محسوس نہیں کر سکتا تھا۔

صبح چائے کے بعد لکھنے کا معمول تھا، گیارہ بجے تک، اس کے بعد عام طور پر وہ لکھنے کا کام نہیں کرتے۔ اکثر مولانا نے اشارات دے دیئے اور انھوں نے پورا مضمون مولانا کے انداز میں تیار

کردیا۔

شہر میں آمد و رفت بہت ہی کم تھی، ہم خیال لوگوں کی مجلس ہوتی تو وہ پورے انبساط کے ساتھ شریک ہوتے، ان کے الفاظ اب بھی کانوں میں گونجتے ہیں "بھئی حد کردی" "سچ کہئے گا" "واقعی" "اچھا یہ بات تھی" "ہم بھی کہیں آخر قصہ کیا ہے"۔ مسکراتے ہنستے لیکن کبھی آواز کے ساتھ نہیں۔ لیکن مولانا ابوبکر حسنی اور مخلص بھوپالی مرحوم کی آمد پر انبساط بہت بڑھ جاتا، مجلسوں کی دلچسپی میں اضافہ ہوجاتا گویا متقیوں کا موسم بہار ہوتا۔ مخلص صاحب مرحوم غفور میاں اور خالہ کی زبان میں ہر ایک کو اس کا حصہ رسدی تقسیم کرتے ان میں مانے ہوئے اہل قلم، صحافی، مقرر، لیڈر ملازم، نووارد بچے، بوڑھے سب ہوتے اور ہر ایک اپنا حصہ خوشی سے قبول کرتا اور محظوظ ہوتا۔ ادب، صحافت، سیاست، معاشرت، ملکی و غیر ملکی حالات سب موضوع پر باتیں ہوتیں اور تبادلۂ خیال ہوتا۔ ایک مرتبہ محمد میاں مرحوم نے چائے منگوائی مخلص صاحب نے کہا خلوص نہیں ہے محمد میاں نے کہا پورے خلوص سے منگوائی ہے، مخلص صاحب نے پھر کہا کہیں خلوص نظر نہیں آتا اب ذرا محمد میاں پریشان ہوئے کہنے لگے آخر آپ کا مطلب کیا ہے، مخلص صاحب نے کہا کہ یہی کیک پیسٹری محمد میاں نے کہا کہ لاؤ بھی جلدی لاؤ خلوص۔!

محمد میاں کا ذہن اپنے ماحول سے الگ تھا، مولانا علی میاں کی طرح جدید لیکن بعض چیزوں میں ان سے بڑھے ہوئے۔ ندوہ میں ہر سطح پر ترقی و تبدیلی اور جدید چیزوں سے پورے استفادہ کا رجحان رکھتے تھے وہ چاہتے تھے کہ ظاہری و معنوی دونوں اعتبار سے معیار بلند ہو، کتابت ہو تو اچھی ہو، رسالہ اور کتاب کا گٹ اپ بہت اچھا اور دیدہ زیب ہو۔ ندوہ میں چمن بندی اور جدید تعمیرات سے انھیں بے حد خوشی ہوتی تھی۔ اسی طرح طلبا سے ربط اور تعلق پیدا کرکے ان میں اُمنگ اور حوصلہ پیدا کرتے۔ ہر اچھے کام کی ہمت افزائی گویا ان کا دن رات کا مشغلہ تھا۔

کبھی اپنی شخصیت کو نمایاں کرنے کی کوشش نہیں کی ہمیشہ بیک گراؤنڈ میں رہتے۔ ندائے ملت ہو یا تعمیر حیات، پیام انسانیت کا کام ہو یا مشاورت کا۔ مسلم مجلس ہو یا دینی تعلیمی کونسل، ندوہ کا ۵۰ سالہ جشن ہو یا عرب مہمانوں کی آمد۔ ہر موقع پر پوری طرح شریک لیکن اس طرح جیسے خود انھوں نے کچھ نہیں کیا۔ بے نفسی، ایثار، سخاوت، حسن سلوک اور للّٰہیت کا ایسا نمونہ تھے کہ اس کی مثال کم ہے

نوجوانوں میں میری نظر میں نہیں ہے۔

کسے معلوم تھا کہ یہ گلاب بن کھلے مرجھا جائے گا اور یہ چاند بدر کامل بننے سے پہلے ہی چھپ جائے گا، اسپتال کے بے رحم عملہ کو کیا معلوم انھوں نے ایک پاک نفس کی محض اپنی غفلت سے وہ فکر بھی نہیں کی جو اس سے ہزار درجہ کم لوگوں کو دولت کے سہارے مل جایا کرتی ہے بیشک سب کی سانسوں کا حساب متعین ہے اور ہر آنے والا جانے ہی کے لئے آیا ہے لیکن کچھ جانے والے ایسے ہوتے ہیں کہ ان کے ذکر سے مدتوں آنکھیں پرآب رہتی ہیں اور بھلانے سے غم بڑھتا ہے۔

خدا کرے ان کے تینوں بیٹے عبداللہ عمار اور بلال ان کے صحیح جانشین اور ان کے اہل خاندان کی تسکین کا ذریعہ ہوں۔

مجاہدات کا میدان

انسان کے مجاہدات کا اصل میدان مسجد کا گوشہ یا خانقاہ کا حجرہ یا تسبیح و سجادہ نہیں، گھر اور بازار، سوسائٹی اور معاشرہ ہے اور اس میں سنت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا جائے تو چلتے پھرتے سارے مجاہدے اور ساری منزلیں طے ہوسکتی ہیں، دشمن کے ساتھ کیا برتاؤ ہو، دوست کے ساتھ کیا رویہ رکھا جائے۔ گھر والوں کے ساتھ کس طرح پیش آئیں، پڑوسی کے کیا حقوق ہیں، معاشرہ میں ہماری اخلاقی ذمہ داریاں کیا ہیں، ناگوار باتوں کو کیسے برداشت کرنا چاہیئے، خدمت و ہمدردی کیا چیز ہے، یہ وہ اسباق ہیں جو مدرسہ و مکتب اور کسی یونیورسٹی و درس گاہ میں نہیں بلکہ گھروں میں، سڑکوں پر، راستوں میں چلتے پھرتے اور بات کرتے پڑھائے جاتے ہیں، نیند سے بیدار ہوتے ہی آدمی کا سبق شروع ہوجاتا ہے اور یہ سبق اس کی تمام مشغولیتوں کے ساتھ خود بخود چلتا ہے، اس کو کسی نئے عمل کا اضافہ کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی، بلکہ اعمال کی نیت درست کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

(مولانا محمد الحسنی ندوی مرحوم)

مضراب عجم سے عربی میں دین حنیف کا ساز چھیڑنے والا چل بسا

مولانا عبد الکریم صاحب پاریکھ

مضراب عجم سے عربی میں دین حنیف کا ساز چھیڑنے والا چل بسا مولانا محمد الحسنی اڈیٹر البعث الاسلامی کا اس دار فانی سے کوچ ہو گیا۔ نام و نمود سے دور رہنے والا اپنی تعریف دکھاوا اور ریا سے پاک ایک نفس مطمئنہ اپنے رب کے حضور جا پہنچا یا ایتھا النفس المطمئنة ارجعی الی ربك راضية مرضية۔

عالم اسلام کے مفکر اعظم حضرت مولانا علی میاں مدظلہ العالی کے بھتیجے ڈاکٹر مولوی سید عبد العلی صاحب کے بیٹے اور مولانا سید عبد الحئی جیسے بلند پایہ عالمی سطح کے ممتاز عالم دین کے پوتے مولانا محمد الحسنی کا ۱۳ر جون ۷۹ء کو ۴۴ سال کی عمر میں انتقال ہو چکا۔

ہندوستانی مسلمانوں اور مشرق وسطیٰ کے مسلمانوں کے مشترکہ عالمی مسائل پر لکھنے والا قلم خاموش ہو گیا۔

اس ناچیز سے مولانا محمد الحسنی جو محمد میاں کے نام سے لکھنؤ کے حلقوں میں معروف تھے بارہا ملاقات، مشورے ہوتے رہتے تھے۔ نہایت ہی متین سنجیدہ گہری سوجھ بوجھ اور عمیق فکری سانچے میں ڈھلا ہوا یہ نورانی چہرہ اب حشر کے میدان میں ہی دیکھنے کو ملے گا۔

اللہ نے موصوف کو فن تحریر میں غیبی امداد سے نوازا تھا۔ ناصر کے طلسم کا پردہ چاک کرنے والا عربی مجلہ البعث الاسلامی کے اوراق پر عرب دنیا کو نہر سلسبیل کی طرح رواں دواں پیغام ربانی دیے جا رہا تھا۔ مولانا علی میاں مدظلہ کے مضامین کی اردو سے عربی میں اور عربی سے اردو میں صفر ترجمہ یا ترجمانی ہی نہیں بلکہ فکر خیالات اسلوب قلم کی حلاوت مٹھاس حتی کہ مولانا محترم کے قلب کی آواز کو جوں کی توں صفحۂ قرطاس پر لانے میں مرحوم ایک منفرد شخصیت تھے۔ مولانا علی میاں کا ترجمان علمی دنیا سے رخصت ہوا۔

ادھ کھلی شیروانی آدھے بٹن لگے ہوئے، آدھے کھلے، ہاتھ میں بستہ کبھی کبھی بغل میں دبائے رکھتے، سر پر ٹوپی ہمیشہ مسکراتا چہرا انار کے دانے کی طرح دانت اس وقت لولؤ منثورا کا منظر پیش کرتے۔ جب مرحوم ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ کوئی خوش ہونے کی بات کہتے تھے لیکن اپنے آپ کو کبھی نمایاں نہیں کرتے۔ ہر کام پردہ کے پیچھے محض رضائے الٰہی کی خاطر کرتے۔ اس صفت میں کسی نوجوان کو ان کے ہم پلہ ہم نے نہیں دیکھا۔

کوئی جلسہ ہو مشورہ ہو، اصابت رائے اور سنجیدہ گفتگو میں حصہ لیتے تقریر کرتے کبھی نہیں دیکھا البتہ قلم پر ایسا

قابو کہ عربی صرف و نحو کے نہ جاننے کے باوجود عجمی قلم عربی میں ایسا چلا کہ عرب دنیا سر دھنتی اور عالمی سطح کے عرب مفکرین یہ سوال کرتے کہ یہ کون شخص ہے؟ عربی اخبارات میں محمد میاں مرحوم کے مضامین خوب خوب نقل ہوتے لیکن اپنی اس کامیابی کا ذکر محمد میاں کبھی کسی سے نہ کرتے موجودہ دور میں مخلصین لہ الدین کا ممتاز مقام انھیں کے حصہ میں آیا۔ سادات کا یہ خاندان جس کے چشم و چراغ مولانا محمد میاں مرحوم تھے۔ صبر و استقلال سے اس صدمہ کو برداشت کر گیا۔ ایک نورانی بستی دائرہ شاہ علم اللہ میں غم کے چادر میں یہ خاندان صبر و سکون سے اللہ کا نام لیے جا رہا ہے۔ دن بھر ملک کے ممتاز لوگ آتے جاتے ہیں۔ مولانا محترم علی میاں مدظلہ کو دو ایک بار غم کا بند سنبھالتے دیکھا معلوم ہو رہا تھا لاوا ابھر جائے گا بند ٹوٹ پڑے گا لیکن اس صدمہ کو برداشت کر گئے۔ انما اشکو بثی وحزنی الی اللہ اور صبر جمیل کا زندہ نمونہ کسی کو دیکھنا ہو دیکھ لے کہ چند آنسو موتیوں کی طرح ٹپک گئے لیکن کوئی ہائے واویلا نہیں۔ خدائی کا خدا ہی جانے اس خاندان میں ہمیشہ دین حنیف کے چراغ روشن رہے۔ مرحوم کے بڑے صاحبزادے مولوی عبد اللہ کی آنکھوں میں اس عاجز نے وہ روشنی دیکھی جو مولانا یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی (صاحب تبلیغ) آنکھوں میں دیکھی تھی۔ وما ذلك على الله بعزيز کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ محمد میاں رحمۃ اللہ علیہ کا قلم پھر جاری کر دے۔

بہر حال اس وقت تو کان امر اللہ قدرا مقدورا کے تحت ایک ہونے والی بات ہو گئی۔ اس غم میں سب سے بڑا جھٹکا تو حضرت مولانا علی میاں مدظلہ ناظم ندوۃ العلماء کو لگا کہ ان کے اسلوب اور فکر کا ترجمان اس دنیا سے رخصت ہو گیا مولانا محترم کے قلب میں جھانک کر کوئی دیکھے تو معلوم ہو کہ کیا کرب اور درد ہے اپنے بھتیجے کی اس جدائی کا لیکن صبر و استقامت کا یہ عالمی نمونہ ایسے غم کو صبر و رضا کا نمونہ بنا کر بتا چکا کہ کسی بڑی سے بڑی مصیبت پر بھی مومن اپنے رب کی رضا اور قضا و قدر اور فیصلے پر راضی ہے البتہ بشریت کے تقاضوں کے تحت آنکھیں اشک بار اور دل بیقرار ہونا تو ام موسیٰ کے لیے بھی قرآن میں یہ بتایا گیا کہ فاصبح فؤاد ام موسیٰ فارغا لیکن جب اللہ اور انسان کے قلب میں رابطہ پیدا ہو جائے تو بات ہی کچھ اور ہو گی۔ یہ انسانیت کا وہ اعلیٰ نمونہ ہے کہ فرشتے بھی اس کی مثال میں عاجز ہیں کہ غم اور فکر تکلیف و راحت دکھ اور درد کا ذائقہ انھوں نے کبھی چکھا نہ ہو تو اس کی مثال بھلا وہ بھی کیسے پیش کر سکتے ہیں۔

محمد میاں مرحوم کے انتقال کے وقت مولانا علی میاں مدظلہ سفر میں تھے۔ بڑی کوشش کے بعد بھی موصوف مرحوم کی تدفین میں شریک نہ ہو سکے۔ آہ مولانا علی میاں مدظلہ کو حضرت اور مرشد کہنے والے لاکھوں ہیں مصلح اور مولانا کہنے والوں کی بھی کمی نہیں لیکن بڑے پیار اور مٹھاس سے چچا میاں کہنے والی زبان اب خاموش ہو چکی۔ دائرہ علم اللہ کو چھوٹی سی بستی میں تعزیت کے لیے آنے والوں کا تانتا بندھا ہوا ہے۔ تینوں وقت دسترخوان پر مسلمانوں کو کھانا کھلانے میں

سادات کا یہ ایک خاندان معروف ہے جہاں غم زدہ ہیں لیکن آنے والوں کی خدمت میں ذرہ برابر کمی نہیں۔ اللہ اللہ ایسا نمونہ پہلی بار دیکھا خواتین کم سن بچے جوان بوڑھے سب کے سب صابر اور ذاکر شاکر شکوہ شکایت کا نام نہیں مگر آنے والا بستی پر غم کی تنی ہوئی چادر کو دل کی آنکھوں سے دیکھ لیتا ہے تو پھوٹ پڑتا ہے لیکن کیا ہی صابر لوگ ہیں اس خاندان کے گویا آنے والوں کو ان کی آنکھیں اور ہونٹ جو خاموش ہیں خود دلاسا دے رہے ہیں کہ فکر نہ کرو، یہ خاندان پہلے کی طرح برابر روشنی کے چراغ دیتا رہے گا۔ ہندوستان کا ہی نہیں پوری دنیا کے مسلمانوں کا نقصان ہوا۔ گویا خاندان والے ہر آنے والے جو تعزیت کے لیے آرہے ہیں انھیں یقین دلاتے ہیں کہ انتظار کرو عجمی مضراب سے دین عربی کا ساز برابر سنائی دے گا۔ گو ساز کے تار چھیڑنے والا کوئی اور ہوگا جو محمد میاں مرحوم کی جگہ لے گا لیکن داعیان حق کا یہ قافلہ خاموش نہیں رہے گا۔ اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کو برابر ہم ادا کرنے کے لیے مستعد ہیں امت نہ گھبرائے کہ مجاہدین فی سبیل اللہ مسند بیعت و ارشاد اور قلم و قرطاس سے رب کی حمد و ثنا کے ترانے سنانے میں جو رول ادا کرتے آرہے ہیں انشاء اللہ اس میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔

پیام انسانیت مولانا علی میاں مدظلہ کی دعوت ہے جو ملک میں ہندو مسلمان سکھ عیسائی سبھی سے خطاب کرتی ہے۔ اس دعوت سے لاکھوں لوگ روشناس ہیں لیکن کیا کوئی یہ بھی جانتا ہے کہ اس دعوت کے نقش نگار ش حسن و آرائش میں مولانا محمد میاں مرحوم کا کتنا حصہ تھا میں آپ کو بتاؤں کہ وہ اس قافلے کی پوری رہنمائی کرتے تھے لیکن اپنے آپ کو کبھی نمایاں نہیں کیا۔ ہم جیسے آگے بڑھتے اور داد حاصل کرتے لیکن محمد میاں مرحوم پردہ کے پیچھے آخر وقت تک پیام انسانیت کی دعوت کی خبر گیری کرتے، مشورہ دیتے خاکے بناتے نشیب و فراز خطرات اور مشکلات کی نشاندہی کرتے لیکن اخباروں میں نام ان کا کبھی نہ آنے پاتا۔

واقعی یہ جوان صالح نئی پود کے لیے ایک اہم نمونہ تھا۔ اب ہمارے درمیان نہیں ہے لیکن اس کا قلم، کہتا ہیں، دعوت لاکھوں سطور میں اب بھی ہمارے لیے مشعل راہ ہے۔

اللہ تعالیٰ مرحوم کی قبر کو نور سے بھر دے اور حشر کے دن یَوْمَ یَدْعُوْکُمْ فَتَسْتَجِیْبُوْنَ بِحَمْدِہٖ وَتَظُنُّوْنَ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِیْلًا کہتے ہوئے اپنی قبر سے جب اپنی خدمات کا پرچہ اپنے سیدھے ہاتھ میں لیے حشر کے میدان میں انشاء اللہ ملیں گے اسی وقت دل کھول کر باتیں ہوں گی۔

مولانا محمد الحسنی ندوی مرحوم

خوش درخشید و لے دولت مستعجل بود

(زیر نظر مضمون "تعمیر حیات" (۲۵ جون و ۱۰ جولائی) کا اداریہ ہے جو اسحاق جلیس مرحوم نے مولانا محمد الحسنی کے سانحہ انتقال پر قلم برداشتہ لکھا تھا، اس کا ایک ایک لفظ درد میں ڈوبا ہوا اور دل کی گہرائیوں سے نکلا ہے اور اس سے اس صدمہ اور رنج والم کا اندازہ ہوتا ہے جس نے مضمون نگار کے ذہن و دماغ بلکہ ان کے وجود کو ہلا کر رکھ دیا تھا، اور تعمیر حیات کے اسی شمارہ میں انہوں نے نمبر نکالنے کا اعلان کیا تھا لیکن،

سامان سو برس کے ہیں پل کی خبر نہیں

کسے خبر تھی کہ اپنا مرتب کیا ہوا یہ آخری شمارہ دیکھ بھی نہ سکیں گے اور اپنے عزیز و محبوب دوست سے جا ملیں گے، اگر ان کو موقع ملتا تو نہ جانے کیا کچھ اور کس طرح لکھتے، کہ دونوں ہی ایک دوسرے سے بہت قریب تھے۔ ان کے باہمی تعلقات، افکار و خیالات میں بڑی حد تک یکسانیت اور بہت سی سرگرمیوں اور پروگراموں میں شرکت کی وجہ سے دونوں ایک دوسرے کے اداشناس اور طبیعتوں اور صلاحیتوں سے بخوبی واقف تھے، اگر قدرت کو منظور ہوتا اسحاق جلیس مرتب کرتے تو اپنے محترم رفیق اور محبوب دوست کا حق ادا کرتے، لیکن نمبر کے اعلان کے ساتھ ہی دست قضا نے انھیں سمیٹ لیا، "وکان امر اللہ قدرًا مقدورًا" ان کا یہ مضمون ایک تاریخی یادگار کے طور پر شامل اشاعت ہے۔ (مرتب)

تدمع العین ویحزن القلب ولا نقول الا ما یرضیٰ ربنا وانا الفراقک یا محزونون۔

۱۳ جون ۷۹ء، ۱۷ رجب المرجب ۹۹ھ کی شب میں صرف چند گھنٹوں کی موت و حیات کے کش مکش کے بعد مولانا محمد الحسنی ندوی اس دار فانی سے رخصت ہو گئے، مرحوم نے حیات مستعار سے ابدی زندگی کا سفر

ایسی سُرعت سے طے کیا کہ جس نے یہ خبر سُنی اسے یقین کرنا دشوار ہوگیا، مختلف ذرائع سے تصدیق کی دل تھام کر اس حادثہ کی خبر کو قبول کیا تو اندر سے طبیعت یقین کرنے پر آمادہ نظر نہ آئی، انسانی زندگی میں غیر متوقع حادثے پیش آتے رہتے ہیں، لیکن وقت کا مرہم ان زخموں کو مندمل کرتا جاتا ہے، یہ نہ ہو تو زیست دشوار ہو جائے، لیکن بعض حادثے اپنی کیفیت کے اعتبار سے دائمی درد و الم چھوڑ جاتے ہیں، جو بھُلائے نہیں بھولتے، جن کی یاد ہر گام، ہر موڑ اور ہر لمحہ تازہ ہوتی رہتی ہے، مولانا محمد الحسنی ندوی کا سانحۂ رحلت بھی دل کا وہ زخم ہے جسے بھرنے میں وقت کا مرہم شاید ناکام رہے، یادوں کی پُروائی دل کے اس زخم کو ہرا کرتی رہے گی، ان کی جُدائی کا غم ناقابلِ فراموش ہے، اُن کی کمی کا احساس کسی لمحہ کم نہیں ہو سکتا، اس لئے کہ مرحوم اس عصر کی ضرورت تھے، اس دور کا تقاضا تھے، اس عہد میں دین کی دعوت و خدمت کی ایک ایسی علامت SYMBOL تھے جس کا خلا پُر ہونا مشکل، جس کا بدل بظاہر ناممکن، جس محرومی کی تلافی دشوار۔ وہ عمل ابھی جاری ہے جسے مرحوم نے شروع کیا تھا، اس مشن کی ہنوز تکمیل نہیں ہوئی جسے مرحوم نے جاری کیا تھا، وہ خواب ابھی شرمندۂ تعبیر ہے جس کی جھلک مرحوم نے اپنی تحریروں میں پیش کی تھی، پھر محمد الحسنی یاد کیسے نہ آئیں؟

مرحوم کی پیدائش اس صدی کے چوتھے دہے میں ہوئی، وہ ایسے خاندان میں پروان چڑھے جس سے ایمان و اسلام، علم و ادب، تبلیغ و جہاد، اصلاح معاشرہ اور تربیت فرد کی نہ جانے کیسی کیسی عظیم الشان خدمات وابستہ ہیں، انکی شخصیت کی تشکیل و تعمیر میں خاندانی روایات اور ان کے والد بزرگوار مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی ندویؒ اور عم محترم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی (اطال اللہ بقاءہ) کی سیرت، شخصیت اور تربیت نے چار چاند لگا دیے تھے، ایک طرف ان کی ذہنی تعمیر کا عمل جاری تھا، تو دوسری طرف عالم اسلام ایک نئے موڑ سے گذر رہا تھا، دوسری جنگ عظیم کے اختتام کے بعد استعمار سے آزادی کا دور شروع ہوا لیکن ملت اسلامیہ ایک نئی غلامی کا شکار ہونے لگی۔ یہ تھی ذہنی غلامی، مغربی تہذیب، قومیت، وطنیت اور اشتراکیت کا سحر جس نے عالم اسلام خاص طور پر ممالک عربیہ کو مسحور کر دیا تھا، کامل و اکمل دین اور ابد تک نوع انسانی کی رہنمائی کرنے والے ضابطۂ حیات کی حیثیت سے اسلام پر بے یقینی کے عمومی سیلاب نے عالم اسلام اور دنیائے عرب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا، اس دور میں ایسے پُرزور قلم کی ضرورت تھی جو شک و ارتیاب میں مبتلا اذہان میں از سرِ نو ایمان و یقین کی مشعل روشن کرے جو غیر اسلامی نظریات کے کھوکھلے پن کو بے نقاب کرے، جو امت مسلمہ کو اس کے اصل منصب و مقام سے آشنا کرے، جس میں لذت کردار

اور جرأت اندیشہ ہو جو زبان و ادب کو ایک نیا دعوتی اسلوب بخشے، اللہ تعالیٰ کی توفیق، ماحول کی تربیت اور وقت کی ضرورت نے مرحوم کو صرف بیس سال کی عمر میں ایک عربی ماہنامہ کے اجراء پر آمادہ کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے "البعث الاسلامی" کے نام سے جلائی ہوئی اس جوت نے نہ جانے کتنے تاریک دل و دماغ کو ایمان و یقین کی روشنی سے منور کیا، اس صور اسرافیل نے نجانے کتنے غفلت کے متوالوں اور نیند کے مدہوشوں کو بیدار کیا اور ان میں نئی روح پھونک دی، اس ضرب کلیمی سے الحاد و دہریت، قومیت و اشتراکیت کے کتنے ہی بُت پاش پاش ہوئے، "البعث الاسلامی" کے سرورق کا یہ جملہ "شعارنا الوحید الی الاسلام من جدید" عالم اسلام کی نوجوان نسل کے دلوں کی دھڑکن بن گیا، نوجوانوں کی حد تک مرحوم کے سلسلے میں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ؎

شورشِ عندلیب نے روحِ چمن میں پھونک دی ورنہ کلی کلی یہاں مست تھی خواب ناز میں

محمد الحسنی بُھلائے نہیں جا سکتے کیونکہ وہ معرکہ ابھی برپا اور وہ محاذ ابھی گرم ہے، جس کے ہراول دستے کے وہ سپاہی بلکہ صفِ اول کے رہنما تھے، دین و لادینیت اور حق و باطل کی کشمکش اب فیصلہ کُن موڑ پر پہونچ چکی ہے، ایسے نازک موقع پر محمد الحسنی کیونکر یاد نہ آئیں، پچیس ۲۵ سال تک انہوں نے اپنے قلم کے ذریعہ جو جہاد کیا تھا، جو دعوت دی تھی، جو صدا لگائی تھی، اس پر عالم اسلام کے لاکھوں نوجوان لبیک کہہ کر پیش قدمی کر رہے ہیں، مراکش سے انڈونیشیا تک ملت اسلامیہ کی نئی نسل میں دینی بیداری کے آثار، مسلم ممالک میں اسلامی شریعت کے نفاذ کے مطالبات اور دیار غرب میں اسلام کی طرف بازگشت کی علامتوں کو اپنی زندگی کے آخری ایام میں دیکھ سُن کر مرحوم بہت مسرور ہوتے تھے، سال گذشتہ انہی دنوں میں پاکستان میں اسلامی ایشیائی کانفرنس میں رفاقت رہی، مختلف شہروں میں جانا ہوا، ہر سطح کے عوام و خواص سے ملاقاتیں رہیں، مرحوم کو ہر موقع پر دین کے غلبہ اور دینداروں کے ہاتھ ملکوں کی زمام قیادت کا متمنی اور دعا گو پایا۔

مرحوم نے زندگی کی صرف ۶۴ بہاریں دیکھیں، لیکن اس مختصر مہلت عمر میں انہوں نے جو دینی، علمی اور ادبی ورثہ چھوڑا وہ کمیت و کیفیت کے اعتبار سے بڑا گراں قیمت، اپنے اثرات و نتائج کے اعتبار سے بہت دور رس اور اپنے اسلوب و حسن بیان کے اعتبار سے بڑا ممتاز اور طاقتور ہے، عربی اور اردو کے اس اسلوب کو برتنے میں سب سے کامیاب انہی کا قلم تھا جسے ایک قدیم ندوی بزرگ نے "حسنی ندوی اسلوب" کہا ہے، اپنے عم محترم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا انہوں نے بڑا کامیاب تتبع کیا، اسلوب اور طرز تحریر میں ایسی یکسانیت کہ قریبی ساتھیوں

کو فرق و تمیز کرنا دشوار ہو جاتا۔

۲۳ سال کی عمر میں انہوں نے مشہور نومسلم محمد اسد صاحب کی کتاب Road to Mecca کا اردو ترجمہ کیا جو "طوفان سے ساحل تک" کے نام سے شائع ہو کر مقبول ہوا۔ ۲۵ سال کی عمر میں بانی ندوۃ العلما، مولانا محمد علی مونگیری کی ضخیم سیرت لکھی، اسی زمانہ میں اپنے خاندان کے مورث اعلیٰ حضرت شاہ علم اللہؒ کی سیرت ان کے قلم سے نکلی، اس کے علاوہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی بیشتر کتابوں کا عربی سے اردو میں ترجمہ کیا اور بعض کا اردو سے عربی میں، ان کی وہ کتاب جس نے عالم عربی میں ان کی شہرت کو بام عروج پر پہونچا دیا "الاسلام الممتحن" ہے جس کے چار ایڈیشن مصر سے شائع ہوئے، اس کتاب کی عرب نوجوانوں میں ایسی پذیرائی ہوئی جو بہت کم کتابوں کو نصیب ہوئی ہوگی۔ اس کتاب نے مشرق وسطیٰ سے مشرق بعید تک دینی اور دعوتی حلقوں کو متاثر کیا، انڈونیشیا کی ممتاز شخصیتوں نے اس کی خوب خوب تعریف کی اور وہاں کے بڑے بڑے اجتماعات میں اسکے مضامین سنائے گئے۔

مرحوم کی علمی، ادبی صلاحیتوں کا ان سب کو اعتراف ہے جنھوں نے ان کی تحریریں پڑھی ہیں، لیکن انکی زندگی کا وہ نمایاں پہلو جسے دیکھنے کا ہر شخص کو موقع نہیں ملا، وہ تھی ان کی شرافت و مروّت، اخلاق و تواضع، خندہ جبینی اور شیریں گفتاری اور خود نمائی و نام و نمود سے پرہیز، آج کی دنیا میں انسانی اور اخلاقی قدروں کے زوال کا عمل جس تیزی سے جاری ہے اس میں کسی مرد بزرگ کا چراغ لیے "انسانم آرزوست" کی صدا لگانا تعجب خیز نہیں ہو سکتا، ایسے دور میں حیات اجتماعی کے تلاطم خیز دھارے میں ان کا دامن کسی کے شکوہ و شکایت کسی کی اذیت و حق تلفی، کسی کی گرانی اور انقباض سے آلودہ نہیں ہوا، وہ ہر ایک سے خندہ پیشانی سے ملتے، ہر شخص کے بہی خواہ اور خیر خواہ بن جاتے، ہر ایک کی ترقی اور اس کی صلاحیت کو مفید سے مفید تر بنانے کی کوشش کرتے، انہوں نے ہماری مختصر سی جماعت میں اپنے رکھ رکھاؤ، متانت و سنجیدگی اور خلوص و محبت سے ایسا اعتماد حاصل کر لیا تھا کہ کسی کو ان کے سامنے اپنے دل کی بات کہنے اور ذہن کا بوجھ ہلکا کرنے میں تکلف نہ ہوتا۔

محمد الحسنی بھلائے نہیں جا سکتے اس لیے کہ وہ بحیثیت انسان اتنے عظیم اور بلند تھے کہ ان کی بلندی تک جھانکنا ہم جیسوں کو دشوار تھا۔ محمد الحسنی بار بار یاد آئیں گے، کیونکہ ان کا میدانِ عمل قرطاس و قلم اور

گوشۂ علم و ادب تک محدود نہیں تھا، وہ ملی جد و جہد کے ہر میدان سے آشنا، اس کے مفید و مضر پہلوؤں سے باخبر تھے اور اسے خوب سے خوب تر بنانے میں عملی دلچسپی لیا کرتے تھے، وہ اپنے عم محترم کے تنہا فکر و فن اور اسلوب نگارش کے امین و وارث نہیں تھے بلکہ ملت کے مسائل میں ان کی تڑپ اور دل سوزی، ان کی دعوتی سرگرمیوں اور اجتماعی کاموں سے بھی قلبی تعلق رکھتے تھے، شاید یہ بات بہت کم لوگوں کے علم میں ہو کہ تحریک پیام انسانیت کے سلسلے میں ہر مشورہ میں وہ شریک ہوتے اور اپنی اصابت رائے سے ہم سب کو متاثر کرتے، وہ اسٹیج سے ہمیشہ گریزاں رہے، خود نمائی سے کوسوں دور رہے، لیکن نہ جانے کتنے اجتماعات اور جلسوں کی کامیابی ان کا وہ خاموش عمل ہوتا جو پس پردہ وہ انجام دیتے۔ ع

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا

مرحوم کی فکری، ذہنی، علمی، ادبی اور دینی خدمات کو اللہ تعالیٰ نے جو مقبولیت اور ان کی دلآویز شخصیت کو جو محبوبیت عطا فرمائی ہے اس کا اندازہ ان تعزیتی خطوط سے ہوتا ہے جو ان کے انتقال کے بعد ملک اور بیرونِ ملک کے گوشہ گوشہ سے آ رہے ہیں، ان میں سے اکثر خطوط میں ان کی ناگہانی موت اور اچانک پیش آنے والے اس حادثہ کی تفصیلات دریافت کی گئی ہیں، یہ سانحہ ایسا اچانک پیش آیا کہ اس کی تفصیل بھی کسطرح بیاں ہوں؟

ع۔ بس اتنی سی حقیقت تھی فریب خواب ہستی کی

چہار شنبہ ۱۳ جون کی صبح سب کے ساتھ گھر پر ناشتہ کیا، استاذی مولانا محمد رابع صاحب ندوی نے دار العلوم چلنے کو دریافت فرمایا تو آمادگی ظاہر کی، یہ حضرات (مولانا رابع صاحب ندوی اور مولانا واضح رشید ندوی) دار العلوم تشریف لائے، مرحوم نے ان کے بعد دار العلوم پہنچنے کا ارادہ کیا، مولانا ابوبکر صاحب حسنی سے اجازت لینے پہونچے، اسی دوران پیٹ میں ہلکا سا درد محسوس ہوا تو ارادہ فسخ کر کے گھر پر ہی کام میں مشغول ہو گئے، اس عرصہ میں گھریلو دوائیاں استعمال کرتے رہے، دوپہر میں تکلیف بڑھی تو ڈاکٹر اشتیاق صاحب کو فون کر کے کیفیت بتلائی اور ان کی ہدایت پر دوا کا استعمال جاری رکھا، تکلیف میں افاقہ نہیں ہوا تو سہ پہر کو ڈاکٹر باسو اور پھر حکیم عبد القوی صاحب بلوائے گئے، عصر بعد تکلیف بڑھ گئی، ڈاکٹر اشتیاق صاحب کے مشورہ سے اسپتال لے جانا طے ہوا، مغرب بعد بلرام پور اسپتال میں داخل کیے گئے۔

ابھی مرض کی تشخیص جاری تھی، آکسیجن اور گلوکوز دیا جارہا تھا کہ وقت موعود آگیا اور عشار کی اذان کے وقت جان جاں آفریں کے سپرد کردی، یہ ایسا ناگہانی حادثہ تھا کہ نعش سامنے رکھی تھی اور دل اس واقعہ کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہ تھا، دارالعلوم میں خبر ہوئی تمام اساتذہ اور طلبہ اسپتال پہونچے، نعش اسی وقت اسپتال سے مکان گوئن روڈ لائی گئی، اہل تعلق کا جم غفیر مکان کے ارد گرد رات بھر رہا، مولانا محمد منظور صاحب نعمانی اپنی معذوری اور پیرانہ سالی کے باوجود رات دیر تک تلقین صبر کرتے رہے، غسل اور تجہیز وتکفین انہی کی نگرانی میں ہوئی، صبح پہلی نماز جنازہ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ہوئی پھر بس کے ذریعہ نعش رائے بریلی لے جائی گئی، وہاں مولانا محمد ثانی صاحب نے نماز جنازہ پڑھائی اور دوپہر کو اپنے والد بزرگوار ڈاکٹر سید عبد العلی حسنی ندویؒ اور دادا مولانا حکیم سید عبد الحی حسنیؒ کے پہلو میں دفن کئے گئے ؎

چپہ چپہ پہ وہاں گوہر یکتا تہہ خاک　　دفن ہوگا نہ کہیں ایسا خزانہ ہرگز

اللہ تعالیٰ کی مشیت کہ مرحوم کی سب سے محترم ومحبوب شخصیت، جنہیں بڑی محبت سے وہ "چچا میاں" کہا کرتے تھے، جن کی آغوش تربیت میں وہ پروان چڑھے، جن کے فکر واسلوب کی زندگی بھر انہوں نے سو فی صد تقلید کی اور جن کے وہ متوقع جانشین تھے، یعنی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ، اس اندوہناک موقع اور دم واپسیں پر موجود نہیں تھے، مرحوم جنہیں دیکھ دیکھ کر نشاط وحرارت، نیک عزائم میں پختگی اور اپنے مقصد وشن میں برکت ونورانیت پاتے تھے جن کی دید سے آنکھیں روشن ہوتی تھیں اور دل ودماغ فرحت وانبساط محسوس کرتے تھے، عجب نہیں کہ آخری لمحہ ان کی دید کی تمنا سمٹ کر آنکھوں میں آگئی ہو،

۲۶ مئی ۷۹ء سے لے کر ۴ جون تک تحریک پیام انسانیت کے سلسلے میں ریاست کرناٹک کا دورہ شروع ہوا، ۴ جون کو بنگلور سے بمبئی واپسی ہوئی، پروگرام یہ طے ہوا کہ ۲۰ جون تک بغرض آرام وعلاج نیز تاریخ دعوت وعزیمت کے حصہ چہارم کی تالیف کے سلسلے میں (جو حضرت مجدد الف ثانیؒ کے حالات وکمالات پر مشتمل ہوگی) حضرت مولانا بمبئی میں قیام فرمائیں گے۔ مخدومی مولانا معین اللہ صاحب ندوی، جناب عبد الکریم صاحب پاریکھ اور راقم سطور ہمراہ تھے، تحریری کاموں میں معاونت کے لئے لکھنؤ سے مولوی نثار الحق صاحب ندوی بمبئی پہونچ گئے، بمبئی کے میزبان محمد بھائی (مالک بمبئی آندھرا ٹرانسپورٹ کمپنی) اور اہل تعلق اسماعیل بھائی منصوری، صوفی عبد الرحمن صاحب وغیرہ نے تمام سہولتوں کا خیال رکھا، ۱۰ جون کو راقم سطور بمبئی سے پونا

اور احمد نگر ہوتے ہوئے ۱۵ جون کو لکھنؤ پہونچا، ابھی رکشے سے سامان بھی نہ اترا تھا کہ اپنے پڑوسی مولوی غیاث صاحب ندوی کی زبانی حادثہ کی خبر سن کر دماغ مفلوج سا ہوگیا، بمبئی تشویشناک حالت، پھر انتقال کی خبر دی گئی جسے مصلحتاً حضرت مدظلہ سے پوشیدہ رکھا گیا کہ سفر بخیریت گذر جائے، ہوائی جہاز میں بروقت سیٹ نہ ملنے کی وجہ سے ۱۵ جون کی صبح مولانا اپنے رفقاء کے ہمراہ لکھنؤ پہونچے، اسٹیشن پر مولانا محمد منظور صاحب نعمانی نے کلمات تسلی کے ساتھ اس حادثہ جانکاہ کی خبر دی، حضرت مولانا پر جو گذری ہوگی وہ تصور سے بالاتر ہے، تدفین کو ۲۴ گھنٹے ہو چکے تھے، مولانا اسی وقت رائے بریلی روانہ ہوگئے۔

اللہ تعالیٰ کی مصلحت کہ آخری وقت حضرت مولانا بھی نہیں تھے، مرحوم ان کے لئے بمنزلہ اولاد کے تھے، مولانا سعید الرحمن الاعظمی بھی ایک روز پہلے اپنے وطن جاچکے تھے، جن کا ۲۶ سالہ رات ودن کا ساتھ تھا، وہ سفر آخرت کے وقت دور تھے، مولانا معین اللہ صاحب ندوی جو مرحوم کی صلاح اور صلاحیت کے بڑے معترف اور قدرداں تھے اور مرحوم بھی جن کی محنت، محبت اور خلوص کے بڑے قائل اور مداح تھے اس موقع پر موجود نہیں تھے۔ راقم سطور بھی آخری لمحات کی زیارت وخدمت سے محروم رہا جس کے بارے میں وہ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ "آپ سے بڑی مناسبت ہے، ہم جب مشورہ کرتے ہیں اور کسی کام کا خاکہ بناتے ہیں تو بہت روشن امکان اور وسیع میدان سامنے آتا ہے"۔

۱۶ جون کو عبد الکریم صاحب پاریکھ کی معیت میں رائے بریلی حاضری ہوئی، حضرت اور خاندان کے لوگوں سے مل کر دل بھر آیا، قبر پر پہونچے، بہتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ ایصال ثواب کیا اور دعائے مغفرت کے پھول چڑھائے۔

عجیب اتفاق کہ عربی زبان کے ایک ممتاز ندوی انشاء پرداز اور ادیب مولانا مسعود عالم صاحب ندویؒ کا انتقال بھی ۴۴ سال کی عمر میں ہوا، ان کی وفات پر ان کے دیرینہ رفیق مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے جو پُر اثر مضمون لکھا ہے اس کے آخری پیراگراف میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"ان کی عمر ۴۴ سال سے زیادہ نہیں ہوئی، اس عمر میں انہوں نے بڑے بڑے کام کئے اور ایسی تصانیف یادگار چھوڑیں جو ایک شخص کو کامیاب مصنف اور نامور صاحب علم وصاحب قلم بنانے کے لئے کافی ہیں، کسی شخص کے افتخار کے لئے وہ سرمایہ کافی ہے جو

انہوں نے چھوڑا، مگر جو لوگ ان کی ذہنی اور علمی صلاحیت سے واقف تھے اور جو ان کے علم وفکر کا ارتقا دیکھ رہے تھے اور جن کو اس کی آرزو تھی کہ بہت دن زندہ رہیں اور کام کریں، ان کی زبان پر بصد حسرت ویاس یہ مصرعہ ہے ؎

خوش درخشید ولے دولت مستعجل بود"

ٹھیک ۶۴ سال کی عمر میں ندوہ کے ایک دوسرے فرزند جن کی عربی زبان وادب کا عالم عرب قائل تھا جن کی علمی وفکری صلاحیت کا زمانہ معترف تھا، جن سے بڑی توقعات وابستہ تھیں، دنیا سے منھ موڑ گئے۔

کل من علیھا فان ویبقیٰ وجہ ربک ذو الجلال والاکرام۔

(تعمیر حیات ۲۵ جون و ۱۰ جولائی ۷۹ء)

تصحیح نیّت

مسلمانو! نیت سرفہرست ہے نہ کہ فہرست کے آخر میں اور جب صحیح نیت کی جائے تو اس کے پھل بھی صحیح ملتے ہیں اگرچہ وہ مادہ پرستوں کی نگاہوں میں ناکام اور اسباب ووسائل پر اعتماد کرنے والوں کی نظروں میں شکست خوردہ ہو، قدامت پرست اور رجعیت پسند اور سائنس اور علم وادب کے مبلغوں کی نظروں سے اوجھل ہو۔

(مولانا محمد الحسنی ندوی مرحوم)

مولانا محمد الحسنی

شخصیت اور اس کی تکمیل کے عناصر

محسن عثمانی ندوی

یادش بخیر: شام کے ممتاز ادیب اور حضارۃ الاسلام کے ایڈیٹر مصطفیٰ سباعی کا جب انتقال ہوا تو عرب ملکوں میں ان کی شخصیت، اسلامیت اور کمال انشا پردازی پر بہت سے لوگوں نے مضامین لکھے تھے یہ تمام مضامین حضارۃ الاسلام کے خاص نمبر میں شائع کئے گئے تھے، ان میں زیادہ نمایاں اور پر اثر تحریر ندوۃ العلماء کے آرگن البعث الاسلامی کے ایڈیٹر سید محمد الحسنی کی تھی جس کا عنوان تھا۔

نجم تألق ثم ھوی

محمد حسنی صاحب کے انتقال کے سانحہ پر کچھ لکھا جائے تو شاید یہی عنوان اس کے لئے موزوں ہوگا اور اس کا مفہوم فارسی کے اس مصرعہ "خوش درخشید ولے دولتے مستعجل بود" سے بہتر طور پر ادا ہوتا ہے۔ "خوش درخشید" اور "دولتے مستعجل بود" یہ دونوں ترکیبیں اس غیر متوقع حادثہ کی الم انگیزی اور جاں گدازی کو نمایاں کرتی ہیں۔ اس لئے کہ واقعہ یہ ہے کہ مولانا محمد حسنی صاحب ندوۃ العلماء اور اس کے ماحول کے ان تربیت یافتہ لوگوں میں تھے جو فیاض ازل سے مختصر عمر لیکن قابل قدر اور قابل فخر صلاحیتیں لے کر آئے تھے۔ علی احمد کیانی، عبدالرحمٰن نگرامی اور مولانا مسعود عالم ندوۃ العلماء کے تعلیم یافتہ وہ اشخاص تھے جن کی عمر نے وفا کی ہوتی اور وہ سن طبعی تک پہونچتے تو اسلام اور مسلمانوں کو ان کی خداداد صلاحیتوں سے زیادہ فائدہ پہونچتا۔ مولانا محمد حسنی کا سن بھی چالیس کے آس پاس تھا اور اس عمر میں ان کے پر زور اور طاقتور قلم کا، جس کا سرچشمہ ان کی ایمانی روح تھی، عرب دنیا کے اہل قلم اعتراف کر چکے تھے، انکی ہر تحریر عربوں کے لئے بانگ رحیل اور غفلت کی سرشاریوں سے بیدار کرنے کے لئے صور اسرافیل کی حیثیت رکھتی تھی۔ یہ آواز جو ہندوستان کے "جزیرۃ العرب" اور عربی زبان وادب کے مرکز ندوۃ العلماء کے آرگن

البعث الاسلامی کے ذریعہ بلند ہوتی تھی۔ صدا بہ صحرا نہیں ہوتی تھی بلکہ از دل خیزد بر دل ریزد کا مصداق ہوتی تھی۔ چنانچہ جس زمانہ میں مصر میں البعث الاسلامی کا داخلہ ممنوع تھا اس کی کاپیاں وہاں سمگل ہوتی تھیں اور دینی حلقوں میں اور خاص طور پر اخوان کے گھروں میں شوق وذوق کے ساتھ پڑھی جاتی تھیں، جب مصر کی سرزمین پر جمال عبد الناصر کی فرعون سامانیاں حد سے تجاوز کر گئیں اور دین کے علمبرداروں کے لئے دار ورسن کی آزمائش کا مرحلہ آگیا اور جب فرعون کے مجسموں کی تنصیب اور اس کی تہذیب پر فخر کا دور شروع ہوا تو مولانا محمد حسنی کی زبان گوہربار، تیغ جوہردار بن گئی اور اس زمانہ میں ان کے قلم سے ایسے زوردار مضامین نکلے کہ مشہور عربی اخبار الاہرام کو یہ لکھنا پڑا کہ ہندوستان کے ساتھ مصر کے تعلقات بہت مستحکم ہیں لیکن آئندہ اگر اس استحکام میں کوئی رخنہ پڑا تو اس کا سبب یہ عربی رسالہ ہوگا جو ہندوستان سے شائع ہوتا ہے۔

دنیائے عرب کی ہر تحریک ہر آواز اور ہر رست وخیز پر ان کی نظر بہت گہری تھی۔ جو کوتاہی عربوں میں انہیں نظر آتی اس پر ان کا قلم ضرور تنقید کرتا تھا اور ہر افتاد جو کسی اسلامی ملک پر پڑتی اس کا درد ان کے دل میں ہوتا تھا، غموں کے آنسو روشنائی بن کر صفحہ قرطاس پر پھیل جاتے تھے، اسباب و عوامل کی فکر انگیز تحلیل کے ساتھ ان کا قلم بہتر اور روشن تر مستقبل کے راستہ کی طرف رہنمائی کرتا تھا، عالم عربی کے ساتھ گہرے رشتہ اور ان کے ہم سفر اور ہمرکاب ہونے کا احساس واظہار ان کی سطر سطر سے ہوتا تھا۔

جس طرح حسن کی جنس ہمیشہ اپنے قدرداں اور خریدار رکھتی ہے، مولانا محمد حسنی کی تحریر کے پرستار بھی عرب دنیا میں بہت تھے۔ ان کی کتاب الاسلام الممتحن (اسلام دور آزمائش میں) ابھی ایک سال پہلے شائع ہوئی اور اب اس کا چوتھا ایڈیشن نکلنے والا ہے، یہ بے مثال مقبولیت جہاں اس بات کا ثبوت ہے کہ عربوں کے نزدیک اس ہندی نژاد مصنف کی تحریریں مقام اعتبار اور انشاء کے لحاظ سے زر کامل عیار کے درجہ تک پہونچ چکی ہیں وہاں اس بات کا بھی اظہار ہے کہ عربوں میں دینی جذبہ اور طاقتور اسلامی لٹریچر کے مطالعہ کا شوق نہ صرف یہ کہ موجود ہے بلکہ روز افزوں ہے۔ مغرب سے درآمد کئے ہوئے نظریات کا طلسم اگرچہ ٹوٹا نہیں ہے، لیکن اس کی جاذبیت اور کشش روز بروز کم ہوتی جارہی ہے، مولانا محمد الحسنیؒ کی دوسری کتاب "مصر تتنفس" جلد زیور طبع سے آراستہ ہونے والی ہے اور

امید ہے کہ اس کا مصر میں پہلی کتاب سے زیادہ پرجوش استقبال ہوگا کیونکہ یہ وہ موضوع جس پر ان کا قلم ہمیشہ ادب وانشاء کے پھول کھلاتا اور ادب عالیہ کا نمونہ پیش کرتا رہا ہے۔

مولانا محمد الحسنی کے اوصاف وکمالات وہنر کو اجاگر کرنے اور لوگوں کے سامنے پیش کرنے کا اصل حق ان کے رفقاء کار اور احباب ومخلصین کو حاصل ہے، راقم السطور کا بس ان سے وہ تعلق تھا جو ایک قاری کا اپنے محبوب مصنف اور فنکار سے ہوتا ہے۔ اس نے ان کو اصلاً ان کی تحریروں کے آئینہ میں دیکھا تھا۔ لیکن محمد الحسنی صاحب کے ماحول اور خاندانی پس منظر سے واقف کار قاری کے لئے ان کے سرچشمہ فکر وفن اور شخصیت کے تخلیقی عناصر کا سراغ لگانا زیادہ دشوار نہیں ہے، ان کے فکر وفن کا اصل سرچشمہ اور سب سے پہلا تخلیقی عنصر خود ان کے گھر کا ماحول ہے جس کی قابل فخر روایات رہی ہیں وہ اس خاندان کے چشم وچراغ تھے جس کا نسبی اور معنوی رشتہ سید احمد شہید سے ہے اور جو علماء اور مصنفین کا خانوادہ ہے اور "ہمہ آفتاب است" کا مصداق ہے۔ یقیناً محمد الحسنی صاحب نے جب عقل وشعور کی آنکھیں کھولی ہوں گی تو گھر میں ہر طرف دین کا چرچا رہا ہوگا، صحابہ کرام کے تذکرے ہوں گے۔ انھوں نے اسلامی تاریخ اور غزوات کے قصے سنے ہوں گے، سید احمد شہید کے جہاد کی داستان ان کے کانوں میں پڑی ہوگی۔ اسلام کی عظمت رفتہ کی کہانیاں ان کی یادداشت کا سرمایہ بن رہی ہوں گی۔ عمر کی یہ پہلی منزل سادہ ورق کے مانند ہوتی ہے، اس پر جو نقش بنایا جاتا ہے وہ نقش کالحجر ہوجاتا ہے، بچہ کے پیدا ہوتے ہی اس کے کان میں اذان دینے کی حکمت یہی ہے۔ مولانا محمد الحسنی کے دل میں بھی گھر کے ماحول کی وجہ سے اسلام سے والہانہ محبت اور اس پر یقین دل میں پیدا ہوچکا ہوگا۔ اور انھیں بھی خوش نصیب عاشقوں کی طرح یہ شعر پڑھنے کا حق ہوگا ؎

اتانی هواها قبل ان اعرف الهوى
فصادف قلبا فارغا فتمكنا

ان کی شخصیت کی تشکیل کا دوسرا عنصر ان کے والد ڈاکٹر حکیم مولانا عبد العلی حسنیؒ کی تعلیم وتربیت ہے۔ مولانا عبد العلی ندوۃ العلماء کے ناظم تھے، ان کی شخصیت میں جدید وقدیم کا خوشگوار امتزاج تھا۔ انھوں نے ندوۃ العلماء میں بھی تعلیم پائی تھی اور یونیورسٹی میں بھی۔ وہ میڈیکل کالج کے سند یافتہ اور شہر کے مقبول معالج تھے۔ جسمانی امراض کے طبیب ہونے کے ساتھ امراض باطنی وروحانی کے بھی معالج

اور حکیم تھے، ایسے عالم باعمل باخبر اور ہوش مند والد کی صحیح تربیت و تعلیم نے صحیح مزاج اور صحیح ذوق بنایا تھا "صلاحیت" یقیناً قابل قدر چیز ہے لیکن "صالحیت" کا مرتبہ زیادہ بڑا ہے۔ ہر شخص جو ذرا ذہین ہو اور اسے کتابوں کے مطالعہ کا موقع مل جائے، وہ ایک اسکالر بن سکتا ہے لیکن صالحیت کا تعلق طبیعت کے اعتدال اور مزاج کے توازن سے ہے اور یہ دولت صحیح تربیت اور نگرانی اور بڑی ریاضت کے بعد حاصل ہوتی ہے۔

تیسرا عنصر ہندوستان کی نامور شخصیت مولانا ابوالحسن علی صاحب ندوی کی صحبت اور رفاقت ہے، مولانا کو دنیا اسلام کے دردمند داعی، مفکر، بلند پایہ مصنف اور اُردو اور عربی زبان کے انشاپرداز کی حیثیت سے جانتی ہے۔ محمد الحسنی صاحب ان کے حقیقی برادرزادہ فرزند معنوی دست راست اور معین و مددگار تھے، انھوں نے اپنے چچا کی بیشتر کتابوں کا اُردو میں اور کچھ اردو تحریروں کا عربی میں ترجمہ کیا تھا، تصنیفی کاموں میں چچا کے ساتھ معاونت اور ان کی صحبت نے فکر و ذوق کے اشتراک کے ساتھ انداز تحریر میں بھی یکسانیت پیدا کر دی تھی، اسلامی ذوق کے ساتھ عربی زبان میں انکی انشاپردازی کو جلا بخشنے میں مولانا کی تربیت کا بڑا حصہ ہے، افسوس ہے کہ مولانا کو اس عمر میں یہ صدمہ اٹھانا پڑا جو اب ان کے لئے دل کا داغ اور سینہ کا چراغ بن چکا ہے ع

جن کے رتبے ہیں سوا ان کو سوا مشکل ہے

چوتھا عنصر عرب کے مسلم ادبا و مفکرین جمال الدین افغانی، محمد عبدہٗ اور اخوان المسلمون کے رہنماؤں حسن البناء اور سید قطب وغیرہ کی تحریروں کا مطالعہ اور ان سے اکتساب ہے۔ اسلامی ذوق قرآن کے مطالعہ اور عربی زبان کے اسلامی ادیبوں سے کسب فیض کے نتیجہ میں ان کا ایک منفرد اسلوب بن گیا تھا جس میں خیال و فکر کی روشنی بھی تھی اور ایمان کی حرارت بھی۔ ان کی نثر میں قرآن کی آیات خوبصورت اور فنکارانہ طریقہ سے نگینہ کی طرح مرصع نظر آتی ہیں۔

پانچواں اور غالباً سب سے طاقت ور عنصر وہ حساس دل اور اثر پذیر طبیعت ہے جس کے بغیر کوئی ادیب ادیب اور کوئی فن کار، فن کار نہیں بنتا ہے۔ دل بے تاب اور شب بے خواب کی جراحتیں اگر میسر نہ ہوں تو قلم سے کوئی اثر انگیز تحریر نہیں نکلتی ہے، محمد حسنی صاحب کی ابتدائی تعلیم و تربیت اور ماحول نے اسلامی افکار و اقدار کا عشق ان کے دل میں پیدا کر دیا تھا، لیکن جب بعد میں انھیں عربی زبان

میں شائع ہونے والے اخبارات و رسائل کے مطالعہ کا موقع ملا تو انھیں یہ محسوس ہوا کہ اسلامی تہذیب کے مرکزوں میں اسلامی افکار و اقدار پر حملے ہو رہے ہیں اور ان پر تیشہ زنی اور ان کی بیخ کنی ہو رہی ہے جنھیں مسلمانوں کا رہبر ہونا چاہئے تھا وہ رہزنوں کا کردار ادا کر رہے ہیں، زندگی کی حقیقتیں جب فنکار کے عقائد اور ایمان سے ٹکراتی ہیں تو اس ٹکراؤ سے شدید کرب اور کشمکش کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ یہی کیفیت ادب کے بہترین شہ پاروں کی خالق اور ان کا سرچشمہ ہوتی ہے، اس کشمکش اور کرب نے محمد حسنی صاحب کی تحریروں میں وہ کیفیت پیدا کر دی تھی جس میں آبشاروں کا سا جوش اور پہاڑی ندی کی سی روانی پائی جاتی تھی۔ جس میں خطابت بھی تھی۔ جذبات کی گرم آنچ بھی تھی اور شکستہ دل کی فریاد بھی۔

اگرچہ عربی زبان ان کے قلم کی جولانگاہ اور ان کا اصل میدان تھی، لیکن انھوں نے اُردو میں بھی تصنیف اور ترجمہ کا بڑا کام کیا ہے۔ ان کے ترجمہ میں بڑی سلاست اور روانی تھی۔ اصل متن کی خوبی اور اس کے اسلوب کو منتقل کرنے میں انھیں بڑی مہارت حاصل تھی۔ ان کا شمار ان باکمال مترجمین میں کیا جا سکتا ہے جن کا ترجمہ اکثر تخلیق کا حریف بن جاتا ہے۔ ندوۃ العلماء میں جب تحقیقات و نشریات اسلام کا شعبہ قائم ہوا تو اس شعبہ کی طرف سے اُردو داں طبقہ کو سب سے پہلے ایک سیرت کی کتاب کا تحفہ ملا۔ ڈاکٹر آصف قدوائی کی کتاب "مقالات سیرت" پر مولانا اکبر آبادی نے تبصرہ کیا تھا کہ یہ بعض اعتبار سے "خطبات مدراس" پر فوقیت رکھتی ہے، اس کے بعد اس شعبہ کی جانب سے مشہور جرمن نومسلم محمد اسد صاحب کی کتاب The Road to Mecca کا اُردو ترجمہ "طوفان سے ساحل تک" کے نام سے شائع ہوا۔ کوثر و تسنیم کی دھلی ہوئی زبان اور خوبصورت پیشکش کی وجہ سے اس کتاب کی کافی پذیرائی ہوئی۔ یہ ترجمہ محمد الحسنی کے قلم سے تھا۔ اُردو میں ان کی دوسری کتاب سوانح مولانا محمد علی مونگیری شائع ہوئی۔ یہ سوانح بھی ہے اور ندوۃ العلماء کی تاریخ بھی۔ اور پھر مولانا علی میاں صاحب کی بہت سی کتابوں کے ترجمے شائع ہوئے۔ کچھ دنوں تک انھوں نے انگریزی اور عربی دونوں زبانوں میں ایک پندرہ روزہ یا ماہنامہ جریدہ نکالا تھا جو اصلاً دنیائے اسلام کے اتحاد کا داعی اور نقیب تھا۔

لہ مولانا محمد میاں مرحوم نے رابطہ اسلامی International Cultural Islamic organization بقیہ اگلے صفحہ پر

انھوں نے اس کے لئے عملی اقدامات بھی شروع کئے تھے لیکن یہ کام غالباً وسائل کی کمی کی وجہ سے آگے نہیں بڑھ سکا۔ لیکن آگے چل کر رابطہ عالم اسلامی (مکہ مکرمہ) کی شکل میں یہ تحریک زیادہ بہتر اور طاقت ور طور پر سامنے آئی اور اس طرح سے ان کا خواب پورا ہوا۔

مولانا محمد الحسنی کی مرگ ناگہانی صرف ندوۃ العلماء کا نہیں بلکہ عالم اسلام کا نقصان ہے، آج مسلم ممالک اسلامی نظام اور غیر اسلامی نظام کے دوراہے پر کھڑے ہیں، عالم عربی نئی کروٹ لے رہا ہے۔ بین الاقوامی سیاست کا مرکز ثقل بدل رہا ہے۔ اس نازک وقت میں عرب ممالک کے اسلام پسند حلقوں کو تازہ کمک کی ضرورت تھی اور اس قلم کی ضرورت تھی جو ہمیشہ عربوں کو لذت کردار اور جرأت اندیشہ پیدا کرنے کی پرزور تلقین کرتا رہا ہے، لیکن مشیت الٰہی کے فیصلے ضروری نہیں کہ سمجھ میں آجائیں۔ ہمیں بہرحال صبر و تسلیم و رضا کا حکم ملا ہے اور مقام شکر مقام صبر سے بہتر برتر اور بلند تر ہے۔

کے نام سے ایک انجمن قائم کی تھی اور اس کا خبرنامہ بہ یک وقت عربی اور انگریزی میں شائع ہوتا تھا۔ اشاعت تاریخ نہیں مقرر تھی۔ اس کے چند ہی شمارے نکل سکے تھے۔

"ہمہ گریاں"... "توخنداں"

از: محمد برہان الدین سنبھلی (ناظم مجلس تحقیقات شرعیہ ندوۃ العلماء۔ لکھنؤ)

ادھر چند مہینوں کی مختصر سی مدت کے اندر جس سرعت کے ساتھ جتنی اور جیسی ممتاز شخصیتوں کے وجود سے، خاص طور پر برصغیر کے مسلمانوں کا محروم ہونا مقدر ہوا ماضی میں اس کی مثال ڈھونڈھے سے بھی ملنا شاید مشکل ہو، یوں تو ان جانے والوں میں سے ہر ایک اپنی مخصوص صلاحیتوں اور بعض خصوصیتوں کے لحاظ سے منفرد تھا کہ اس کے چلے جانے سے ایسا خلا پیدا ہو گیا جس کا جلد پُر ہونا دشوار، بلکہ بعض کا جانشین ملنا عجب نہیں کہ اس قحط الرجال کے دور میں ناممکن ہی ہو، لیکن ان سب میں مولانا محمد الحسنی (ایڈیٹر البعث الاسلامی)، جن کے لئے چند مہینے پہلے "سلمہ" اور "مدظلہ"، جیسے دعائیہ کلمات استعمال کئے جاتے تھے اور مستقبل کی نہ جانے کتنی امیدیں ان کی ذات سے وابستہ تھیں! افسوس! کہ آج انہیں "رحمہ اللہ" اور "تغمدہ اللہ بغفرانہ" کے ساتھ یاد کرنا اور مرحوم لکھنا پڑ رہا ہے۔ ان) کا حادثۂ وفات مختلف حیثیتوں سے سب سے بڑھ کر اندوہ گیں ہی نہیں، عظیم قلمی و فکری خسارہ بھی ہے۔ مرحوم، عالم اسلام کے مشہور مفکر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندوی مدظلہ العالی کے نہ صرف قوتِ بازو اور ان کے افکار و نظریات کے مستند ترجمان تھے بلکہ خود بھی اپنے پہلو کے اندر ملت کے غم میں گھلنے والا دل اور اس کی صلاح و فلاح کی فکر کرنے والا دماغ رکھتے تھے، مبدأ فیاض سے موصوف کو دلِ دردمند اور فکرِ ارجمند کے ساتھ زبان ہوشمند بھی عطا ہوئی تھی کہ اپنے ہی نہیں غیر بھی اس کی قوت تاثیر، حقائق کی سچی تصویر کھینچنے نیز ملی بیماریوں کی تشخیص اور ان کے ازالہ کے لئے بے خطا نسخے تجویز کرنے میں مرحوم کا امتیاز تسلیم کرنے پر مجبور تھے۔ ان پہلوؤں پر زیر نظر خصوصی شمارہ میں ایک سے بڑھ کر ایک آپ مضامین ملاحظہ کریں گے اور میرا اس بارے میں لکھنا شاید تکرار کے سوا کچھ نہ ہوگا، مجھے تو بس اصلاً یہاں اپنے اس تأثر بلکہ مشاہدہ کا اظہار کرنا ہے جو اس مسافرِ آخرت کا چہرہ، آخری وقت دیکھ کر ہوا۔ واقعہ یہ ہے (جس کا اظہار میں نے موصوف کی وفات کے دوسرے دن ہونے والے جلسۂ تعزیت کے اندر "الاصلاح"، کے جمالیہ ہال میں اپنی مختصر تقریر کے دوران بھی کیا تھا) کہ مرحوم کا چہرہ بہت پُرانوار تھا اور اس پر صاف مسکراہٹ کھیل رہی تھی، گویا "وجوہٌ

یومئذٍ مسفرة ضاحکة مستبشرة" (آخری دن کچھ چہرے کھلے ہوئے اور تبسم ریز ہوں گے) کی عملی اور واقعاتی تفسیر بنا ہوا تھا۔

سیرت طیبہ کا جب ہم مطالعہ کرتے ہیں تو اللہ کے آخری پیغمبر رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اخلاقِ عظیمہ کی فہرست میں یہ اوصاف حمیدہ بھی ملتے ہیں "کان یتفقد اصحابہ" (ساتھیوں کے احوال سے آگہی رکھتے تاکہ ان کی ضرورتیں پورا کرنے کا اہتمام فرمائیں)۔ "یحسن الحسن ویقویہ" (اچھائیوں پر تحسین اور حوصلہ افزائی فرماتے)۔ "لا یجب جلیسہ أن احدًا اکرم علیہ منہ" (ہر ایک ہم نشیں یہی سمجھتا کہ مجھ سے زیادہ بہتر ان کے کسی سے تعلقات نہیں)۔ "لم یکن فاحشًا ولا متفحشًا" (بدگوئی و بدتمیزی کبھی نہ کرتے)۔ "ما رأیتہ منتصرًا لنفسہ" (راوی کہتے ہیں کہ اپنی ذات کے لئے کسی سے بھی آپ کو انتقام لیتے میں نے کبھی نہیں دیکھا) مولانا محمد میاں مرحوم سے تعلق رکھنے والے شہادت دیں گے کہ موصوف نے اپنے نانا جان (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ان اوصاف کریمانہ کو خاص طور پر اپنی زندگی کا جزو بنا لیا تھا۔ اس کا لازمی نتیجہ ان کے مقبول اور ہر دل عزیز بن جانے کی شکل میں ظاہر ہونا ہی چاہیئے تھا، جو ہوا۔ چنانچہ ان کی جدائی پر ہر واقف کی آنکھ اشکبار اور دل سوگوار تھا اور گویا عارف رومی کی نصیحت ؎

یاد داری کہ وقت زادنِ تو ہمہ خنداں بدند تو گریاں
ہم چناں زی کہ وقت مردنِ تو ہمہ گریاں شوند تو خنداں

پر عمل پیرا ہونے کے نتیجہ میں ان کی ہی تعبیر کے مطابق پورا مجمع "ہمہ گریاں" کا نمونہ تھا اور مرحوم "تو خنداں" کا مصداق۔ (فاعلی اللہ درجتہ واکرم منزلہ) اس گریہ و زاری میں موصوف کی خوبیوں کا اعتراف تو پنہاں تھا ہی اس کے ساتھ جواں مرگی (صرف ۴۴ سال) کی وجہ سے ان کی ذات سے وابستہ مستقبل کی غیر معمولی توقعات کے شکست و ریخت ہو جانے کا احساس بھی کچھ کم نہ تھا۔ لیکن امت مسلمہ اس طرح کے غیر معمولی اور جواں مرگی کے حادثہ سے پہلی بار دوچار نہیں ہو رہی تھی بلکہ اس سے قبل بھی سینکڑوں نہیں شاید ہزاروں اپنے اپنے زمانہ کے عبقری اور علم کی روشنی سے عالم کو منور کر دینے والی عظیم ترین شخصیتوں کا صدمہ اسے برداشت کر لینے اور اس پر صبر کرنے کی اللہ نے بار بار نہ صرف توفیق بخشی ہے بلکہ بسا اوقات انکا بہترین بدل بھی عطا کیا ہے جس سے امت کا غم ہی ہلکا نہیں ہو گیا وہ خلا بھی پُر ہو گیا ہے جو جانے والے نے چھوڑا

تھا۔ اور شاید ایک غیبی آواز میں اسی بات کی خوش خبری سنا کر ڈھارس بندھائی گئی تھی (جو اس وقت سنی گئی جب امت کے بہترین افراد خیر البشر (صلی اللہ علیہ وسلم) کے حادثۂ وفات سے نڈھال ہو رہے تھے) جس کے سننے والوں میں خلیفۂ رابع حضرت علی کرم اللہ وجہہ بھی شامل تھے، کہنے والا کہہ رہا تھا "ان فی اللہ عزاءً من کل مصیبۃ، وخلفًا من کل ھالک، ودرکًا من کل فائت فباللہ فاثقوا وایاہ فارجوا فانما المصاب من حُرِمَ الثواب"۔ (اللہ کی بتائی ہوئی راہ اختیار کرنے سے ہی ہر مصیبت ہلکی ہو سکتی ہے اور ہر جانے والے کا بدل مل سکتا اور ہر نقصان کی تلافی ہو سکتی ہے اس لئے (اس موقع پر بھی) خدائے تعالیٰ کی نافرمانی سے بچو اور اسی سے تمام امیدیں وابستہ رکھو کہ دراصل مصیبت زدہ وہ شخص ہے جو کہ (صبر نہ کرنے کی وجہ سے) ثواب سے محروم رہ جائے) کون کہہ سکتا ہے کہ ایسا عظیم صدمہ برداشت کر لے جانے اور صحابہؓ جیسے جاں نثاروں کی ڈھارس بندھانے میں یہ کلمات بے اثر رہے ہوں گے؟ آج بھی یقیناً یہی کلمات وجہ تسکین اور موجب تسلی ہو سکتے ہیں جیسا کہ پہلے ہو چکے ہیں۔ تاریخ کے مطالعہ سے امت مرحومہ کی صف کے ہمیں سینکڑوں، کم سنی میں وفات پا جانے والے عباقرہ نظر آتے ہیں ان میں سے بس چند کا تذکرہ یہاں کیا جا رہا ہے۔

۱۔ مکہ مکرمہ کے سب سے پہلے مسلمان گورنر (جنہیں یہ عظیم منصب خود اکرم الخلائق وافضل الرسل صلی اللہ علیہ وسلم نے عطا کیا تھا) جو دیگر کمالات کے حامل ہونے کے علاوہ بہادری کے وصف کے اندر عجم ہی میں نہیں، عرب میں بھی ممتاز سمجھے جاتے تھے اور جن کی اصابت رائے پر بھی اعتماد کیا جاتا تھا یعنی حضرت عتاب بن اسیدؓ متوفی ۱۳ھ وہ صرف ۲۶ سال کی عمر میں عالم بالا کی طرف روانہ ہو گئے۔

۲۔ دین حنیف کا سب سے پہلا مجدد اور پانچویں خلیفۂ راشد جنہوں نے عدل و انصاف سے دنیا کو بھر دیا تھا، یعنی عمر بن عبد العزیز (متوفی ۱۰۱ھ) صرف ۳۹ سال کی عمر میں اس دنیا سے رخصت ہو گئے اور اپنے پیچھے ساری اسلامی دنیا کو غمزدہ چھوڑ گئے۔

۳۔ جلیل القدر محدث اور نادرۂ روزگار فقیہ اور شارح حدیث علامہ محی الدین ابو زکریا یحییٰ بن شرف النووی (متوفی ۶۷۶ھ) صرف ۴۵ سال کی عمر پاکر جہانِ فانی سے اس حال میں رخصت ہوئے کہ حدیث کی جلیل القدر خدمات انجام دے کر ایک عالم کو اپنا گرویدہ، اور فن شریف میں بیش بہا اضافہ کر کے رہتی دنیا تک بقائے دوام کا سامان اور آخرت کے لئے زادِ راہ فراہم کر چکے تھے۔ (فرحمہ اللہ

وارضاہ)۔

۴۔ مشہور شافعی محقق وفقیہ اور مورخ علامہ عبدالوہاب بن علی عرف تاج الدین السبکی (متوفی ۷۷۱ھ) صرف ۴۴ سال دنیا میں رہ کر عالمِ بقا کو سدھارے۔ اس مختصر سی مہلت میں علامۂ موصوف نے علمی کارناموں کی وجہ سے دنیا سے اپنا لوہا منوالیا تھا، اور شاید اسی امتیاز کی وجہ سے شام کے قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) کا عہدہ انہیں سونپا گیا۔

۵۔ اسی ہندوستان (بلکہ اسی شہر لکھنؤ) کے ممتاز محقق، محدث وفقیہ (جن کی جلالتِ شان کا اعتراف ان سے علمی وفکری اختلاف رکھنے والوں نے بھی کیا) حضرت مولانا عبدالحی فرنگی محلی (متوفی ۱۳۰۴ھ) صرف ۳۸۔۳۹ سال کی عمر میں علمی دنیا کو اپنی بیش قیمت کتابوں سے مالا مال کر کے روانہ ہو گئے اور اپنے پیچھے درجنوں موضوعات پر تصنیفات کا (جن میں حدیث وفقہ کا حصہ سب سے بڑھا ہوا ہے) پورا ایک کتب خانہ چھوڑ گئے، جس کی قدر دانی آج عرب سے عجم تک سارے عالم میں کی جا رہی ہے اور اس کی اہمیت کا اعتراف عرب علماء کی تعلیقات وحواشی کے ساتھ پے در پے اشاعتوں سے ہو رہا ہے۔

۶۔ ہندوستان میں اسلامی اقتدار کے خاتمے اور دشمنانِ اسلام، انگریزوں کے تسلط کے بعد دین کی بقا کے جب لالے پڑ گئے اور بظاہر حالات اس کے ختم یا کمزور ہو جانے (لا قدر اللہ) کا شدید خطرہ پیدا ہو گیا اس وقت خدا تعالیٰ نے دین قیم کی حفاظت کا سامان جس کے مبارک ہاتھوں کرایا۔ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ اس عظیم شخصیت نے صرف ۴۸۔۴۹ سال دنیا میں گذارے یعنی حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ (متوفی ۱۲۹۷ھ) جنھوں نے مستقل اسلامی قلعے تعمیر کرنے کے علاوہ اپنی خداداد ذہنی صلاحیتوں سے اسلام دشمن علمی حملوں کا ایسی جرأت اور کلامی قوت سے مقابلہ کیا کہ دینی وعلمی حلقوں نے انہیں "حجۃ الاسلام" کا خطاب دے کر ان کی اہمیت کا اعتراف کیا۔ (فبرّد اللہ مضجعہ وقدس سرہ)

۷۔ وہ شخصیت جسے "گوہرِ شب چراغ"، وقت کے سب سے بڑے عالم ندوی نے قرار دیا اس نے تو عالمِ فانی میں پوری تین دہائیاں بھی نہیں گذاریں مگر اس مختصر سی مدت میں اپنے علم وادب اور زہد وتقویٰ کا وہ نقش قائم کیا کہ جاننے والوں کو اس کی جدائی کے وقت کچھ ایسا محسوس ہوا کہ جیسے پوری علمی دنیا سوگوار بن گئی ہو اور اپنے پرائوں نے گویا خون کے آنسوؤں سے، اس کی جدائی پر ماتم کیا ہو، ہماری مراد، مولٰنا

عبدالرحمٰن نگرامی ندویؒ سے ہے (متوفی ۱۹۲۶ء) رحمہ اللہ وطاب ثراہ۔

۸۔ اور وہ عبقری جس نے سب سے پہلے یونانی علوم سے (عربی میں ترجمے کر کر کے) مسلمانوں کو روشناس کرایا، اور منصوری خلافت کے سکریٹریٹ میں چیف سکریٹری جیسے عہدۂ جلیلہ پر فائز ہوا، جسے علمی دنیا "کلیلہ ودمنہ" جیسی شہرۂ آفاق ادبی کتاب کے مترجم کی حیثیت سے جانتی ہے یعنی عبداللہ بن المقفع (متوفی ۱۴۲ھ) وہ صرف ۳۶ سال کی عمر میں یہ سارے کارنامے انجام دے کر دنیا سے رخصت ہو گیا۔

۹۔ عجم ہی نہیں عرب بھی جس کے بارِ احسان سے سبکدوش نہیں ہو سکتے کیونکہ اس نے عجمیوں کے لیے قرآن وحدیث کی زبان سیکھنے کا راستہ بنایا (بلکہ ایجاد کیا) جس پر چل کر لاکھوں نہیں کروڑوں انسان (بلکہ شاید اربوں) اللہ اور اس کے رسول کے کلام کو براہ راست سمجھنے لگ گئے یعنی عمرو بن عثمان ابن قنبر الحارثی عرف سیبویہ (متوفی ۱۸۰ھ) نے زندگی کی کل ۳۲ بہاریں دیکھیں اور اسی تھوڑی سی مہلت میں وہ ایسی کتاب دنیا کو دے گیا جس کے بارے میں سارے عالم کے اہلِ فن یک زبان ہو کر کہتے ہیں "لَمْ یُصْنَعْ قبلہٗ ولا بعدہٗ مِثْلُہٗ"۔ (نہ اس سے پہلے ایسی کوئی کتاب وجود میں آئی اور نہ اس کے بعد) یہ وہ سند ہے جو غالباً کسی اور انسانی تصنیف اور اس کے مصنف کو نہیں دی گئی۔

۱۰۔ جس کی ذکاوت ولیاقت کا شہرہ چار دانگ عالم میں پھیلا اور وزارت جیسے عالی منصب پر فائز ہو کر جس نے عہدہ کو زینت بخشی اور جسے ادبی دنیا "ابن العمید" (پورا نام علی بن محمد بن الحسین (متوفی ۳۶۶ھ) کے نام سے جانتی ہے اس نے صرف ۲۹ سال اس عالمِ آب وگل میں گذارے اور اسی مختصر مدت میں وہ پلا بڑھا، اور پڑھا بھی اور دنیا کو اپنی نہ صرف شاعرانہ صلاحیتوں سے مسحور کیا بلکہ تصنیفی سلیقہ اور ذکاوت فہم کا بھی لوہا منوالیا۔

علوم نبوت کے پھوٹنے والے چشمے اور نکلنے والے سوتے سے جاری ہونے والے بحرِ زخار کے یہ چند قطرے۔ یا دس بوندیں ہیں، جن کا مختصر تعارف کرانے اور ان کی ہلکی سی جھلک دکھانے پر اکتفا کیا جا رہا ہے۔ ہو سکتا ہے یہ تاریخی داستان مولانا محمد میاں مرحوم کے غمِ دفات کو ہلکا کرنے اور قادرِ مطلق کی طرف سے ان کا بدل (بلکہ نعم البدل) عطا ہونے کی امید بندھانے کا سبب بن جائے۔ (وما ذٰلک علی اللہ بعزیز)

مرا در دیست اندر دل...

نذر الحفیظ ندوی مقیم قاہرہ

یہ غالباً ۲۲ جون کی بات ہے حسب معمول ضروریات سے فارغ ہو کر اپنے مقالہ سے متعلق عربی ادب کی ایک کتاب دیکھ رہا تھا، اس میں یہ بحث تھی کہ مرثیہ کے موضوع پر کس شاعر نے اچھا شعر کہا ہے، کسی نے وما کان قیس ھلکہ ھلک واحد، ولکنہ بنیان قوم تھدما کو بہتر شعر قرار دیا ہے تو کسی نے ألا فلیجل الخطب ولیفدح الامر کو۔ اسی موازنہ کو پڑھ رہا تھا کہ ایک ندوی عزیز کا ریاض (سعودی عربیہ) سے خط آیا جس میں یہ روح فرسا اطلاع تھی کہ مولانا محمد میاں صاحب کا ۱۳ جون کو اچانک انتقال ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ یقین نہ آیا۔ دیر تک ہم اور برادرم عبد النور اسی سے متعلق گفتگو کرتے رہے، کئی ہفتہ تک حیرت اور ذہول کی کیفیت سے دوچار رہا۔ لیکن متعدد خطوط اور پھر آخر میں حضرت مولانا مدظلہ کے ایک غم نامہ سے اس کی تصدیق ہو گئی۔ مولانا محمد میاں کے انتقال سے ہزاروں میل دور بیٹھے ہم لوگوں پر جو اثر ہوا وہ بیان سے باہر ہے، اس لئے کہ ان کی وفات سے صرف ایک خاندان ہی نہیں پوری اسلامی برادری متاثر و غمگین ہے۔ اس اعتبار سے صدمہ غیر معمولی ہے۔

مولانا محمد الحسنی کی سیرت، اخلاق اور ان کے علمی و ادبی پہلوؤں پر لوگ لکھیں گے، ہم کچھ ذکر ان کے خطوط کا کرنا چاہتے ہیں، ان چند خطوط سے ان کی جو تصویر بنتی ہے وہ بڑی دل آویز، پاکیزہ و دلنواز شخصیت کی تصویر ہے، ایسی بولتی اور مسکراتی تصویر جس میں سارے جہاں کا درد ہے، مسلمانوں کے حالات کی فکر ہے، اسلامی دنیا کے سارے غموں اور مصائب کا اس پر عکس ہے۔ چلتے، پھرتے، سوتے جاگتے، خلوت و جلوت، گفتگو اور مضامین و مقالات اور ساری تگ و دو صرف دین کی سربلندی کے لئے! انہوں نے جس ماحول میں پرورش پائی تھی اس میں اسلام کی فکرمندی اور مسلمانوں کے حالات سے دردمندی طبیعت ثانیہ اور پورے نظام زندگی کی روح رواں بن گئی تھی، اس کا عکس البعث کے طاقتور اداریوں، الرائد میں حالات حاضرہ پر دردمندانہ تبصروں اور اردو میں ان کے سیاسی و ملی مضامین میں دیکھا جا سکتا ہے۔ یہی اضطراب و

بے چینی ان خطوط میں بھی ملتی ہے جو انہوں نے راقم الحروف اور برادرم نور عظیم ندوی کے نام لکھے تھے۔ اگرچہ یہ مکاتیب تعداد میں صرف چھ ہیں مگر تمام خطوط میں جو بات مشترک ملتی ہے وہ ان کا تواضع، اخلاق کی بلندی، اخلاص، عالم اسلام سے تعلق و فکر، اس کے حالات سے تشویش و اضطراب کا اظہار ہے۔

مولانا محمد میاں کے خطوط میں ان کی بے تکلف اور سادہ و دلنواز شخصیت کی جھلک ملتی ہے انکی ان مختصر تحریروں سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بیٹھے گفتگو کر رہے ہیں۔ ہنستے مسکراتے مختصر اور دلچسپ جملوں سے مخاطب کو گرویدہ بنا رہے ہیں۔ وہ صحیح معنی میں ایک اچھے اور باخبر صحافی اور دانشور تھے، مگر صحافیوں کے برعکس کثرت سے لکھتے نہیں تھے۔ ہم لوگ "ندائے ملت" سے تعلق کے زمانہ میں خاص نمبر نکالتے تو ان سے مشورہ کرتے اور کم از کم دو مضمون کی فرمائش کر دیتے، وہ حسب معمول مسکرا دیتے، انکار بھی نہ کرتے، لیکن روزانہ بعد مغرب حسنی فارمیسی میں ندائے ملت کے دفتر سے واپسی پر جب ندائے ملت کے خاص نمبر کا ذکر ہوتا تو ہم لوگ کہتے کہ سارے مضامین آچکے ہیں صرف آپ کا مضمون ابھی تک نہیں ملا۔ لکھنے کا وعدہ کرتے اور کہتے کہ ابھی تک موڈ نہیں بنا ہے۔ پھر جب وہ لکھتے تو اندرونی تقاضے سے لکھتے، کسی کی فرمائش پر نہیں، اسی لئے ان کے سارے مضامین اچھوتے اور منفرد ہوتے، ان میں ایک خاص پیغام ہوتا اور حالات حاضرہ کے بارے میں ایک نیا موقف پیش کیا جاتا۔

ہم اور برادرم عبد النور جب سے قاہرہ آئے دار العلوم سے خطوط کے ذریعہ برابر رابطہ قائم رہا صرف خیر و عافیت ہی پر یہ خطوط مشتمل نہ ہوتے، بلکہ ہم دونوں میں سے جو بھی خط لکھتا وہ اس کی کوشش کرتا کہ یہاں کے سیاسی حالات اور تبدیلیوں کے بارے میں مفصل خط لکھے، اس طرح کے خطوط پہلے استاذ گرامی مولانا محمد رابع صاحب کے نام جاتے، پھر آخر میں مولانا محمد میاں صاحب کے نام جانے لگے۔

مولانا محمد الحسنی کے نام متعدد خطوط مفصل لکھے گئے، اگرچہ آغاز میں انہوں نے جواب نہیں دیا مگر البعث والرائد کے صفحات پر ان کا عکس ضرور مل جاتا تھا پھر بعد میں انہوں نے خطوط کے جوابات دینے شروع کر دیے، عموماً سیاسی معلومات کا تبادلہ ہوتا، وہ مصر سے متعلق سوالات کرتے، ایک ایک چیز دریافت کرتے، فلاں مسئلہ پر تمام لوگوں کی کیا رائے ہے، فلاں نے ایسا بیان دیا ہے، اس پر وہاں کے دینی حلقوں کا کیا ردعمل ہے۔ فلاں مسئلہ میں ہم لوگوں کا کیا موقف ہونا چاہیے۔ صحیح صورت حال سے مطلع کرو۔

ہمارے نام مولانا محمد میاں کے جو خطوط ہیں ان کی تعداد چھ ہے، اگرچہ ان سب کا تعلق ان کی مقبول عام کتاب "الاسلام الممتحن" اور دوسری دو تصنیفوں سے ہے مگر ان سے بھی عالم اسلام کے نبض کی دھڑکن کا احساس ہوتا ہے، اسلامی دنیا میں مصر سے ان کو بڑا تعلق تھا، اس لئے کہ مصر کو قیادت کا مقام حاصل ہونے کی وجہ سے اس کی ہر بات کو نگاہ میں رکھتے، قابل گرفت بات پر سخت گرفت کرتے، تنقید کرتے اور اچھی باتوں کو سراہتے ۶۷ء کے بعد سے مصری نوجوانوں میں جو خوشگوار تبدیلی آئی تھی اس سے بڑے مسرور تھے، اور اسلامی دنیا اور خود مصر کے لئے اس کو فال نیک سے تعبیر کرتے تھے، اگرچہ مولانا محمد میاں صاحب نے مصر کا دورہ نہیں کیا لیکن یہاں کے حالات پر جتنی گہری اور مبصرانہ نظر ان کی تھی اس سے ان کی ذہانت، قوت مشاہدہ ومطالعہ کا اندازہ ہوتا ہے۔ مولانا سید الرحمٰن صاحب اور مولانا محمد واضح صاحب جب گذشتہ سال مصر کے دورہ پر آئے تو ان لوگوں نے اس کا اعتراف کیا کہ مصر کو سمجھنا مشکل ہے جب تک کہ اس کا دورہ نہ کر لیا جائے اور یہاں کے ہر حلقہ سے ملا نہ جائے، لیکن مولانا محمد الحسنی صاحب کے بارے میں مولانا واضح رشید صاحب کا کہنا تھا کہ محمد میاں نے جو رائے مصر کے بارے میں قائم کر لی ہے اگر وہ مصر کو دیکھ لیں جب بھی ان کی رائے میں کوئی تبدیلی نہ ہوگی۔

مولانا محمد میاں صاحب کا پہلا مکتوب ۱۵ مارچ ۷۰ء کا ہے جس میں انہوں نے اپنی پہلی عربی تصنیف کے نام کے سلسلہ میں لکھا ہے۔ کتاب کا پہلا نام "منہج الفکر الاسلامی السلیم" تھا جو ناشر کو پسند نہیں آیا، ہم نے نام کی تبدیلی کے بارے میں لکھا تو حسب ذیل جواب آیا۔

برادران مکرمان، مولانا نذر الحفیظ و نور عظیم صاحبان!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

آج پہلی بار آپ لوگوں کو خط لکھنے کی نوبت آرہی ہے، آپ حضرات کے دو تین خطوط اس پوری مدت میں ملے لیکن جواب میں بڑی کوتاہی ہوئی، اس کی مجھے ندامت ہے یہ خط ان خطوں کا جواب تو نہیں ہے اس لئے کہ اس کے لئے زیادہ تفصیل درکار ہے، یہ عجلت میں چند سطریں کتاب کے سلسلے میں لکھ رہے ہیں۔

آپ کے خط میں تھا کہ کتاب کا نام ان کو (ناشر) کچھ سوٹ نہیں کر رہا ہے، وہ کچھ

گرم چاہتے ہیں چنانچہ ہم غور کرتے رہے، کچھ زیادہ سمجھ میں نہ آیا، لیکن ایک اچھا نام چچا میاں مدظلہ، نے تجویز کر دیا ہے۔ دو روز ہوئے رائے بریلی آنہوں نے یہ نام بتایا اور کہا کہ فوراً ان کو لکھ دو۔

نام ہے "الاسلام الممتحن"، کتاب کی جو اسپرٹ ہے وہ اس کے مطابق معلوم ہوتا ہے، لیکن آپ لوگوں کی رائے افضل ہے، بہرحال یہ نام ان کو بتلایئے اور دیکھئے کیا کہتے ہیں۔ ہمارے خیال میں بہت اچھا ہے، جلدی اس لئے کر رہے ہیں کہ وقت کے بعد علم نہ ہو۔ بہرحال کتاب کا بہت اشتیاق ہے، ہمارے تحیات واشواق حسین عاشور (ناشر) تک پہونچا دیجئے گا اور کتاب کا تقاضا۔ اس کا اشتہار بھی "الدعوۃ" میں دیدیں تو اچھا ہے۔ بہت خوشی ہوئی کہ روداد چمن آپ لوگوں کو پسند آئی۔ آپ لوگ اجلاس میں شریک نہ تھے اس لئے اس میں ہر چیز نئی معلوم ہوتی ہوگی اور زیادہ لطف آیا ہوگا۔ کوشش کریں کہ "الدعوۃ" میں چچا میاں مدظلہ، کی تقریریں اور مضامین چھپتے رہیں تاکہ وہ حلقہ مانوس ہو۔ پاکستان کے نتائج کا علم ہوا ہوگا۔[1] یہاں کا نتیجہ باقی ہے، امید ہے کہ انشاء اللہ اچھا ہوگا۔

محمد الحسنی

یہ پہلا خط تھا اس کے بعد خطوط کا سلسلہ شروع ہو گیا، دوسرا مکتوب یکم دسمبر ۷۰ء کا لکھا ہوا مجھے تاخیر سے ۲۲ دسمبر کو ملا، یہ قدرے مفصل خط ہمارے اس خط کے جواب میں ہے جو ہم نے ان کی کتاب الاسلام الممتحن کی اشاعت ومقبولیت کے بارے میں لکھا تھا، کتاب کے متعلق یہاں کے نوجوانوں کے تاثرات اور اظہار پسندیدگی کے بارے میں تفصیلات لکھی تھی۔ اس کے جواب میں انتہائی تواضع اور خاکساری سے خط لکھا جو یہ ہے،

برادر محب مکرم نذر الحفیظ صاحب ندوی — السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

آپ کا عنایت نامہ بلکہ زیادہ صحیح الفاظ میں بشارت نامہ بہت سی خوش کن

---

[1] پاکستان و ہند کے عام انتخابات کی طرف اشارہ ہے۔

خبریں لئے ہوئے ملا تھا، افسوس ہے اور ندامت کہ پھر تاخیر کے ساتھ جواب دے رہا ہوں حالاں کہ یہ موقع تاخیر کا نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ معاف فرمائے۔

کتاب کا جو استقبال ہوا وہ ظاہر ہے کہ مصنف اور کتاب دونوں کی حیثیت سے زیادہ تھا، اس میں خدا کے فضل خاص اور شان ستّاری کے سوا کتاب کی تقدیم[1] اور آپ حضرات کے خلوص و محبّت اور محنت و تگ و دو کو بھی بہت دخل ہے، اس کا بدلہ اللہ تعالیٰ آپ کو دنیا و آخرت میں بہترین عطا فرمائے۔

خوشی ہوئی کہ کتاب اچھی اور دلنواز چھپی۔ چچا میاں مدظلہ، تو اس کو دیکھ کر اس قدر مسرور ہوئے کہ بیان کرنا مشکل ہے، پہلا نسخہ ان ہی کے ہاتھ میں پہونچا تھا، فالحمد للہ علیٰ ذلک حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فیہ۔

اس سے مزید مسرّت ہوئی کہ آپ دونوں بھی اسی زمانہ میں دائرۃ المصنفین[2] میں داخل ہوئے۔ برادر معظم مولانا محمد رابع صاحب کے خط سے اور چچا میاں مدظلہ، کے خط سے اس کی تفصیلات معلوم ہوئیں اب اس کو دیکھنے کا اشتیاق ہے۔

کل ہوائی ڈاک سے رجسٹرڈ الاسلام الممتحن کا ایک نسخہ تصحیح شدہ آپ کو ارسال کیا ہے، خدا کرے بحفاظت اور جلد مل جائے اور دوسرے ایڈیشن کی جلد اشاعت کی نوبت آسکے۔ تصحیحات ایک نظر آپ دیکھ لیں، اس کے علاوہ کسی جگہ آپ کو نظر پڑے تو ضرور اصلاح کر دیں۔ آپ نے خط میں لکھا ہے کہ اس طرز طباعت میں ایک اصلاح کر دو تو اور غلطیوں کا خطرہ ہو جاتا ہے، اس لحاظ سے ڈر ہے کہ کہیں اور گڑبڑ نہ ہو، آپ ذرا تکلیف کر کے مسئلہ کو سمجھ لیجئے گا، اور ان کو تاکید کر دیجئے گا۔ خدا کرے دوسرا ایڈیشن اس سے بہتر ہو، اور جاذب ہو۔

---

[1] کتاب کا مقدمہ حضرت مدظلہ نے تحریر فرمایا ہے، جو اپنی نوعیت کا منفرد، اچھوتا اور طاقتور مقدمہ ہے۔

[2] ہم دونوں کے ایم۔ اے کے رسالہ کی طرف اشارہ ہے، اسی زمانہ میں ہم دونوں نے عربی تنقید و ادب سے متعلق موضوعات کا انتخاب کر کے ازہر کے کلیۃ اللغۃ العربیۃ میں رجسٹرڈ کرایا تھا کہ تھیسس لکھ سکیں۔

الی القیادۃ العالمیۃ تیار ہے، چچا میاں مدظلہ، ملاحظہ فرمائیں تو فوراً بھیجی جا سکتی ہے، "مصر تتنفس"، نور عالم صاحب کے پاس صاف کرنے کے لئے ہے، امید ہے کہ وہ بھی جلد ہو جائے گی۔ یوں اس کے مضامین البعث سے ہم نے نکال لئے تھے، اور مرتب کر لیا تھا، لیکن مناسب معلوم ہوا کہ اس کی تبییض ہو جائے، اس طرح اغلاط کا خطرہ کم ہو جائے گا اور ترتیب وغیرہ واضح اور صاف ہو جائے گی۔ آپ ہمارے تحیات اور شکریہ کے بعد کہیں کہ کتاب کے اس ایڈیشن میں زیادہ تاخیر نہ کریں۔ ورنہ وہ بات نہ رہے گی، دوسرے یہ کہ حجاز وغیرہ میں کہیں کتاب کا وجود نہیں ہے، اس کی کوئی سبیل ہونی چاہیئے۔ دوسرا ایڈیشن وہاں جلد بھیجنے کا اہتمام کریں، اللہ تعالیٰ کی ذات سے امید ہے کہ وہاں بھی اس کی نکاسی ہو گی۔ اس کے متعدد مضامین تو خالص اسی معاشرہ اور زندگی سے متعلق ہیں بلا تصریح و تلمیح کے!

وہاں کے ندوی (ریاض و مدینہ منورہ میں زیر تعلیم ندوی طلبہ) اس کے بڑے مشتاق ہیں اور اس کو پھیلانے کے لئے تیار ہیں خاص طور پر عزیزان سلمان، سجاد اور وقار نے کتاب پڑھی ہے اور اس کے داعی بن گئے ہیں، ان لوگوں کے خطوط برابر آرہے ہیں کہ ہم کیا کریں یہاں کتاب ہی سرے سے نہیں پہونچی، غالباً کویت اور خلیج میں بھی نہ گئی ہو گی[1] کتاب پر کوئی تبصرہ نکلے تو اس کے تراشے ضرور ارسال کریں۔ الدعوۃ اور الاعتصام طویل عرصہ سے نہیں آرہا ہے، معلوم نہیں کیا بات ہے — جہاں تک الاعتصام کے لئے مقالات کا تعلق ہے بہتر یہ ہو گا کہ وہ یا الدعوۃ والے مصر تتنفس کے کچھ مضامین حلقہ وار شائع کریں، انتخاب آپ لوگ کر دیں گے، اس سے کتاب کے تعارف کی راہ بھی ہموار ہو گی اور وہ مضامین بھی انشاء اللہ پسند کئے جائیں گے اس لئے کہ اس موضوع سے ان سب کا جذباتی تعلق ہے[2]

---

[1] ناشر نے پہلے اڈیشن میں سے ڈھائی ڈھائی ہزار ریاض، کویت اور خلیج کے مکتبوں کو بھیجی تھی جو ناکافی ثابت ہوئی۔

[2] الاعتصام کے ایڈیٹر کے بار بار مطالبہ پر راقم الحروف نے مولانا محمد میاں صاحب سے درخواست کی تھی کہ الاعتصام کیلئے کوئی مضمون لکھدیا کریں، اسی کے جواب میں یہ سطریں ہیں۔

السیرۃ النبویہ[1] امید ہے کہ اب مارکیٹ میں آگئی ہوگی چچامیاں مدظلہ نے اپنے ہاتھ سے پہلی بار (بارہ سال بعد) ایک مکتوب آپ کو بھیجا ہے، یہ سعادت کسی اور کو حاصل نہ ہوسکی۔ دوسطریں عجلت کے ساتھ پشت پر ہم نے بھی لکھ دی تھیں کہ اس تاریخی مکتوب میں ہماری بھی شرکت ہوجائے۔[2]

نور صاحب کے والد کے انتقال سے بڑا رنج ہوا، اور خیال ہوا کہ ان پر کیا اثر پڑا ہوگا، یہ حادثہ بجائے خود بڑا ہوتا ہے لیکن دوری میں اس کا تاثر بڑھ جاتا ہے، اللہ تعالیٰ ان کو صبر وہمت وعزیمت سے کام لینے کی توفیق دے۔ ہماری طرف سے تعزیت پہنچادیں، یوں ان کو علٰحدہ خط انشاء اللہ لکھیں گے۔ ان کا مفصّل خط لیبیا سے آیا تھا، اور جس کو ایک انڈونیشی طالب علم کتاب کے دس نسخوں کے ساتھ لائے تھے اس پیکیٹ کے ساتھ دارالعلوم میں کسی جگہ ضائع ہوگیا، ایک نظر ڈال لی تھی اور سوچا تھا کہ اطمینان سے گھر جاکر دوپہر کی استراحت میں مزہ لے کر پڑھیں گے اور قذافی کا کچا چٹھا معلوم ہوگا۔ باتیں بہت رہ گئیں اور کاغذ ختم۔ اب انشاء اللہ آپ کے جواب کے بعد (جو خدا کرے جلد آئے) پھر لکھیں گے۔

البعث کے افتتاحیہ صلیبیۃ ولاصلاح الدین[3] لھا کے بارے میں کچھ بات آگے بڑھی؟ یہاں الحمد للہ سب خیریت ہے (الامور علیٰ مایرام) نئے تطورات سیاسیہ پر ضرور لکھیں، ہم لوگوں کا کیا موقف ہونا چاہیئے؟ ردعمل مصر میں کیا رہا؟[4] اخوان کی رائے کیا ہے؟ والسلام محمد الحسنی۔

تیسرا مکتوب ۱۶ دسمبر ۷۳ء کا لکھا ہوا ہے جو دوسرے خط کے لکھنے کے دوسرے ہی ہفتہ لکھا گیا تھا، وجہ یہ تھی کہ خط کے جواب میں تاخیر ہوئی تو ہم نے مولانا سعید الرحمٰن صاحب کے خط میں اس کی شکایت کی،

---

[1] حضرت مولانا مدظلہ کی نئی تصنیف جو قاہرہ سے چھپ رہی تھی۔

[2] افسوس ہے کہ یہ تاریخی مکتوب ڈاک ہی میں کہیں ضائع ہوگیا اور مکتوب الیہ اس سعادت سے محروم رہ گیا۔

[3] یہ طاقتور اداریہ تھا، خیال تھا کہ اس کو الگ سے پمفلٹ کی شکل میں شائع کردیا جائے وہ صورت تو نہ بن سکی البتہ الدعوۃ نے اس کا اقتباس اور الاعتصام نے پورا افتتاحیہ شائع کردیا۔

[4] مصری صدر کے دورہ اسرائیل کی طرف اشارہ ہے۔

جب انھیں شکایت پہنچی اس وقت تک وہ خط اور الاسلام الممتحن رجسٹرڈ ڈاک سے بھیج چکے تھے لیکن میرے شکایتی خط کے بعد پھر دوسرا مکتوب تحریر فرمایا جس میں پہلے خط کے مضمون کو مختصر کرکے لکھا (جس کے نقل کرنے کی ضرورت نہیں) اس کے بعد تحریر فرماتے ہیں،

"آپ کی کوششیں کامیاب اور بارآور ہوئیں اور کل الاخبار اور اخبار الیوم کے دو شمارے پہنچے۔ یہاں سے شکریہ کا خط اور البعث والرائد تبادلہ میں ہوائی ڈاک سے برابر انشاء اللہ پہنچتا رہے گا، کل جو پرچہ آیا ہے وہ ۱۲ دسمبر کا ہے، امید ہے کہ جلد اس سے رائے قائم کرنے اور وہاں کی صورت حال صحیح طور پر سمجھنے میں مدد ملے گی۔ لیکن آپ لکھیں کہ وہاں کے لوگوں کا کیا نقطۂ نظر ہے، الدعوۃ طویل عرصہ سے نہیں آرہا ہے نہ الاعتصام۔ ہم لوگ صرف المجتمع اور البلاغ پر گذارہ کررہے ہیں۔ البعث کا تازہ شمارہ امید ہے کہ ملا ہوگا۔ دونوں مضمون دیکھ کر اپنی رائے دیجئے گا۔ خاص طور پر الی الشباب الجامعی فی مصر (اگر وہاں کے حالات کے مطابق اور مفید ہو) تو علٰحدہ رسالہ کی شکل میں شائع کیا جاسکتا ہے، اگر آپ لوگ متفق ہوں تو حسین عاشور کو رائے دیں، آخری دو صفحہ کے اندر جہاں نئے حالات کی طرف اشارہ ہے معمولی تغیر اگر ضروری ہو تو کیا جاسکتا ہے۔ یہ لکھئے کہ کتاب بالکل ختم ہوگئی یا ابھی باقی ہے۔ کچھ پتے اس خط کے ہمراہ بھیجتے ہیں ان کو کتاب ضرور بھجوادیں ہوائی ڈاک سے۔ اس پر ہدیہ من المؤلف ضرور ہو۔ اس کے بعد کچھ پتے اور بھیجنا ہے لیکن اس سے پہلے آپ کے خط کا انتظار رہے گا تاکہ صحیح صورت حال سامنے آجائے۔ کوشش کریں کہ دوسرے ایڈیشن میں بہت تاخیر نہ ہو۔

خدا کا شکر ہے کہ السیرۃ النبویۃ منظر عام پر آگئی۔ چچامیاں مدظلہ خوش ہوئے اور آپ کے خط کے محتویات سنائے۔ المدینۃ اور البلاغ میں اس کا خلاصہ اور تبصرہ بھی نکلا ہے۔ چچامیاں انشاء اللہ ۲۸ دسمبر کو لکھنؤ سے حجاز کے لئے روانہ ہونگے اس وقت رائے بریلی میں ہیں۔ ۵۳ء میں ہمارے مصر میں دو دوست تھے، ایک احمد انس

الحجاجی جنھوں نے حسن البنا، پر کتابیں بھی لکھی تھیں، دوسرے فتحی العسال انہوں نے بھی حسن البنا، پر ایک کتاب غالباً الرجل الذی اشعل الثورۃ کے نام سے لکھی تھی۔ انس الحجاجی کا تو انتقال ہو چکا ہے اور فتحی العسال کا کچھ پتہ نہیں، کسی اخوانی سے کچھ پتہ لگ سکے تو ضرور لکھئے گا۔ نئے تطورات پر کیا لائن اختیار کی جائے، اس سلسلہ میں کچھ ارشادات ضرور لکھیں، نور صاحب کو بہت بہت سلام، اور مضمون واحد۔ آپ کو بہت سے کام لکھ دیے جو ہمارا مقام نہیں تھا، لیکن اس سے چارہ کار بھی نہیں تھا، امید ہے کہ معاف کر دیں گے۔ کوئی تبصرہ کتاب پر نکلے یا کسی کام کی اہم رائے ہو تو ضرور مطلع کریں،

محمد الحسنی

عالم اسلام کے حالات اور اس کے مد و جزر سے ہم ندوی (خاص ماحول میں نشو و نما پانے کی وجہ سے) غیر معمولی طور پر متاثر ہوتے ہیں اور اس کو ذاتی مسئلہ بنا لیتے ہیں، مسلمانوں کے معاملات کی فکر، عالم اسلام کے حالات پر اضطراب و بے چینی اس کے مصائب و مشکلات سے پریشانی، اس کی خوش کن خبروں سے مسرت، ان سب کا اظہار نجی مجلسوں، خط و کتابت کرتے ہیں، پھر آگے چل کر یہ خیالات و افکار مضامین کے قالب میں ڈھل جاتے ہیں اور بارہا یہ مضامین بین الاسلامی کانفرنسوں کے مناقشوں اور تجاویز پر اثر انداز ہوئے ہیں، اسلامی دنیا کے کتنے مسائل ہیں جنھیں البعث و الرائد نے مقامی حیثیت سے اٹھا کر بین الاقوامی کانفرنسوں میں پہنچا دیا، البعث کے طاقتور اور موثر اداریوں اور فکر انگیز مقالات نے اسلامی دنیا میں جو روح پھونکی ہے اور جن سخت اور مشکل حالات میں اس نے یہ کام انجام دیا ہے عرب ادیبوں اور دانشوروں نے اس کا اعتراف کھلے الفاظ میں کیا ہے، حالات و واقعات نے بھی اس کی شہادت دی ہے کہ ملوک و امراء اور سربراہ مملکت سے براہ راست ملاقات کی ضرورت سمجھی گئی تو جرات و صراحت کے ساتھ ان سے بھی خطاب کرنے اور اپنا پیغام پہونچانے سے گریز نہیں کیا گیا۔

مولانا محمد میاں کے خطوط جو انہوں نے راقم سطور اور برادرم نور کے نام لکھے ان سب میں ایک ہی نغمہ ملتا ہے اور وہ ہے اسلام اور مسلمانوں کی فکر۔ عالم اسلام کے حکمرانوں کا اندازِ فکر کیا ہے، ان ملکوں کے اخبارات حاکم کے حق میں کیسے کیسے دلائل فراہم کرتے ہیں، مختلف گروہوں اور جماعتوں کا نقطۂ نظر موجودہ

مسائل کے بارے میں کیا ہے۔ عوام اور حاکم کے درمیان طرز فکر میں جتنا غیر معمولی اختلاف عرب دنیا میں پایا جاتا ہے (خصوصاً مصر میں) وہ شاید ہی کہیں ہو، اس لئے مولانا محمد میاں ہمیشہ اس تگ و دو میں رہے کہ دینی حلقوں کا موجودہ حالات و واقعات کے سلسلہ میں رد عمل معلوم کریں، چنانچہ ہم لوگ مصر کے دینی حلقوں سے ملاقات اور مناقشوں کے بعد جو صورت حال ہوتی اس سے مطلع کرتے رہتے۔ ایک مکتوب سے جو انہوں نے ۱۵ جنوری ۷۸ء کو لکھا ہے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہاں کے ہر معمولی سے واقعہ سے مکتوب نگار کتنا پریشان ہو جاتا ہے، یہ خط ملاحظہ کیجئے اور لکھنے والے کے دلی اضطراب کا اندازہ کیجئے۔

برادر عزیز و مکرم ! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

یہ تیسرا یا چوتھا خط بطور یاد دہانی کے لکھ رہے ہیں، چونکہ طویل عرصہ سے کسی خط کی کوئی رسید نہیں ملی، نہ کتاب ملنے کی کوئی اطلاع، اس لئے تشویش ہے کہ آیا کوئی چیز پہونچی یا نہیں؟ اللہ تعالیٰ حفاظت فرمائے،

وہاں (مصر) کے حالات تو روز بروز بدلتے رہتے ہیں، کہیں سنسر اور دوسری پالیسی شروع ہو گئی تو سارا معاملہ ختم، سب کچھ چھپنا ہی دشوار ہو جائے گا، آج ریڈیو پر خبر تھی کہ سادات نے کسی مصری ہفتہ وار کو انٹرویو دیا ہے اور اسرائیل کو وارننگ دی ہے کہ اگر اس نے سمجھ سے کام نہ لیا تو پچھتانا پڑے گا، بیگن نے اس بیان کو افسوسناک قرار دیا ہے، آپ لوگوں کے خطوط کا یوں بھی انتظار رہتا ہے کہ اس سے صورت حال کو سمجھنے اور اس کی روشنی میں لکھنے میں مدد ملتی ہے، بہرحال جواب کا شدید انتظار ہے۔ یہ خط اپنے نام اور پتہ کی ہلکی تبدیلی کے ساتھ لکھتے ہیں احتیاطاً۔

یہ خط اسی لئے اختصار کے ساتھ لکھتے ہیں کہ پہونچنے کا یقین نہیں ہے، یہ اگر پہنچے تو فوراً جواب دیں تاکہ اطمینان ہو، مصر تنفس جو صاف اور مکمل حالت میں ہے اس لئے نہیں بھیجتے کہ کہیں ضائع نہ ہو۔ برادرم عبد النور صاحب کو بھی خط مفصل لکھ چکے ہیں، ان کو سلام کہیں، ہاں الدعوۃ اور الاعتصام سرے سے بند ہے، سمجھ میں نہیں آتا قصہ کیا ہے؟ بہرحال، الاسلام المستحن اور الی القیادۃ العالمیۃ کے بارے میں

مطلع کریں، چچا میاں مدظلہ، الحمد للہ بخیریت ہیں۔ اس ماہ کے آخر تک انشاء اللہ واپسی کی امید ہے۔

البعث و الرائد مل رہے ہیں یا نہیں، جواب ۲۔ گوئن روڈ کے پتہ پر دیں۔

سارے خطوط اور کتابیں دسمبر کے شروع میں بھیجے ہیں اس لئے تاخیر بہت ہو چکی اور تشویش ہے۔

محمد الحسنی

اگلا مکتوب ۱۵ مارچ ۳۸ء کا ہے جو قدرے تفصیل سے ہے اور ہم دونوں کے نام مشترک ہے، اس سے مکتوب نگار کی بے تکلفی و سادگی اور تواضع کے ساتھ اسلامی دنیا اور مسلمانوں کے متعلق فکر و اضطراب اور صحیح حالات سے واقفیت کی شدید خواہش کا اندازہ ہوتا ہے۔ عالم اسلام کی فلاح و بہبودی کی فکر، مسلمانوں کے مسائل و مشکلات اور ان کے مصائب سے درد مندی ان کی طبیعت ثانیہ بن گئی تھی، یہ درد ان کے جسم اور قوائے فکریہ میں اس طرح جذب ہو گیا تھا۔ شاخ گل میں جس طرح باد سحر گاہی کا نم،

اسی لئے اپنے تمام خطوط میں اس پہلو پر زیادہ توجہ دیتے، ان کے مضامین و مقالات کا ایک ایک حرف اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ ؎

مرا درد یست اندر دل چو می گویم زباں سوزد ؛؛ اگر دم در کشم ترسم کہ مغز استخواں سوزد

یہی درد ان کے خطوط میں ظاہر ہوتا ہے جو آگے چل کر آہ و فغاں میں تبدیل ہو جاتا اور پھر شدید اندرونی تقاضوں سے مجبور ہو کر قلم اٹھاتے تو خون جگر سے لکھتے اور مردہ دلوں کے لئے مسیحائی کا کام کر جاتے۔ آیئے پانچواں مکتوب پڑھتے ہیں:۔

برادران محبان و مکرمان۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہ،

خدا کرے آپ دونوں حضرات بہمہ وجوہ بعافیت ہوں، ہمارے لئے شاید کتاب لکھ دینا یا مضمون لکھ دینا آسان ہے لیکن خط لکھنا مشکل ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ آپ دونوں کو ایک ساتھ مخاطب کر رہے ہیں۔ یہ سوچ کر علیحدہ لکھنے کی فکر میں کہیں خط ہی نہ رہ جائے۔ برادرم نور صاحب کا خط تو اشاعت کے لئے تعمیر حیات میں دے چکے ہیں۔ آپ کا خط فی الحال سامنے ہے، پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ کا خط شیخ الازہر کے دعوت نامہ

کے ساتھ مل گیا[1] لیکن ان حالات میں ملا کر مولانا سید الرحمٰن صاحب کی طبیعت بہت خراب تھی کہ بروقت خط اور دعوت نامہ سے ان کو آگاہ بھی نہیں کیا گیا، ایک ہفتہ سے زائد بہت تکلیف میں گذرے، سر کا شدید درد مسلسل ایک ہفتہ رہا۔ اس کے علاوہ ریاحی تکلیفات پیٹ اور سینہ کا درد وغیرہ کی کوئی تکلیف نہیں ہے۔ آپ کا خط اور دعوت نامہ ان کو مل چکا ہے، ذرا ٹھیک ہوں تو پرواز کھولے جائیں، امید ہے کہ ان حضرات کا یہ دورہ آپ دونوں کی موجودگی کی وجہ سے دلچسپ بھی ثابت ہوگا اور متعدد حیثیتوں سے بار آور اور مفید بھی۔ وہ ظاہر ہے کہ پہلی فرصت میں آپ کو جواب لکھیں گے یا ہو سکتا ہے لکھ چکے ہوں، ابھی ملاقات ہوگی تو دریافت کریں گے یہ خط ندوہ کے مہمان خانہ سے لکھ رہے ہیں ادھر دو ایک روز سے پھر ٹھنڈک ہو گئی تھی، اولے بھی گرے اس لئے دھوپ کی لالچ میں یہاں بیٹھے ہیں۔

خدا کا شکر ہے کہ دونوں کتابیں بحفاظت پہنچ گئیں، بڑا سخت انتظار تھا، واقعی اندازہ ہوا کہ خط نہیں آتا تو کیا گذرتی ہے، اب دوسرا انتظار یہ شروع ہو گیا کہ دیکھئے دونوں چیزوں کی طباعت کی باری کب آتی ہے، جس عجلت سے آپ نے کتاب طلب کی تھی اس سے ہم بڑے خوش ہوئے تھے کہ شاید بہت جلد چھپے گی[2] کم از کم الاسلام الممتحن کا دوسرا

---

[1] شیخ الازہر ڈاکٹر عبد الحلیم محمود نے ازہر کی طرف سے دار العلوم کے دو استاذوں مولانا سید الاعظمی ندوی اور مولانا محمد واضح رشید ندوی کو مصر کے ثقافتی دورے کی دعوت دی تھی۔ [2] ہم نے ناشر کے کہنے اور تقاضے سے مولانا محمد میاں صاحب کو خط لکھ کر "الاسلام الممتحن" کا تصحیح شدہ نسخہ منگوالیا اور ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ مزید کتابیں تیار ہوں تو ارسال فرمائیں تاکہ آپ کی تصانیف مسلسل شائع ہوتی رہیں، میرے تقاضے پر انہوں نے مطلوبہ چیزیں ارسال کر دیں مگر ناشر نے ناسازگار حالات کا بہانہ بنا کر کتاب کی اشاعت ملتوی کر دی، البتہ "الاسلام الممتحن" کا دوسرا ایڈیشن شدید تقاضوں اور مکتوبوں کی مانگ سے مجبور ہو کر من و عن غلطیوں کے ساتھ آفسیٹ پر شائع کر دی۔ جب تک دوسرا ایڈیشن شائع ہوتا اس وقت تک حجاز سے تیسرا ایڈیشن شائع ہو چکا تھا۔ مکتوب نگار کا مطالبہ کتابوں کی اشاعت کا بڑھتا ہی گیا، میں ان سے سخت شرمندہ تھا کہ کتاب ابھی تک شائع نہ ہو سکی۔ اس لئے یہ کام ہم نے برادرم نور کے سپرد کر دیا کہ وہی ناشر سے تقاضہ کریں اور وہ جو جواب دیں اس سے مولانا محمد میاں کو مطلع کریں۔ مصریوں کی طبیعت یہ ہے کہ وہ وعدہ تو جلد کر لیتے ہیں مگر پورا نہیں کرتے۔ اس کا مجھے تلخ تجربہ ہوا۔ اور حضرت مولانا اور محمد میاں کے سامنے بارہا شرمندہ ہونا پڑا۔

ایڈیشن۔ بہرحال آپ تقاضہ ضرور کریں، ورنہ خطرہ ہے کہ زیادہ تاخیر ہوجائے گی۔ مصر تنفس پر نظر ثانی کر رہے تھے، مکمل ہوتے ہی وہ بھی ارسال کردیں گے۔

عزیزی سلمان سلمہ، کا خط آیا کہ کتاب مکتبۃ المھیمن (ریاض) میں مل گئی۔ کچھ نسخے خرید کر دوستوں اور اہم اشخاص کو دیئے، لیکن برادر مکرم طارق حسن عسکری سے معلوم ہوا کہ دوبارہ کتاب کو پوچھنے گئے تو معلوم ہوا کہ ختم ہوچکی ہے۔ اب پھر تعطل اور انتظار کی کیفیت ہے، وہ چاہتے تھے کہ مجاز کے لئے آفسیٹ پر چھپوالیں لیکن ایک تو المختار الاسلامی والے اس کی اجازت نہ دینگے، دوسرے غلطیاں بھی بہت ہیں اور اس حالت میں چھاپنا بھی ٹھیک نہیں۔

آپ حضرات کے خط سے وہاں کے حالات کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے، خاص طور پر عبدالنور صاحب کا مفصل خط اس سلسلہ میں بہت مفید ثابت ہوا۔ آپ کے تازہ خط سے یہ معلوم ہوا کہ مش معقول مش ممکن والا شمارہ ضبط کرلیا گیا۔ اس سلسلہ میں آپ کا خیال مناسب ہے[1]۔ یوں بھی وہ بالکل شروع میں لکھا گیا تھا اور اخوان کو سامنے رکھ کر خاص طور پر کویت کے اخوانی۔ اس لئے کچھ تیزی جان بوجھ کر برتی گئی تھی۔ الدعوۃ اور الاعتصام کے تراشے اور تمام چیزیں مل گئی تھیں۔ غالباً اس میں الرجل القرآنی کے کئی نسخے تھے، اس کو پورا تازہ البعث میں شائع کیا گیا ہے۔ چچا میاں مدظلہ کو بھی یہ رسالہ بیحد پسند آیا۔ اس کا اور مذکرات کے اوپر چچا میاں کے مقدمہ کا اردو ترجمہ یہاں غالباً ایک ساتھ شائع ہوگا۔ اس سے بڑی مسرت ہوئی کہ الی الشباب الجامعی فی مصر، اور صلیبیۃ ولاصلاح الدین لھا الاعتصام میں شائع ہونگے لیکن الدعوۃ تو مطلقاً بند ہے۔ الاعتصام بحری ڈاک سے کبھی کبھی آتا ہے اس لئے شائع ہوتے ہی تکلیف کرکے اس کو بھیجدیں تو اچھا ہے۔ اس سے مزید اطمینان ہوا کہ الی القیادۃ العالمیۃ آپ دونوں نے پسند کی اور حسین عاشور نے بھی۔ مقدمہ کسی قدر تشنہ اور ہلکا ہے، ہمارا احساس یہی تھا لیکن اس سے زیادہ اس وقت ممکن نہ ہوا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس کتاب کو بھی قبولیت و مقبولیت سے نوازے اور اچھے معیار پر شائع ہوں۔ بہرحال، آپ ان کو ہمارا اسلام

[1] صدر سادات کے دورۂ اسرائیل پر شدید لب و لہجہ میں یہ نوٹ لکھا گیا تھا۔ میں نے توجہ دلائی تھی کہ پرچہ اگر مصر میں چلانا ہے تو ذرا لہجہ نرم کرنا ہوگا، تاکہ یہ رسالے داخل ہوسکیں اور اپنی بات پہنچا سکیں۔

اور اشتیاق و انتظار ضرور پہنچادیں۔ یہ کہنے کی آپ سے ضرورت نہیں کہ ایک مصنف کو اپنی کتاب کا انتظار کتنا ہوتا ہے، خاص طور پر وہ جو "تازہ واردان بساط ہوائے دل" میں شامل ہو اور چونکہ قلم ہماری زبان کا قائم مقام ہوچکا ہے اس لئے انتظار بھی اسی لحاظ سے اشتق و اشد ہے۔ ہم تو سمجھتے تھے کہ الدعوۃ میں اس کا خصوصی استقبال ہوگا لیکن معلوم ہوا کہ ابھی تک تبصرہ بھی نہیں آیا۔ بہرحال حسین عاشور صاحب اشتہار دونوں کتابوں کا اس میں بھی دیدیں۔ ایک انٹرویو سے پتہ لگا ہے کہ الدعوۃ کی اشاعت ایک لاکھ سے اوپر ہے۔

اخبارات پہونچتے ہیں، دخان فی الھواء وغیرہ پہلے بھی ہم دیکھ لیتے تھے۔ بہ نسبت اور چیزوں کے اس میں کسی قدر جان ہوتی ہے[1]۔ خوشی ہوئی کہ البعث و الرائد کے سب پیکیٹ مل گئے۔ باتیں بہت ہیں لیکن جگہ ختم ہوچکی ہے اب آپ کے خط کا انتظار رہے گا جو خدا کرے اخبار سارۃ پر مشتمل ہو، اب سیاسی فضا بھی بارد نظر آرہی ہے۔ آج اخبار میں تھا کہ امریکہ اور اسرائیل میں شدید اختلافات پیدا ہوگئے ہیں۔ لیکن یہ سب در پردہ کھیل نظر آتا ہے۔ یوسف السباعی کا تو مصریوں نے حسب معمول بہت سوگ منایا[2]۔ کیا اخوان وفد کی طرح اپنی حزب خاص نہیں بنا رہے ہیں؟ ڈاکٹر اشتیاق صاحب کو آپ کا سلام پہنچادیا ہے انہوں نے آپ دونوں کو سلام لکھنے کے لئے کہا ہے۔ آپ لوگوں کو علم ہوگا کہ کرناٹک اور آندھرا میں اندرا کانگریس کی حکومت بن گئی ہے، مہاراشٹر میں آج ریڈی کانگریس اور اندرا کانگریس کی مشترکہ گورنمنٹ بن رہی ہے، تاہم جنتا پارٹی کا کوئی نقصان نہیں ہوا ہے۔

محمد الحسنی

ہم لوگوں نے مولانا محمد میاں صاحب کو مشورہ دیا تھا کہ الی القیادۃ العالمیۃ کا مقدمہ مختصر ہے، ذرا تفصیلی ہونا چاہیئے، دوسرے یہ کہ مضامین کے آغاز میں ایک تشریحی نوٹ ہونا چاہیئے یا تاریخ جس سے مقالہ کے پس منظر کو سمجھنے اور واقعات کی کڑی ملانے میں قاری کو سہولت ہو، انہوں نے ازراہ کرم اس کے مطابق ایک مفصل مقدمہ اور توضیحی حاشیے لکھ کر ارسال کردیے اس کی طرف اپنے آخری مکتوب مورخہ ۲۲ دسمبر ۷۸ء میں اشارہ کرتے

[1] الاخبار کا ایک مستقل کالم جو ایک مشہور مصری صحافی لکھتے تھے۔

[2] روزنامہ الاھرام کے چیف ایڈیٹر جنہیں قرص میں قتل کردیا گیا تھا۔

ہوئے لکھتے ہیں:۔

برادر عزیز و مکرم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

خدا کرے آپ بہمہ وجوہ بخیر و عافیت ہوں، معلوم نہیں عبد النور صاحب حج سے واپس آگئے یا نہیں، آگئے ہوں تو حج کی مبارکباد قبول کریں۔

اس سے پہلے عرصہ ہوا ایک خط بذریعہ رجسٹری ہوائی ڈاک سے ارسال کیا تھا اس میں مقدمہ اور اضافات و تشریحات بھی تھیں جو آپ لوگوں کے مشورہ اور حسین عاشور کی خواہش پر لکھی گئی تھیں اور ان کی ضرورت بھی تھی مقدمہ بھی بہت اہتمام سے ہم نے لکھا ہے اور صاف کر دلکے ارسال کیا ہے ایک آدھ جگہ خط کشیدہ عبارت ہے اس کا مطلب یہ تھا کہ یہ محل نظر ہیں کہ وہاں کے حالات میں کہاں تک مناسب رہیں گی۔ جواب آنے سے فکر و تشویش ہے۔ خدا کرے پہنچ گیا ہو۔

آج ہی ایک مفصل خط حسین عاشور کے نام لکھا ہے اور دونوں خط ایک ساتھ ڈال رہے ہیں عرصے آپ لوگوں کا خط نہیں آیا، حسین عاشور کے خط میں ہم نے سائر کے بارہ میں خاص طور پر لکھا ہے، خدا کرے ان کی سمجھ میں آجائے اور بھی بہت سی باتیں لکھی ہیں، الی القیادۃ العالمیۃ اور مصر تنفس کا شدید انتظار ہے۔ پتہ نہ چلا کہ دوسرے ایڈیشن کا کیا ہوا، کتاب بازار میں نظر آئی؟ اس لئے کہ انہوں نے لکھا تھا کہ پانچ ہزار سعودی عرب اور دو ہزار کویت بھیج رہے ہیں، آپ کو شاید علم ہوگا کہ طارق حسن عسکری صاحب نے کتاب کا ایک ایڈیشن اور شائع کیا ہے، غالباً عبد النور صاحب نے اسے حجاز میں دیکھا ہوگا، قاہرہ میں جب چھپنے میں تاخیر ہوئی تو انہوں نے چچا میاں سے اجازت لے کر چھاپا، اس کا سائز بھی دیسا ہی ہے اور بہت خوبصورت بھی ہے۔ شروع میں اس کا ذکر یوں نہیں کیا کہ معلوم نہیں حسین عاشور اس کو کیا محسوس کریں، ان کو ابھی اپنے نام سے چھاپنے کی اجازت نہ تھی، اس لئے دار عرفات کے نام سے شائع کیا ہے۔ الدعوۃ اور الاعتصام نہیں پہونچتا، کبھی کبھار معلوم نہیں کیا بات ہے، اب تو آپ لوگوں کی واپسی کا زمانہ بھی قریب آگیا ہے۔ کیا پروگرام ہے۔

مصر کی خبریں تو ایسی آتی ہیں جیسے ہنوز روز اول ہو، دیکھیں سفینہ کب ساحل مراد کو پہونچتا ہے، یہاں کی دلچسپ خبریں تو ملتی ہوں گی، کیا تبصرہ ہے[1]..... پر ایک مضمون الدعوۃ میں نکلا تھا وہ دیکھا ہے، کیا اب وہاں لوگ عام طور پر ایسا سوچ رہے ہیں؟ الی القیادۃ کی خوش خبری کب ملے گی؟

یہ خط ایک جانے کی جلدی تھی اس لئے بہت عجلت میں لکھا ہے، اس کی معذرت قبول کریں۔ تازہ البعث میں عبد الحلیم عویس کا ایک خط یا مضمون قوم و قعوانی غرام کے اوپر دیکھے گا۔

محمد الحسنی

یہ میرے نام آخری مکتوب تھا ورنہ برادرم نور کے نام خطوط کا سلسلہ وفات تک جاری رہا۔ آخری خط انہوں نے مئی کے دوسرے یا تیسرے ہفتہ میں لکھا تھا جس کا جواب یہاں سے ۱۲ جون کو لکھا گیا لیکن وہ ان سب چیزوں سے بے نیاز اپنے خالق کے حضور حاضر ہو چکے تھے۔

یہ چند مکاتیب تھے جو راقم الحروف کے نام مولانا محمد میاں صاحب نے لکھے تھے، ان خطوط سے مکتوب نگار کی جو تصویر بنتی ہے وہ آپ کے سامنے ہے۔ ایک ایک لفظ لکھنے والے کے قلبی احساس و اضطراب اور بے چینی کا پتہ دیتا ہے، یہ قلق اور پریشانی اپنی ذات و خاندان کے لئے نہیں بلکہ وسیع تر اسلامی برادری اور پوری اسلامی دنیا کے لئے تھی۔ دنیا کے کسی حصہ میں کسی مسلمان کے کانٹا چبھ جائے، اس پر کوئی مصیبت آجائے، مولانا محمد میاں اس کے لئے بے چین و مضطرب، الحاد و بے دینی کی ہوا کسی مسلم ملک میں چل رہی ہے اور نشر و اشاعت کے سارے ذرائع اس کی پشت پر ہیں، مگر مولانا محمد میاں کا قلم اس طوفان سے ٹکر لینے سے ذرا بھی نہیں جھجکتا، عرب قومیت اور ناصریت، عالم اسلام کے دو بڑے فتنے تھے جن کا ڈٹ کر مقابلہ اس طرح مولانا محمد میاں نے کیا کہ بڑے بڑے ادیبوں اور دانشوروں نے اس کا اعتراف کیا۔ لکھنے والے مولانا محمد میاں کی ان دینی خدمات پر تفصیل سے لکھیں گے مگر ان مندرجہ بالا مکاتیب سے مکتوب نگار کی سادگی و بے تکلفی اور تواضع و انکساری کا اظہار تو ہوتا ہی ہے، ان کی شرافت کا جوہر، بلند نظری، شخصیت کی دلنوازی، اسلام اور مسلمانوں کے لئے قلبی سوز و درد

[1] ایک "نئے ہندوستانی مفکر" کا نام۔

کا بھی احساس ہوتا ہے، ہم خوردوں اور طالب علموں کے ساتھ ان کا کیسا برتاؤ تھا، کس طرح اپنی تحریروں کے بارے میں تاثرات معلوم کرتے اور مختلف مسائل میں رائے معلوم کرتے، حالاں کہ عربی اردو دونوں کے وہ ادا شناس ادیب اور ایک منفرد اور اچھوتے اسلوب کے مالک مانے ہوئے صحافی تھے۔ وہ سب سے زیادہ باخبر صحافی اور دانشور مبصر تھے، حالات حاضرہ کے بارہ میں ان کی ایک خاص رائے تھی، وہ ایک منجھے ہوئے ادیب اور کہنہ مشق صحافی تھے ان کا وجود کسی بھی وقیع اردو عربی پرچہ کے لئے باعث رشک ہوسکتا تھا اور خاصی ماری سہولت حاصل کرسکتے تھے مگر ازانی اور قلم فروشی کے اس دور میں انہوں نے دین کی خدمت کو فرض سمجھا اور قلم کی آبرو کی حفاظت کی، انہوں نے بڑی کم عمری میں وفات پائی مگر کمیت اور کیفیت ہر لحاظ سے دین کی خاصی خدمت کر گئے۔ جب انہوں نے اپنے عم نامدار کی نگرانی میں "البعث الاسلامی" نکالا اس وقت پوری اسلامی دنیا صحیح اسلامی صحافت سے ناآشنا تھی۔ مولانا محمد میاں نے اخلاص و استقامت، اور عزم و ہمت سے اسلامی صحافت کو نشان راہ دکھائے، مسلم صحافت کو حالات حاضرہ پر بے لاگ تنقید اور سیاسی و معاشرتی مسائل کے بارے میں نئے زاویہ نظر اختیار کرنے کا ڈھنگ بتایا۔ میرے خیال میں موجودہ اسلام پسند ادیبوں اور صحافیوں میں مولانا محمد میاں پہلے شخص ہیں جنھوں نے استعمار کی ہر شکل و صورت کو خواہ وہ کتنے ہی پردوں میں ہو خوب بے نقاب کیا، مسلم ملکوں میں چلنے والی لادینی تحریکوں اور ان کے سرپرستوں نیز مسلم حکمرانوں پر جتنی سخت اور بے لاگ تعمیری تنقید مولانا محمد میاں نے کی اس کی مثال مشکل ہے۔

مولانا محمد میاں نے اپنی تحریروں سے مایوس دلوں کو امید کی روشنی عطا کی۔ دین کی طرف سے مدافعت کرنے والے کمزور ہو رہے تھے، مگر ان کی خون جگر سے لکھی تحریروں نے دین کے داعیوں میں نئی طاقت اور نئی روح پیدا کردی اور واعظوں اور خطیبوں نے ان کی تحریروں کو اپنے خطبات و تقریروں کا موضوع بنایا، ان کی پختہ اور ادیبانہ تحریر اور ان کی نوعمری نے اچھے اچھے لکھنے والوں کو حیرت میں ڈال دیا، حق کی مدافعت میں مولانا محمد میاں نے کسی قیمت پر بھی باطل سے صلح گوارہ نہیں کی، انہوں نے چومکھی لڑائی لڑی، البعث کے طاقتور اور موثر اداریے، الرائد کے تیکھے تبصرے اور تعمیر حیات کے سنجیدہ و شگفتہ مقالات، سب لکھنے والے کے دینی غیرت، حمیت اخلاص و للّٰہیت کی شہادت دیتے ہیں اور جب اپنے آقا و مولیٰ کے حضور وہ حاضر ہوں گے تو سفارش کریں گے کہ ؎

یہ بندہ دو عالم سے خفا تیرے لئے ہے

مولانا محمد میاں کی وفات ایک خاندان کا حادثہ نہیں عالم اسلام کے لئے سانحہ ہے۔ ہم سب اچانک وفات پر سوگوار اور مغموم ہیں۔ راقم الحروف نے ایک تعزیتی عریضہ حضرت مدظلہ، کی خدمت میں ارسال کیا تھا مگر اصحاب دعوت و عزیمت کا یہ نامور مؤرخ اور مجاہد کبیر سید احمد شہید کا سیرت نگار اپنے باکمال ہمشیرۂ نازش و افتخار بھتیجہ کی وفات کی اطلاع خود اپنے قلم سے کس طرح دیتا ہے۔ دل پر اس نے کتنا جبر کیا ہوگا، اس کوہ گراں کو کس طرح ہم خوردوں کی تسکین و تسلی کی خاطر برداشت کیا ہوگا اس کا تصور بھی مشکل ہے۔ اس نادر مکتوب سے وہ واقعہ یاد آجاتا ہے جو مولانا محمد میاں نے اپنے جد امجد حضرت سید شاہ علم اللہ کی سیرت میں لکھا ہے جب ان کے جواں و صالح صاحبزادہ سید محمد ابو حنیفہ کا انتقال ہوا تو کتنے اطمینان اور عزم و ہمت سے انہوں نے تجہیز و تکفین کی تھی۔

الشیئ من معدنہ لایستغرب

گرامی نامہ ملاحظہ کیجئے۔

برادران عزیزان مولوی عبد النور و نذر الحفیظ سلمہا اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

معلوم نہیں آپ لوگوں کو کسی ذریعہ سے ہمارے خاندان ہی نہیں عالم اسلام کے عظیم حادثہ کی خبر ملی یا نہیں؟ شاید یہ ناشاد چچا ہی کے لئے مقدر ہے کہ وہ اپنے قوت بازو، قرۃ عین، اور سرمایۂ نازش و افتخار، باکمال بھتیجے کی خبر وفات دے۔ بہر حال، خلاصہ یہ ہے کہ ۱۳ جون کو چند گھنٹوں کی علالت کے بعد محمد میاں ہم سب کو داغ مفارقت دے گئے، میں ان سے تقریباً ایک ہزار میل دور بمبئی میں تھا، ما اشبہ اللیلۃ بالبارحۃ۔ میں بھائی صاحب مرحوم کی طرح سارے مراحل طے ہو جانے کے بعد رائے بریلی پہونچا۔ بمبئی و دہلی ہر جگہ خبر تھی، لیکن مجھ سے چھپایا گیا۔ آپ دونوں کو خوب اندازہ ہے کہ یہ حادثہ کیسا تھا؟ ع

آنچہ من گم کردہ ام گر از سلیماں شدے؟

اب یہ خط اس تعلق خاص کی بنا پر میں خود لکھ رہا ہوں جو آپ دونوں کو ہم

دونوں سے ہے، اور اس درخواست کے ساتھ کہ دعائے مغفرت اور ایصال ثواب کے ساتھ ساتھ ان کی کتابوں کی طباعت واشاعت میں پورا پورا زور صرف کریں گے۔ الاسلام الممتحن کی توزیع اور اس کو مناسب جگہوں تک پہونچانے کی پوری پوری کوشش کریں گے کہ یہی ان کی سب سے بڑی یادگار ہے۔ مصر تنفس اور الاسلام بین لاونعم کی طباعت کی بھی کوشش کریں گے۔ اب زخم دل کے لئے یہی مرہم ہے۔

والسلام

دعاگو

ابوالحسن علی

۲۰ر جون ۷۹ء

ایمان اور دعوت

.... ایمان نہ بیچا جاسکتا ہے نہ خریدا جاسکتا ہے، نہ مول تول کیا جاسکتا ہے اور نہ تلوار اور پستول کے ذریعہ زیر کیا جاسکتا ہے نہ فلسفہ و سائنس کے ذریعہ اور نہ نام نہاد کلچر کے ذریعہ اور نہ اس کنگال، زوال پذیر تاریک تہذیب کے ذریعہ اور نہ خیر سے مفقود اور ایمانی نعمت سے محروم معلومات کے ذریعہ جو انسانیت کے لئے وبال بنی ہوئی ہے اور نہ علم وادب کے پروپیگنڈوں میں اور نہ ان انقلابوں و ترقیوں میں جس میں اپنا ضمیر اور اپنی جان فروخت کردی گئی اور اپنے قلم وزبان کو مادی چیزوں اور چند درہموں کے بدلہ میں فروخت کر دیا گیا اور خود بھی اس سے غیر راغب تھے۔

(مولانا سید محمد الحسنی ندوی مرحوم)

محمد الحسنی — چند یادیں، چند ملاقاتیں

۳۴۶۵
۵۴۰۴۱

پروفیسر سید احتشام احمد ندوی

شمالی ہند سے دور رہنے کے باعث اُدھر کی خبریں ادھر ذرا دیر سے پہونچتی ہیں چنانچہ مولانا محمد الحسنی کے انتقال کی خبر مجھے اخبار العالم الاسلامی مکہ سے ملی، دل دھک سے ہوگیا۔ ندوہ کی طالب علمی کے زمانہ میں ان سے میرے بڑے قریبی تعلقات تھے۔ چونکہ وہ شاہ علیم عطاؒ کے کلاس میں شرکت کے لئے روز آتے تھے لہذا روز ہی ملاقات ہوتی تھی۔ اس زمانہ میں خط وکتابت بھی رہی۔ چند خطوط ان کے میرے پاس محفوظ ہیں۔

میں ندوہ کے دور طالب علمی میں اکثر مولانا عبدالغفار ندوی کے پاس دفتر جماعت اسلامی بارود خانہ میں ٹھہر جاتا تھا، تعطیلات کا کچھ حصہ وہاں صرف کرتا تھا۔ گرمیوں کا زمانہ تھا میں وہیں ٹھہرا ہوا تھا، محمد الحسنی (جن کو ہم لوگ عرف عام میں محمد میاں کہتے تھے) سے ملاقات ہوئی گھنٹوں باتیں ہوئیں، پھر میں نے ان کو ناشتہ پر مدعو کیا۔ ویسے ان کی سوشل لائف زیادہ وسیع نہ تھی مگر از راہ کرم وخلوص انھوں نے میری دعوت قبول کی اور صبح کو دفتر جماعت تشریف لائے، ناشتہ ہوا، گفتگو ہوئی، چلتے وقت میں نے ان کو ایک اردو شاعری کا انتخاب پیش کیا جو مجھے بہت عزیز تھا اور میں نے ندوہ کے ایک ساتھی طفیل احمد صاحب پرتابگڈھی سے لیا تھا۔ اس کتاب میں پہلا شعر یہ تھا:

خدا جانے یہ دنیا جلوہ گاہ ناز ہے کس کی
ہزاروں اُٹھ گئے، رونق وہی باقی ہے محفل کی

اس کتاب پر چند سطریں محبت وخلوص کی لکھ کر میں نے ان کو ہدیہ کردی اور دور تک بھیجنے گیا۔ اس خوشگوار ملاقات کو تقریباً ۲۷ برس ہو گئے مگر اس کی یاد آج تک ذہن میں تازہ ہے۔

میں فضیلت ادب کا طالب علم تھا اور جماعت اسلامی سے متاثر تھا میں مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کا انداز جماعت اسلامی کے بارے میں پسند نہ کرتا تھا لہذا ان کو ۱۵۔۱۶ صفحات کا ایک طویل خط لکھا جس میں اور باتوں کے ساتھ یہ بھی لکھ دیا کہ آپ نے کسی عربی مدرسہ میں عربی نہیں پڑھی ہے اسی بناء پر آپ کے خیالات

میں کجی ہے مگر نام نہیں لکھا۔ مولانا محمد میاں نے ایک بار مجھ سے بتایا کہ مولانا ماجد صاحب نے حضرت مولانا علی میاں مدظلہ، سے فرمایا کہ اس طالب علم کا پتہ لگائیں۔ جس وقت محمد میاں نے مجھ سے یہ بات بتائی اس وقت میں جامعہ جا چکا تھا۔

لکھنؤ میں ایک بڑا مشاعرہ ہوا تھا میں بھی اس میں شریک ہوا۔ دوسرے روز محمد میاں سے ملاقات ہوئی تو ذکر مشاعرہ کا چھڑا۔ میں نے غلطی سے ایک بہت قدیم اور معروف شعر کو کسی جدید شاعر کی طرف منسوب کر کے ان کو سنایا جس پر انہوں نے فوراً ٹوک دیا اور بولے کہ یہ تو بڑا مشہور شعر ہے اس کو اس مشاعرہ میں سنانے کا کوئی سوال نہیں۔ شعر غالباً یہ تھا ؎

ذکر جب چھڑ گیا قیامت کا
بات پہونچی تری جوانی تک

محمد میاں طبعاً بہت خاموش تھے خود کبھی کوئی موضوع نہ چھیڑتے شاید یہ کم سخنی موروثی ہے کہ ڈاکٹر عبد العلیؒ بھی کم سخن لوگوں میں سے تھے۔

میں جس زمانہ میں ادارہ تعلیمات اسلام میں پڑھتا تھا اس وقت محمد میاں کی پہلی عربی کتاب "بین الصورة والحقيقة" شائع ہوئی تھی حالاں کہ ان کی عمر بہت کم تھی یہ مولانا علی میاں مدظلہ، کے ایک اردو مقالے کا ترجمہ تھا۔ پھر ان کی عربیت بڑھتی گئی۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ طبعی طور پر ادیب تھے اور ہندوستان کے عربی لکھنے والوں میں ان کے اسلوب کی فطری روانی، دل کشی، جملوں کی ساخت، الفاظ کا انتخاب اور دروبست، شعور کی پختگی اور زبان پر قدرت ان کے اسلوب کو افتخار و امتیاز عطا کرتی ہے۔ اگرچہ انہوں نے ۲۳ برس تک "البعث الاسلامی" نکالا مگر عربی زبان کے بجائے انہوں نے اردو میں زیادہ لکھا۔ برسہا برس وہ "تعمیر حیات" کے بھی ایڈیٹر رہے۔

اکتوبر ۱۹۷۶ء میں ۲۰۔۲۵ برس بعد مولانا محمد میاں سے ملاقات ہوئی اور خوب کھل کر ملے۔ شام کو ندوہ کے کتب خانہ میں عصرانہ تھا دونوں آدمی ساتھ ہی بیٹھے۔ اس مجلس میں انہوں نے مجھ سے شکایت کی کہ آپ نے ادب کے میدان کا انتخاب صحیح نہیں کیا آپ کو اسلامیات پر اور خاص طور سے کسی ایسے مسئلہ پر اختصاص نظر پیدا کرنی چاہیئے جس سے خدمت اور شہرت دونوں حاصل ہو سکے۔ میں نے

کہا کہ واقعی یہ بات صحیح ہے کہ ادب کا موضوع اتنا وسیع اور اسلامی ذوق کو تسکین دینے والا نہیں جتنا کہ اسلامیات کا میدان ہے، اگر کوئی شخص فطری ادیب ہے تو جس موضوع کو چھوئے گا وہ ادب بن جائے گا۔ چلتے وقت کہنے لگے کہ میرے اس مشورہ کا خیال رکھئے گا۔ میں نے کہا کہ اتفاق دیکھئے کہ میں نے اس بار حدیث پر اسلامک اسٹڈیز میں مقالہ پڑھا ہے۔ اب یہ رجحان انشاء اللہ باقی رہے گا۔ بولے کوئی عصری تقاضوں سے متعلق موضوع اختیار کیجئے۔

یہ آخری ملاقات تھی جو محمد الحسنی سے ہوئی۔ اسی دن میں رات میں مہمان خانہ گیا مجھ کو دیکھتے ہی بولے ٹھہرئے۔ میں دوسرے ساتھیوں کے ساتھ گفتگو کرتا رہا وہ اندر کمرہ میں گئے اور وہاں سے ایک دلکش کتاب لا کر دی اور بولے کہ یہ ہدیہ ہے مگر میں نے کہا کہ کتاب کا نام تو البعث سے مجھے معلوم ہو چکا تھا۔ اس کتاب پر انہوں نے یہ سطریں بطور خلوص و تعلق کے لکھیں:

"هدية الى الأخ الكريم الدكتور احتشام احمد الندوى اعزه الله مع أزكى التحيات و الاشواق۔

محمد الحسنی

۲ ذی قعدہ ۱۳۹۸ھ

ندوہ کی طالب علمی سے اب تک گوئن روڈ پر جس گھر میں ڈاکٹر عبد العلیؒ رہتے تھے اور حضرت مولانا علی میاں مدظلہ، کی لکھنؤ میں قیام گاہ بھی وہی ہے مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ ندوہ کی عمارت کا ایک ٹکڑا ہے اس کو دیکھ کر پورا ندوہ مولانا عبد الحیؒ سے مولانا محمد الحسنی تک سامنے آجاتا ہے۔

جس زمانہ میں انہوں نے "البعث الاسلامی" نکالا تو اس سلسلہ میں دلّی وغیرہ کا سفر بھی کیا میں جامعہ میں طالب علم تھا۔ ایک دن مولانا سعید الرحمٰن صاحب ندوی اور مولانا محمد الحسنی صاحب دونوں جامعہ تشریف لائے۔ بڑا لطف آیا میں بھی اس نئے رسالہ کا خریدار بن گیا۔ ہم لوگ جمنا کے خوبصورت پل کو دیکھنے بھی گئے۔

مولانا محمد میاں نے مولانا محمد علی مونگیری کی ایک نہایت عمدہ سوانح عمری لکھی جسے قبول عام حاصل ہوا۔ اگرچہ مولانا شبلی کے بارے میں ان کی تمام آراء سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا مگر جس محنت، خلوص اور

وسعت نظر سے انہوں نے یہ کام کیا ہے وہ اردو کے سوانح نگاروں میں ان کو ایک مقام عطا کرتا ہے۔ میں ایک بار مولانا علی میاں سے ملنے رائے بریلی تکیہ حاضر ہوا تو معلوم ہوا کہ شام کو سیرت مولانا محمد علی مونگیری سنائی جائے گی، سن کر خوشی ہوئی اور خیال ہوا کہ وہ دراصل حضرت مولانا کی جانشینی کے لئے تیار ہو رہے ہیں خود ان کی عربیت کا یہ بھی تقاضہ تھا مگر قدرت کو یہ منظور نہ ہوا۔ اور وہ عین جوانی میں ہم سے اچانک ہمیشہ کے لئے جُدا ہو گئے۔

بلاشبہ ہندوستان کی عربی صحافت نگاری میں ان کا نام سنہرے حرفوں سے لکھا جائے گا۔ خود اردو میں اسلامی صحافت میں ان کا حصہ ہے جس پر تعمیر حیات کے صفحات شاہد ہیں۔

سچ پوچھئے تو مرحوم کے مرنے کا وقت نہ تھا مگر موت کا کوئی وقت نہیں۔ ۱۹۷۸ء کی ملاقات کے موقع پر میں نے کہا، محمد میاں! ہم لوگوں کے بچے جوان ہو گئے کتنا زمانہ گذر گیا ہم لوگوں کی طالب علمی کو۔ اس پر وہ بولے کہ خود میرا ایک لڑکا بیس برس کا ہے اور ندوہ میں مدرس ہے۔

ایک عرب شاعر نے کہا ہے کہ موتیں اندھی ہوتی ہیں جس کو پا جاتی ہیں دبوچ لیتی ہیں اور جس کو چھوڑ دیتی ہیں اس کو بوڑھا کھوسٹ بنا دیتی ہیں۔

مگر ایک دوسرے شاعر نے بڑی عمدہ تاویل کی ہے اگرچہ دل کا داغ کسی تاویل سے جاتا نہیں۔

(موت کے میدان میں صبر کے سوا چارہ نہیں اس لئے کہ ابدی زندگی کسی کے اختیار میں نہیں)۔

آدمی بُلبلا ہے پانی کا　　کیا بھروسہ ہے زندگانی کا

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم　　تو نے وہ گنجہائے گراں مایہ کیا کیے

عزیز گرامی مولوی محمد میاں

مولانا محمد عبد السمیع ندوی، معاون ناظر تعمیر و ترقی ندوۃ العلماء

مولانا الحاج ڈاکٹر سید عبد العلیؒ (سابق ناظم ندوۃ العلماء) کے صاحبزادے استاذ محترم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ناظم ندوۃ العلماء کے بھتیجے تھے۔ ۱۳، ۱۴ جون کی درمیانی شب میں مختصر سی علالت کے بعد اللہ کو پیارے ہوئے، راقم سطور سے عمر میں چھوٹے تھے، بچپن بھی دیکھا، جوانی بھی دیکھی۔ سن ۴۳ اور ۴۴ کے درمیان ہی رہا ہوگا، جب کبھی کوئی تحریر ان کے نام لکھنے کی نوبت آئی تو "عزیزی مولوی محمد میاں سلمہٗ" ہی لکھا۔

دینی تعلیم اپنے والد گرامی سے حاصل کی عربی ادب میں امتیاز پیدا کیا، دعوتی فکر و مزاج بھی اپنے والد گرامی ہی سے وراثت میں پایا تھا۔ متانت و رزانت، ذہانت و فطانت، سکون و وقار کے ساتھ ساتھ اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ بہی خواہی و سربلندی کی جو فکری آگ ڈاکٹر صاحب علیہ الرحمہ کے سینہ میں بھڑک رہی تھی وہ انھوں نے محمد میاں کے سینہ میں منتقل کر دی۔ استاد گرامی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے ان کو مطالعہ، فکر، سوز و ساز اور آفاقیت و گیرائی بخشی، محمد میاں نے اپنی دینی دعوتی زندگی کا آغاز ایک عربی ماہنامہ "البعث الاسلامی" کے اجراء سے کیا۔ جس کو اندرون ملک اہل علم طبقہ میں جو مقبولیت حاصل ہوئی اس سے کہیں زیادہ عرب دنیا ان کی تحریروں سے متاثر ہوئی، ان کے مضامین مختلف عربی جرائد میں اہتمام کے ساتھ شائع ہوتے تھے، وہ عالم اسلامی کے دینی، تہذیبی، فکری، اجتماعی کمزوریوں سے واقف تھے، ان کو مشرق وسطیٰ کی سیاست، بے تدبیری بے لگامی، انتشار و افتراق کی تازہ ترین اطلاعات ملتی رہتی تھیں۔ البعث الاسلامی کے ذریعہ وہ ان امراض اور خوفناک صورت حال کی نشاندہی کرتے تھے ان کا اشہب قلم جب رواں ہوتا تھا تو عرب ممالک کے دردمندوں کی آنکھوں سے سیل اشک جاری ہو جاتا تھا، مسلمانوں کے دینی تہذیبی تضاد کی بڑی خوبی سے نشاندہی کرتے تھے مختلف دینی اجتماعات کو بروقت اور مناسب اشارے دیتے تھے ان کے مخاطب عوام ہی نہیں یکساں طور پر وہ امراء و شیوخ، وزراء، زعماء، علماء کو بھی مخاطب کرتے تھے۔

"البعث الاسلامی" کے سرورق کی امتیازی تحریر "شعارنا الوحید الی الاسلام من جدید" ہمیشہ انکی

شخصیت کا اجمالی تعارف کراتی رہی اور اب ان کی یاد دلاتی رہے گی، خندہ رو، کشادہ جبیں، مرنجامرنج، "صلاحیت وصالحیت" کا بھرپور نمونہ تھے۔

دین پسند نوجوانوں کی ایک علمی ادبی سوسائٹی بھی قائم کی تھی جس کے ذریعہ نوجوانوں کی علمی دینی تربیت پیش نظر تھی، اس کی کئی نشستیں ہوئیں، لیکن حالات کی نامساعدت نے اس سوسائٹی کو پنپنے نہ دیا، قریب کے لوگوں کے ذہنوں میں اس سوسائٹی کی یاد ہو تو ہو بیشتر لوگ تو فراموش ہی کر چکے، جوں جوں دن گزرتے گئے محمد میاں کے مشاغل بڑھتے ہی گئے، تعمیر حیات کے اجرار کا منصوبہ بنا تو ادارت کے لیے انہی کا انتخاب ہوا، عربی تحریروں کی طرح اردو تحریر بھی بے حد شگفتہ اور مؤثر ہوتی تھی۔ "تعمیر حیات" کی وجہ سے تعلق میں اضافہ ہوا۔ کو دارالعلوم کا کالم راقم سطور کے سپرد ہوا، کتابت وطباعت کی مشکلات و پریشانی کی وجہ سے "تعمیر حیات" کے لیے علیحدہ پریس قائم کرنے کی تجویز سامنے آئی، مرحوم اس پر تیار ہو گئے کہ اپنی زمین فروخت کر کے پریس قائم کریں مشین، جگہ اور آدمی کی تلاش شروع ہوئی خاصی بھاگ دوڑ رہی، لیکن کوئی آدمی ایسا تجربہ کار میسر نہ آسکا جو اس پریس کی پوری پوری ذمہ داری لیتا۔ یوں یہ منصوبہ ناکام ہو گیا۔

استاد گرامی حضرت مولانا زید مجدہ کی کتاب سوانح حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی زیور طبع سے آراستہ ہو کر پہلے ہی آچکی تھی۔ اب حضرت مولانا زید مجدہ کو "مولانا محمد علی مونگیری" کے حالات پر کتاب کی تیاری کا خیال پیدا ہوا، یہ کام عزیزی مولوی محمد میاں کے سپرد ہوا، جس کو انھوں نے بڑی دیدہ ریزی اور خوش اسلوبی سے انجام دیا، اس کتاب کے معاً بعد ہی "تذکرہ حضرت شاہ علم اللہ" نظر نواز ہوئی۔

ندوۃ العلماء کا پچاسی سالہ اجلاس جب طے پایا تو اس کی تیاریوں کے سلسلہ میں خاصی ہما ہمی رہی "ندوۃ العلماء کی اجمالی تاریخ اس کی تحریک وافادیت پر تبصرہ" اس کے کاموں کا جائزہ انہی کے سپرد ہوا، جس کو انھوں نے "روداد چمن" کے عنوان سے پیش کیا بحمداللہ کہ اس کو بھی قبول عام حاصل ہوا۔

عربی سے اردو اور اردو سے عربی ترجمہ پر بھی خاصہ عبور حاصل تھا، حضرت مولانا کی شہرۂ آفاق کتاب "الارکان الاربعہ" کا انتہائی شگفتہ اور سہل الفہم اردو میں "ارکان اربعہ" کے عنوان سے ترجمہ کیا جس کو خاصی مقبولیت حاصل ہوئی، حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب مدظلہ کی عام اور متداول کتاب "فضائل نماز" کا عربی میں "مکانۃ الصلوٰۃ فی الاسلام" کے عنوان سے ترجمہ کیا جو شائع اور مقبول ہوا، سال دو سال کا عرصہ ہوا، حضرت مولانا زید مجدہ کی ایک کتاب "السیرۃ النبویۃ" کے نام سے عربی میں دارالشروق جدہ

سے طبع ہو کر آئی جو "قریبی مطالعہ اور جدید ترین معلومات" کے لحاظ سے اس فن میں منفرد ہے، اس کا بھی ترجمہ محمد میاں ہی نے کیا۔ چھوٹے موٹے رسائل اور کتابچے اس کے سوا ہیں، جن کا یہاں کوئی ذکر نہیں کیا گیا۔

"الاسلام المستحسن" کے عنوان سے مرحوم کے بعض مقالات کا مجموعہ حال ہی میں شائع ہوا جس کو عرب ممالک میں بہت پسند کیا گیا۔ اور اس کے کئی ایڈیشن اب تک چھپ چکے ہیں، اور اب حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمہ اللہ کی سوانح کی ترتیب میں مشغول تھے۔

یادوں کے قافلے پے باندھے کھڑے ہیں کیا لکھا جائے کیا نہ لکھا جائے فیصلہ دشوار۔ مرحوم خلوص و یگانگت کا پیکر تھے ڈاکٹر صاحب علیہ الرحمہ کے انتقال کے عرصہ کے بعد میری طرف سے آمد و رفت میں کوتاہی محسوس کی تو مجھ سے خوردانہ و مخلصانہ شکوہ کیا اور مجھے اپنے مخلص عزیز کے سامنے حیلہ حوالوں کے باوجود سپر انداز ہونا پڑا اور پھر ملاقاتوں اور نشستوں کا اوسط کچھ بڑھ ہی گیا۔

بڑوں کا اکرام و احترام ان کی شرافت و سعادت کی ایک علامت تھا جس کو انھوں نے کبھی ہاتھ سے جانے نہ دیا۔

اعتماد کی بھی یہ کیفیت تھی کہ "تعمیر حیات" کے لیے کوئی مقالہ یا اداریہ لکھتے تھے تو اکثر و بیشتر مجھ سے کہہ دیتے تھے کہ "آپ بھی دیکھ لیجئے گا، حذف و اضافہ کرنا ہو تو کر دیجئے گا" خوردی و بزرگی سے قطع نظر اپنی تحریروں کے سلسلہ میں میرا خود بھی ان سے یہی معاملہ تھا۔ دس پندرہ یوم پہلے کی بات ہے باہر سے آئی ہوئی ایک تحریر میں نے ان کے حوالے کی، تحریر تو رکھ لی لیکن بعد میں پھر مجھے یہ کہہ کر واپس کر دی کہ آپ ہی دیکھ لیں مجھے موقعہ نہیں مل سکا۔

اجتماعی معاشرہ میں کبھی کبھار کچھ غلط فہمیاں بھی پیدا ہو جاتی ہیں جن کو اگر سمجھ داری سے حل نہ کیا جائے تو بُرے اور سنگین نتائج پیدا کرتی ہیں۔ مرحوم نے ہمیشہ حقیقت حال دریافت کرنے میں سبقت کی مجھے ان کی یہ ادا بہت بھاتی تھی کہ حقیقت معلوم ہو جانے کے بعد وہ ایک طویل "اچھا" کے ساتھ "تو یہ بات تھی" کہہ کر مسکرا دیتے تھے۔

ایسے ہی ایک موقعہ پر جب کہ واقعہ پیش آئے چند یوم گزر چکے تھے اور وہ میرے ذہن میں محفوظ بھی نہیں رہا تھا، میرا گوئن روڈ جانا ہوا تو اس طرح انھوں نے میرا خیر مقدم کیا کہ جیسے کئی مہینوں کے بچھڑے مل رہے ہوں اور پھر ایک علحدہ کمرے میں لے گئے، اظہار مسرت کرتے ہوئے مجھ سے فرمایا کہ "آپ کی فوری تدبیر نے

ایک بڑے فتنہ کو دفن کر دیا" میں سمجھا نہیں، تو انھوں نے مجھے اشارہ دیا اور ساتھ ہی اس کی متوقع سنگینی سے بھی باخبر کیا، چند منٹ تک اس موضوع پر بات ہوتی رہی اس کے بعد "المجالس بالامانۃ" کہہ کر ہم ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔

جمعیۃ مرکزیہ تبلیغ الاسلام کانپور نے ایک ماہنامہ کے اجراء کا فیصلہ کیا تو اس کی ادارت کے لیے نظر مولوی محمد میاں ہی پر گئی، لیکن وہ اپنی مشغولیت کی وجہ سے اس کو قبول نہ کر سکے، حال ہی میں ان کا ایک مضمون "دین فطرت" کے عنوان سے ماہنامہ "محکمات" میں شائع ہوا تھا، اس کے لیے یہ پروگرام طے پایا کہ اس میں اضافہ کیا جائے اور پھر اردو، ہندی، انگریزی میں علٰحدہ علٰحدہ اس کی اشاعت ہو لیکن افسوس کہ یہ منصوبہ ایک حسرت بن کر رہ گیا۔

شرافت و سعادت، ذوق و طلب، تلاش و جستجو، دین اور اس کی دعوت، دین کی خاطر محنت مشقت، فکر و تردد، دلسوزی و اخلاص، وہ کون سا وصف ہے جو "عزیزی محمد میاں" میں نہ تھا، ان کے دوسرے اوصاف و خصوصیات بھی جن تک میری رسائی نہ ہو سکی، لکھنے والے لکھیں گے، بتانے والے بتائیں گے، ان کے چھوٹے اور بڑے ان کے رفقاء کار کو ان کی یاد عرصہ تک رلائے گی۔ رب بے نیاز سے دعا ہے کہ اپنے اس نیاز مند بندہ کی نیاز مندیوں کو قبول فرما کر اپنی رضا و رحمت کے ان پر ڈونگرے برسائے۔ ہمارے ساتھ آپ بھی دعا میں شامل ہوں۔ اللھم اغفرلہ وانزل علیہ شآبیب رحمتک ورضوانک

؎ آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

محمد میاںؒ

شمس الحق ندوی

محمد میاںؒ:- یہ نام جب بھی خیال و تصور میں آتا ہے ایک بھولی بھالی اور معصوم سی صورت نگاہوں میں پھرنے لگتی ہے اور دل کو بے چین و بے قرار کرنے لگتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہاتھ میں بیگ لیے ہوئے جس میں مضامین کے مسودات و ڈاک بھری ہوئی ہے، اپنی معصوم اداؤں کے ساتھ چلے آرہے ہیں، قریب آجاتے ہیں مسکرا کر سلام کرتے ہیں یا اگر سامنے والے نے سلام میں سبقت کر دی تو ہنس کر جواب دیتے ہیں اور بڑے ہی کریمانہ انداز میں پوچھتے ہیں۔

کہیے خیریت ہے؟ پھر کسی دینی و علمی یا دعوتی موضوع پر بات شروع کر دیتے ہیں اور کچھ نہ کچھ لکھنے کا مشورہ دیتے ہیں۔

"محمد میاں" یہ لفظ زمانۂ طالب علمی ہی میں جبکہ ندوۃ العلماء میں پہلے یا دوسرے درجہ کا طالب علم تھا سنا تھا، اس وقت ملنے جلنے اور بات کرنے کی تو کیا جرأت ہوتی اور اس گوہر آبدار کی قدر و قیمت کو تو کیا سمجھتا مگر اتنا ضرور یاد ہے کہ جب یہ لفظ کانوں میں پڑا ہے اپنے اندر بڑی محبوبیت و پیار لیے ہوئے دل میں سما گیا ہے۔ یہ نام جب بھی میرے سامنے لیا جاتا، ایک ننھے منے معصوم اور پیارے سے بچے کی تصویر نگاہوں میں پھر جاتی جو سب کو پیارا اور سب کو عزیز ہو۔

۱۹۵۵ء میں جب میں دوسرے درجہ میں تھا انھیں کی ادارت میں عربی ماہنامہ "البعث الاسلامی" کا اجرا ہوا اس وقت البعث الاسلامی کے مضامین سمجھنے کی صلاحیت تو تھی نہیں مگر الٹ پلٹ کر دیکھ لیا کرتا اور خوش ہوتا کہ ہمارے اساتذہ و بزرگوں کی زیر سرپرستی اس عجمی ملک میں یہ عربی رسالہ نکل رہا ہے وقت کچھ اور گزرا تو ان کے اداریوں کی تعریف سننے لگا تعریف سنتا اور پوچھتا کہ کون صاحب ہیں۔ اتنا تو معلوم تھا کہ ناظم صاحبؒ ندوۃ العلماء کے صاحبزادے اور معتمد تعلیمات دار العلوم ندوۃ العلماء کے بھتیجے ہیں مگر صورت آشنا نہ تھا اس وقت تک دار العلوم میں ان کی آمد بھی بہت کم ہوتی تھی۔ جب میں اپنی رسمی تعلیم کے آخری سال یعنی فضیلت دوم میں پہنچا تو مرحوم کی قائم کی ہوئی انجمن "رابطہ عالم اسلامی" کا کچھ کام میرے اور میرے ایک رفیق درس مولوی رئیس صاحب کے سپرد ہوا۔ اس وقت سے اُن کے ساتھ بیٹھنے، ملنے جلنے اور قریب سے دیکھنے کا کچھ موقع ملا۔ اب میں ان کے اداریوں کو بھی سمجھنے لگا تھا لہٰذا وہ محبت و عقیدت، جو

ؒ ڈاکٹر سید عبد العلی صاحبؒ ؒ حضرت مولانا علی میاں صاحب مدظلہ

بے دیکھے دبے سمجھے دل میں سمائی ہوئی تھی اور بڑھی اور بڑھتی ہی گئی۔ دارالعلوم سے فراغت کے بعد کوئی ڈیڑھ دو سال تک میں نے دارالعلوم کے مکتبہ کو منظم کرنے اور اس کی دیکھ بھال کا کام کیا۔ اسی دوران مولانا مرحوم کی پہلی کتاب "سیرت مولانا محمد علی مونگیری" بانی ندوۃ العلماء مکتبہ سے شائع ہوئی اور پروف ریڈنگ کا کام میں نے کیا۔ کتاب کی طباعت کے دوران بار بار ملنا ہوتا۔ پروف پڑھنے میں بھی بعض بعض مقامات پر بڑا لطف آتا اور اس کا ان سے ذکر بھی کر دیتا۔ جیوں جیوں قرب بڑھتا گیا ان کی خوش خلقی محبت و شفقت دین کی فکر اور اس کی دعوت کی لگن دل میں گھر کرتی چلی گئی۔ زیادہ قریب ہوا تو کچھ لکھنے کی تلقین کرنے لگے۔ جب کچھ لکھ کر دکھایا تو ایسی ہمت افزائی فرمائی جیسے اپنے بچے یا عزیز خاص کی ہمت افزائی کی جاتی ہے۔ یہ ان کے اخلاص وللہیت کی دلیل تھی۔ انھیں کی ہمت افزائی سے دل بڑھا اور میں نے ان کے عم معظم حضرت مولانا علی میاں (جن کو وہ بڑی محبت سے چچا میاں کہتے تھے) کی دلچسپ و فکر انگیز و پر از معلومات کتاب "مذکرات سائح فی الشرق الاوسط" کا ترجمہ کر ڈالا اور شرق اوسط کی ڈائری کے نام سے تقریباً سوا چار سو صفحات کی کتاب شائع ہو گئی۔ انھیں کی ہمت افزائی سے حضرت مولانا کی اردو کتاب "مذہب و تمدن" کا عربی ترجمہ بھی کرنے کی سعادت نصیب ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے ان کی زندگی ہی میں دونوں کتابیں شائع کرا دیں۔ جو کچھ بھی لکھتا ان کو ضرور دکھا لیتا پھر شائع کرنے کے لیے دیتا۔ وہ ایک خاموش استاد و مربی تھے شہرت و ناموری کے جذبات سے دور اپنے رب کی رضا و خوشنودی کے جذبات سے مسحور و مخمور جب حضرت مولانا ظلہ کی کسی چیز کا ترجمہ کرتا اور کہتا کہ مولانا آپ تو بہت ہی مشغول ہیں، اس پر ایک نظر ڈال لیں تو میری گزارش پر فرماتے کہ ہزار مشغول رہوں لیکن چچا میاں کی کوئی چیز ہو تو بے تکلف دیکھوں گا۔ آپ کبھی اس میں تکلف نہ کریں حضرت مولانا کی تقریباً تمام عربی کتابوں کا ترجمہ انھیں کے قلم سے بالکل حضرت مولانا ہی کے اسلوب میں ہوا ہے۔ وہ میرے استاذ و مربی تھے مگر معاملہ دوستوں کا سا کرتے تھے۔ جب بھی گوئن روڈ جانا ہوتا اور کوئی بھیڑ بھاڑ کی مجلس نہ ہوتی تو ہوٹل ضرور لے جاتے اور پر تکلف ناشتہ کراتے۔

اور جب بھی کسی اور کی ضیافت میں چائے یا ناشتہ ہوتا تو چاہے وہ ذوق کے مطابق نہ ہو مگر اس کا ذرا بھی احساس نہ ہونے دیتے، بلکہ خوب خوب تعریف کرتے۔ کبھی کبھی تو کئی کئی دن گزر جانے کے بعد بھی اس کا ذکر چھیڑتے اور تعریف کرتے۔ لکھنے والے ان پر مضامین لکھیں گے اور ان کے جاندار مضامین کی خوب داد دیں گے اور انھیں داد دینا بھی چاہیے۔ وہ لکھتے ہی ایسا تھے جو دل کے پار ہو اور آنکھوں کو اشکبار کر دے۔

مگر اس کے باوجود کانوں نے کبھی یہ نہ سنا کہ وہ خود اپنے مضمون کی تعریف کر رہے ہوں، ایسی تعریف جس میں

خود نمائی کا جذبہ کام کر رہا ہو۔ بعض وقت بے تکلف مجلس ہوتی باتیں ادھر ادھر کی چل نکلتیں جن میں اکثر بے احتیاطی ہو جاتی ہے اور لوگ غیبت میں مبتلا ہو جاتے ہیں مگر مجھے یاد نہیں کہ انھوں نے کبھی کسی کی غیبت کی ہو حتیٰ کہ جب کبھی کسی کے خلاف مضمون لکھتے اور تنقید کرتے تو تحقیر و تذلیل کا اسلوب اپنانے سے دور بہت دور رہتے۔

لکھنے میں خواہ عربی ہو یا اردو (اپنے چچا میاں کو چھوڑ کر) وہ اپنی مثال آپ تھے۔ اس کے برعکس خطابت و تقریر سے مناسبت نہ تھی حتیٰ کہ طلبہ کے بھی کسی جلسہ کی صدارت کرنی ہو تو اس کو بھی نہیں قبول فرماتے تھے باہر سے دعوت نامے آتے مگر اکثر اُن سے بھی کترا جاتے۔ اکثر کیا بلکہ صرف ایک "ندوۃ الشباب العالمی الاسلامی" کے جلسۂ ریاض میں شریک ہوئے، باقی اور کسی کانفرنس میں نہیں شریک ہوئے۔ خود کو تقریر سے مناسبت نہ تھی مگر یہ آرزو و تمنا رکھتے تھے کہ ان کے بڑے صاحبزادے عبداللہ سلمہٗ تقریر و خطابت کی مشق کریں۔ کئی بار فرمایا تم ان کی ہمت افزائی کرو اور کہو کہ تقریر کی مشق کریں۔ عبداللہ سلمہٗ ماشاء اللہ دو سال قبل ندوۃ العلماء سے فارغ ہوئے۔ اب تک تکمیل کے طالب علم تھے۔ اس عرصہ میں عربی لکھنے اور بولنے اور تقریر کی بھی مشق کر لی ہے۔ اس کسنی میں ماشاء اللہ ایک عربی کتاب کے مصنف بھی ہو چکے ہیں، امید ہے کہ باپ دادا کے صحیح جانشین ثابت ہوں گے۔

عم ۴۴ سال تھی چار بچوں کے باپ ہونے کے باوجود[1] سب کو اتنے پیارے تھے کہ اب بھی جب محمد میاں یہ آواز کانوں میں پڑتی تو ننھے منے معصوم سے بچے کا تصور ہوتا جس کے مہرنے اور اداؤں سے بھی معصومیت ٹپکتی تھی۔

یہ شعر کئی بار پڑھا تھا اور غالباً حضرت مولانا علی میاں صاحب ظلہٗ نے کسی ایسے ہی موقع پر لکھا ہے مگر اس کی حقیقت کا اندازہ اب جا کے ہوا۔ جب خیال آتا ہے دل دھڑک اٹھتا ہے، ہوش گم سم سا ہو جاتا ہے اور بے اختیار زبان پر یہ شعر آجاتا ہے۔

جب نام تیرا لیجیے تب چشم بھر آئے — اس طرح سے جینے کو کہاں سے جگر آئے

کسے خبر تھی کہ گلدستہ کا سب سے حسین پھول عین اپنی رونق و جمال کے وقت توڑ لیا جائے گا۔ جذبات محبت کو یقین اب بھی نہیں آتا اور رہ رہ کر خیال آتا ہے کہ کہیں تنہائی میں بیٹھے کچھ لکھ رہے ہیں یا ہنستے مسکراتے چلے آرہے ہیں مگر عقل سمجھاتی ہے کہ نہیں اب وہ ہم سے جدا ہو چکے ہیں۔

---

[1] تین صاحب زادے باحیات ہیں۔ ایک بچی کا بچپن ہی میں انتقال ہو گیا۔

ان کے کن کن حالات و کن کن خوبیوں کو بیان کیا جائے وہ علمی دنیا کے ایک مردِ مجاہد تھے "البعث الاسلامی" کے اداریے عرب دنیا میں بڑے ذوق و شوق سے پڑھے جاتے اور نوجوانوں کے ذہن و فکر پر بڑے اثر انداز ہوتے ابھی ڈیڑھ سال قبل آپ کی عربی کتاب "الاسلام الممتحن" مصر سے شائع ہوئی ہے، کتاب ہاتھوں ہاتھ لی گئی اور چند مہینوں میں اس کا پہلا ایڈیشن ختم ہو گیا۔ لکھنے کا اسلوب و انداز ایسا ہوتا کہ سخت سے سخت بات بھی بغیر کسی آزاری کے نہایت لطیف انداز میں لکھ جاتے۔

کتنی شیرینی تھی اسلوب تحریر میں دل کتنا کھینچتے تھے اور لپکتے تھے ان تحریروں کو پڑھنے کے لیے ڈر تھا کہ

ع نظر لگے نہ کہیں ترے دست و بازو کو

یہ ڈر و اندیشہ اب حقیقت سا بن گیا۔ حکم خداوندی تو اپنے وقت ہی پر نافذ ہوتا ہے، مگر ضعیف البیان انسان کے دل میں خیال و گمان کا آنا جانا تو اس کی فطرت ہے اسے کیسے بدلا جا سکتا ہے۔ البعث کے اداریوں کو پڑھ کر کتنے عربوں نے اپنے دامن تر کر لیے کتنے نوجوانوں کے دل کی دنیا بدل گئی۔

زمانہ بڑے غور سے سن رہا تھا تمھیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

دل میں عالم اسلام کا کتنا درد تھا اس کی اصلاح کے لیے انھوں نے کیسے کیسے مضامین لکھے اس کا اندازہ ان کے مضامین کے مطالعہ ہی سے کیا جا سکتا ہے۔

ان کے دل میں اسلام و مسلمانوں کا درد و سوز تھا۔ ہر وقت اسی موضوع پر سوچتے رہتے اکثر باتیں کرتے کہ دار العلوم کے طلبہ میں دینی علمی ذوق کیسے پیدا کیا جائے، ان کے اندر خود اعتمادی و خودداری پیدا کرنے کے کیا کیا طریقے اپنائے جائیں۔ ظاہری و رسمی طور پر طلبہ سے ان کا تعلق نہ تھا۔ مگر اس موضوع پر اکثر باتیں کرتے اور قیمتی مشورے دیتے اور ایسا کیوں نہ ہوتا، جس خانوادہ کے وہ چشم و چراغ تھے۔ جس ماحول میں انھوں نے آنکھیں کھولی تھیں وہاں دن رات اسی کے چرچے تھے۔ انھوں نے اس کو اخذ کیا بلکہ جذب کر لیا اور یہی سوغات دوسروں میں تقسیم کرنے لگے۔ ان کے اوصاف و کمالات کا نقشہ کھینچنا چاہوں اور ناز و انداز کی تصویر کشی کرنا چاہوں تو اس کا حق ادا نہ ہو سکے گا۔ اس موقعہ پر انھیں کے لکھے ہوئے ایک شعر کا سہارا لیتا ہوں جو انھوں نے اپنے جد امجد حضرت شاہ علم اللہ صاحب کے حالات میں لکھے تھے۔

گر مصور صورت آں دلستاں خواہد کشید
حیرتے دارم کہ نازش را چساں خواہد کشید

آہ جس وقت میں نے تذکرۂ شاہ علم اللہ پڑھا تھا، اس تصنیف اور خاص کر اس شعر پر مرحوم (مرحوم لکھتے ہوئے دل تڑپ اٹھتا ہے اور قلم رک جاتا ہے) کو بڑی داد دی تھی کیا خبر تھی کہ یہی شعر میں ان کے لیے لکھوں گا۔

محمد میاں قریب صبح نمودار ہونے والے ستارہ کی مانند تھے جو ہوتا تو ہے بڑا روشن مگر عمر بہت تھوڑی پاتا ہے۔ محمد میاں خاموش طبیعت تھے خاموشی ہی کے ساتھ بے سان و گمان سب کو حیران و ملول خاطر چھوڑ کر چلے بھی گئے، گو وہ کم سخن تھے لیکن ان کی ذات سے چمن ندوہ کی کتنی انجمنیں زندہ تھیں۔

محمد میاں اپنے سارے کمالات و خداداد صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ زندہ دل و ظریف بھی تھے۔ دوستوں و بے تکلف احباب کی مجلس ہوتی تو بڑا ظریفانہ مگر شریفانہ مذاق کرتے اور کبھی کبھی مذاق و مزاح ہی کے انداز میں دعوت فکر و عمل دیتے۔ محمد میاں اب ہم میں نہیں رہے مگر یادوں کی ایک سنہری داستان چھوڑ گئے

مرنے والے مرتے ہیں لیکن فنا ہوتے نہیں
وہ حقیقت میں کبھی ہم سے جدا ہوتے نہیں

محمد میاںؒ نے جو نقوش چھوڑے ہیں وہ زندہ ہیں زندہ رہیں گے وہ نقوش یادوں کے پردے پر اس طرح دبتے ابھرتے رہتے ہیں جس طرح آسمان پر ستاروں کی تنک تابی مگر اس انسانی فطرت و شعور کو کیا کیجئے کہ محمد میاںؒ نہیں ہیں تو ہر مجلس سونی سونی معلوم ہوتی ہے اور ان کی بڑی کمی محسوس ہوتی ہے۔

محمد میاںؒ ہم سے دور ہو گئے مگر اب بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمیں میں ہیں اور کہیں سے چلے آ رہے ہیں

یہ چل رہے ہیں وہ پھر رہے ہیں
یہ آ رہے ہیں وہ جا رہے ہیں

محمد الحسنی اور عربی صحافت

(محمود الازہار ندوی)

ندوۃ العلماء کے بانیوں نے عربی زبان کی اہمیت کو محسوس کیا اور یہ یقین کہ قرآن وحدیث کی زبان اور اس کی اصل روح سے واقفیت اسی وقت ممکن ہے جب زبان کے اصل ماخذ تک رسائی ہو، اس کے لئے ایسا نصاب تعلیم مرتب کیا جو ہندوستان کے ماحول اور طرز تعلیم کے مطابق ہو اور ایسی کتابیں مرتب کروائیں جن کے ذریعہ طلبہ میں صحیح علمی وتحقیقی ذوق کے ساتھ عربی میں تحریر وتقریر دونوں پر قدرت ہو اور وہ اپنے مافی الضمیر کو بغیر کسی تردد کے ادا کر سکیں۔

مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنے دور معتمدی میں طلبہ میں صحیح علمی وتحقیقی ذوق پیدا کرنے اور ندوہ کی خصوصیات کو زندہ کرنے کی جو سرگرم کوششیں کیں ان میں ایک عربی ماہنامہ "الضیاء" کا اجرا بھی تھا، جس کو ندوہ ہی کے ایک مایہ ناز فرزند مولانا مسعود عالم ندوی مرتب کرتے تھے۔ مگر نامساعد حالات کی وجہ سے اس کی عمر طویل نہ ہو سکی، اور جلد بند کر دینا پڑا اس کے بعد عربی زبان کی ترویج وتشویق اور تقریر وتحریر کی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لئے ایسا لٹریچر نہ تھا، جو طلبار کی رہنمائی کے لئے پیش کیا جا سکتا۔

ڈاکٹر عبد العلی صاحبؒ نے اپنے دور نظامت میں عربی نثر میں جہاں عربی کی پہلی کتاب سے لیکر آخری کتاب تک مکمل نصاب تیار کروایا، وہیں ایک عربی ماہنامہ "البعث الاسلامی" کے نام سے جاری کروایا، ابتداءً یہ رسالہ ڈاکٹر صاحبؒ نے اپنے لخت جگر محمد الحسنیؒ کے عربی ذوق کو پروان چڑھانے کے لئے جاری کیا تھا اور لیتھو پر چھپا تھا، مگر بعد میں اس کو ٹائپ کے اعلیٰ حروف جو اس وقت ہندوستان میں دستیاب ہو سکتے تھے منگوائے گئے اور "البعث" ٹائپ کے خوبصورت حروف میں شائع ہونے لگا، یہ کام ڈاکٹر صاحب کی زندگی ہی میں ہو چکا تھا اس وقت سے "البعث الاسلامی" ندوہ کے افکار وخیالات کا ترجمان رہا، اس نے اپنی آواز کو عالم عربی واسلامی کے دور دراز علاقوں تک پہونچایا اور مولانا محمد الحسنیؒ نے اپنی خداداد صلاحیتوں سے اس کو عالم عربی کے چوٹی کے رسالوں کا ہم پایہ بنا دیا۔

مولانا محمد الحسنی نے یہ کام اس وقت کیا جب ہندستان میں سرکاری خبرناموں کے علاوہ عربی ماہنامے کا بالکل وجود تک نہ تھا، اور ہندوستان سے جتنے اخبارات اور رسائل اس وقت شائع ہو رہے ہیں وہ سب اسی مجلہ کی دین ہے اس کے بعد ہندوستان سے متعدد رسائل شائع ہوئے مگر وسائل کی کمی اور تنگیٔ دامانی کی وجہ سے لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

مولانا محمد الحسنی ایک عربی صحافی کی حیثیت ہی سے تسلیم نہیں کئے گئے بلکہ انہوں نے ہندوستان میں عربی صحافت یا برصغیر میں عربی صحافت کو عوام کے ذہنوں سے قریب اور رابطہ کی زبان بنانے میں نمایاں حصہ لیا، انہوں نے "البعث الاسلامی" میں اپنے افتتاحیے کے ذریعہ ہر موضوع پر قلم اٹھایا اور زبان کی رعنائیوں، اور لطافتوں کے ساتھ ان کا حق ادا کیا اور اہل زبان سے اپنی عربی صحافت کا لوہا منوایا۔

مولانا محمد الحسنیؒ نے اپنے جوش ایمانی اور غیرت اسلامی اور طرز تحریر کی وجہ سے بہت جلد عربی صحافت میں اپنا مقام بنا لیا۔ ان کے لکھے ہوئے مضامین جو بعد میں کتابی شکل میں آ گئے اور وہ جو کتابی مجموعوں میں نہ آ سکے وہ سب ان کی غیرت ایمانی کے ساتھ ساتھ ذوق لطیف، فکر سلیم اور قلم گربار کی زندہ جاوید تصویر ہیں۔ انہوں نے اپنے عربی رسالے میں علم ومعرفت، زبان وادب اور دعوت اسلام، غرض ہر موضوع پر قلم اٹھایا، کمیونسٹوں کے خلاف مستقل جہاد کرتے رہے اور جدید عرب مفکرین کی زبان درازیوں کا خیالی محل مسمار کیا۔

"البعث الاسلامی" پابندی کے ساتھ پچیس سال تک ان کی ادارت میں نکلتا رہا، اس میں علمی وتحقیقی مقالے، جدید مضامین کی بوقت اشاعت نے اپنا حق ادا کیا، قدافی کی لن ترانیاں ہوں کہ انور سادات کا معرکہ عبور نہر سوئز ہو، سفر یروشلم جیسے خالص سیاسی موضوعات ان کے قلم سے بچ نہ سکے ان مضامین میں بھی غیور مومن کی شان نظر آتی ہے،

انہوں نے "البعث الاسلامی" میں اپنے افتتاحی کلمات میں صحیح رائے بھی دی اور اسلامی ذہن کی ترجمانی بھی کی۔ سب سے پہلے "العالم الاسلامی علیٰ مفترق الطرق" (عالم اسلامی چوراہے پر) پر لکھا اور اس کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا، اور اس کو ممتاز عربی رسائل نے اپنے پرچے میں نقل بھی کیا اور خراج تحسین حاصل کیا۔ "اسلام المسلمین" لکھ کر اسلام کو جدید ذہن کے مطابق کرنے والوں پر سخت تنقید کی۔ "طبیعۃ ھذا الدین" (اس دین کی روح) لکھا اور ۱۹۵۶ء میں منعقد اسلامی کانفرنس کو خوش آمدید کہا، مغربی

تہذیب کی یلغار اور اس کے سامنے احساس کمتری میں مبتلا ہونے والوں کو متنبہ کیا، سانحہ بنگلہ دیش کے وقت زبانی عصبیت پر سخت تنقید کی اور خبردار کیا کہ کس طرح ایک قوم زبانی عصبیت کی وجہ سے ذلیل وخوار ہوئی، اور "پیغام محبت" کے ذریعہ دین و دنیا اور منزل وراہ میں فرق واضح کیا اور جدید کھوکھلی تہذیب کو بے دل انسان سے تشبیہ دی اور انسان اور اللہ کے بنائے ہوئے سیاروں میں فرق دکھایا، جس میں بادی النظر کوئی فرق نہیں ہے لیکن درحقیقت دونوں میں بڑا فرق ہے اسلام کو دین ہی نہیں بلکہ ایک زندہ جاوید تہذیب تغیرات زمانہ کے ساتھ ہم آہنگ اور رہنمائی کرنے والا بنا کر پیش کیا، اور مغربی تہذیب کا جس انداز سے جائزہ لیا وہ قابل التفات ہے، اور اسلامی سوسائٹی کے پیمانہ پیش کئے، سید قطب کی شہادت پر جس انداز سے قلم اٹھایا وہ مومن ہی کی آواز ہو سکتی ہے اور اس کا بدلہ جنت ہے۔ مصطفیٰ سباعی پر قلم اٹھایا، ایک ستارہ چمکا اور گر گیا، قوموں کے عروج پر قلم اٹھاتے ہوئے لکھا، دولت کے بل بوتے پر قومیں جاوداں نہیں رہتی ہیں بلکہ وہی قوم زندہ رہتی ہے جو داعی ہو، امریکی تہذیب کی تصویر کشی کرتے ہوئے تحریر فرمایا، چاہا جنت ملی جہنم اور اسلام کو ماوراء الاصلاح قرار دیا، جدید مفکرین پر سخت تنقید کی۔ ادب وجودی اور جان پال سارٹر کے فکری کھوکھلے پن کو پیش کیا اور اس کے طلسم کو توڑ دیا تعمیر انسانی افضل ہے یا تعمیرات اور تعمیر مستقبل پر اشارہ کرتے ہوئے تحریر فرمایا، دور حاضر کی تعمیر میں ہم کیا کردار ادا کر سکتے ہیں؟ حکومت کے لئے اسلامی اصول، اسلامی نظام اور تخیلات کے آئینے پیش کئے، عالم اسلامی اپنی شخصیت کی تلاش میں، جنگ رمضان سے پہلا سبق، جنگ جون اور جنگ رمضان کے مابین دینی اور غیر روحانی جذبات کارفرما تھے، کو واضح طور پر پیش کیا، حسن البنا، تاریخ کے دریچہ میں، اس کے علاوہ مستقل طور سے "الرائد" میں "اضواء"، "مع الحقیقة" اور "اضواء علی الطریق" کے عنوان سے اپنے مختصر مگر جامع کلمات پیش کرتے رہے، البعث الاسلامی میں "صور وادضاع" کے عنوان سے اپنے فکری خیالات وتعلیقات تحریر کرتے رہتے تھے۔

مولانا محمد الحسنیؒ کی صحافتی زندگی محدود بھی تھی وسیع اور عام بھی، ان کے اداریے مفید بھی تھے اور قابل قدر بھی، اسلام پسندوں کے لئے رشد وہدایت بھی دشمنوں کے لئے تیشہ وتازیانہ بھی تھے ـــــ منزل راہ بھی تھے، اور زاد راہ بھی، عقل سلیم کے لئے درس عبرت اور قلب حساس کے لئے پند ونصیحت تھے، ان کے کلمات میں تبرک وتہنیت، عزت وافتخار، شوق ودارفتگی بھی، شکر وامتنان، عنایت والتفات بھی تھی اور زبان کی چاشنی وحلاوت بھی، زبان سلیس وسلیم اور سبک ملے گی، اس میں غور وفکر بھی ملے گا اور دعوت

الی اللہ بھی۔

ان کی نظر دور رس، خیالات عمیق، اور دل نباض تھا، پاکیزہ معاشرہ کے لئے صالح وپاکیزہ خاندان کی تشکیل اور ظاہر سے زیادہ باطن کی اصلاح ضروری سمجھتے تھے وہ لکھتے ہیں:۔

"خارجی دنیا کبھی نہیں بدلا کرتی، پہلے خیالات بدلتے ہیں، عقیدہ بدلتا ہے پھر اس تبدیلی کے نتائج زندگی کے پردے پر ظاہر ہوتے ہیں، ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بانفسھم"

ان کے کلمات میں سوز دروں اور جذب اندروں ملے گا۔ زور تحریر وجوش بیان بھی عربی انشاء پردازی پر قدرت اور اہم موضوعات پر قلم برداشتہ وبرجستہ لکھنے کی صلاحیت، تحریر کی تاثیر ودل آویزی اور حلاوت زبان وملاحت بیان، قلم کی روانی، زبان وادب کی ہم زبانی، خلوص وصداقت کی فراوانی، علم ومعلومات وثائق وشواہد ملے گا، الفاظ کی جادوگری، تلواروں کی کاٹ، سیلابوں کی طغیانی، قوموں کے شعور کی نشأۃ دماغوں اور دلوں کی تطہیر اور حیات نو، احساس کمتری کا ازالہ، کھوئے ہوئے اعتماد کی بحالی ملے گی۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"یہ فلسفہ کہ زمانہ بدل چکا ہے، زندگی بدل چکی ہے چنانچہ ہم بھی اپنا طرز معیشت بدلیں تاکہ ہم اس ترقی کا پورے طور پر ساتھ دے سکیں اور قافلہ حیات سے نہ بچھڑیں ایک بے معنی اور کھوکھلا فلسفہ ہے اس کا عالم حقائق سے کوئی تعلق نہیں یہ بالکل بے بنیاد بات ہے جسکی کوئی اصل نہیں اور دعویٰ بلا دلیل ہے اور یہ صرف اسی دلکش اور ملمع شدہ زندگی کا دھوکا اور فریب ہے جس کو قرآن نے معجزانہ طور پر صرف ایک کلمہ "ولو اعجبتکم" کے اندر کتنی خوبصورتی سے بیان کر دیا۔"

اسلام ایک آفاقی مذہب ہے، دین فطرت ہے، مذہب خاص وعام ہے، مذہب عقل وفکر ہے، وہ تحریر کرتے ہیں:۔

"اسلام کلمۂ حق ہے، اسلام کلمۂ نصیحت ہے، اس وقت دونوں کے ہاتھ مساوی اور میزان متوازن ہو جاتا ہے، وہ مذہب عوام ہے مذہب حکمراں ہے اور کیا ہی خوب جو دونوں اس کو قبول کر لیں وہ مذہب فطرت ہے وہ مذہب علوم ہے وہ طاہر وپاکیزہ ربانیت کا مذہب ہے وہ شنیدنی وفرمانبرداری کا مذہب ہے وہ مذہب فکر وعقل ہوشمند ہے وہ

ایمان راسخ کا مذہب ہے وہ فہم عمیق کا مذہب ہے، وہ ان لوگوں کا مذہب ہے، جن کے بارے میں عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا، دل کے صاف، علم میں گہرے اور بہت کم تکلف کرنے والے ہیں، اگر یہ محاسن مناسب انداز میں مومن میں یکجا ہو جائیں تو کیا ہی بہتر ہے"

ایک دوسری جگہ رقم طراز ہیں:-

"مسئلہ فضائل، صفات اور اعلیٰ ترین قدروں کا نہیں ہے یہاں تو معاملہ عقیدہ کا ہے، رسالت کا ہے، دعوت الی اللہ کا ہے، منزل کا ہے، اور اسلام ہی وہ بنیاد ہے جس کا قیام عقیدہ اور رسالت پر ہے اور اسی کی اس نے دعوت بھی دی ہے، اسی نے عربوں کو خاص طور سے اور عالم انسانی کو عام طور سے اس جانب رہنمائی کی اور دائمی معلومات فراہم کی، وہ انسانی زندگی کے تمام گوشوں پر اختلاف زمان و مکان اور اختلاف شہر و ملک اور مطالبات و ضروریات میں فرق کے باوجود وہ ایک مکمل دستور رہتا ہے"

وہ اپنی تحریروں میں ایمان پر بہت زور دیتے تھے اور لکھتے ہیں:-

"آج ہمیں سد ایمانی کی ضرورت ہے جس کا مسالہ اینٹ، پتھر اور فولاد نہیں بلکہ تعلیم و تربیت ہے، سینما، ریڈیو، ٹیلیویژن اور صحافت کو اخلاقی تخریب، اخلاقی زوال اور وقتی لذت کا ذریعہ بنانے کے بجائے اخلاقی و تعمیری ذمہ داری کا احساس دلانے، مقابلہ کی طاقت پیدا کرنے اور کردار کی مضبوطی کا ذریعہ بنانا ہے"

حاصل کلام یہ ہے کہ ان کے کلمات میں ہر چیز ملے گی، ہندوستان کی عربی صحافت کی نمائندگی، عالم اسلام کے لئے جرأت و بے باکی، اصلاحی تحریک کے لئے زمین کی ہمواری اور احیاء و ترقی کے لئے راہ بنانا اور دعوت غور و فکر اور اسلامی تفکر کے لئے نئے گوشے اور اس میدان میں کام کرنے کی جدید معلومات۔ ان کا قلم آبشار تھا، جو چٹانوں سے ٹکراتا اور بڑے جوش و شور میں طغیانی کی طرح گذرتا اور افسردہ جذبات کو حیات نو بخشتا۔ قیادت کے لئے انقلاب انگیز مشعل دیتا صاحب قلم کو نیا اسلوب نگارش کا نمونہ پیش کرتا، اہل فکر و عقل کو روشنی و تابناکی دیتا اور دینی و اسلامی شعور کا احیاء کرتا۔

محمد الحسنی ندوی مرحوم

(منصور نعمانی ندوی)

۱۴ جون کی صبح دار العلوم تاج المساجد بھوپال میں طلبہ کی انجمن "حزب الطلبہ" کا سالانہ انعامی مقابلہ تھا، راقم بھی اس جلسہ میں مدعو تھا۔ اس جلسہ کی صدارت امیر دار العلوم مولانا محمد عمران خاں ندوی ازہری کرنے والے تھے، صبح ۸ بجے مولانا کی قیام گاہ "غریب خانہ" فون کیا گیا تو موصوف نے گلوگیر آواز میں محمد میاں کے انتقال کی دلخراش خبر سنائی، مولانا مدظلہ، اور ندوی برادری اس خبر سے خوش تھی کہ ۱۵ جون کی صبح مولانا علی میاں مدظلہ، دو دن کے لئے بھوپال آنے والے تھے، مگر اس ہوشربا خبر نے علی میاں کا پروگرام بدل دیا اور وہ بمبئی سے سیدھے ہوائی جہاز کے ذریعہ دہلی روانہ ہو گئے، مولانا مدظلہ، نے جب یہ خبر سنی تو سکتہ طاری ہو گیا اور جلسہ کی صدارت سے معذوری ظاہر کر دی، طلبہ و اساتذہ نے اصرار کیا کہ تعزیتی جلسہ میں آپ شرکت کیجئے، مولانا اس میں شرکت کے لئے دار العلوم آئے، مولانا نے محمد میاں کی جواں مرگی اور صالحیت کی تعریف کی، اور اس کم عمری میں ان کی دینی خدمات کو خراج عقیدت پیش کیا، انہوں نے عالم اسلام میں اسلامی مزاج، اسلامی کردار اور اسلامی صحافت کی جو نمایاں خدمات انجام دیں اس کا خاص طور پر تذکرہ کیا، تقریر کے دوران ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کا ایک سلسلہ رواں رہا، بمشکل ۵ منٹ تقریر کی اور دعاء مغفرت و تعزیتی تجویز پر جلسہ اختتام پذیر ہوا،

راقم الحروف ندوہ میں تعلیم کے لئے گیا تو محمد میاں کا عرصہ تک نام سنتا رہا، اس زمانہ میں وہ ندوہ کم آتے لوگوں سے ملاقات ان کے لئے سب سے مشکل کام تھا، عرصہ اسی میں گذر گیا، لوگوں سے پوچھتا رہا کہ محمد میاں کون ہیں؟ ایک دن اتفاق سے البعث الاسلامی کے دفتر میں ان کے دید سے شاد کام ہوا، ملاقات تو عرصہ بعد ہوئی۔ اسی زمانہ میں ندوہ کے "ترجمان" "تعمیر حیات" کے نکالنے کا فیصلہ کیا گیا، اسکی ادارت کے لئے نظر انتخاب محمد میاں پر پڑی۔ مجھے قیام ندوہ کے زمانہ میں مضمون نگاری کا شوق ہوا۔

چنانچہ تعمیر حیات کے لئے مضمون لے کر ان کی خدمت میں پہونچا تو انہوں نے زیر لب تبسم کے ساتھ اس کو رکھ لیا۔ میں نے کہا اس میں حذف و اضافہ کر دیجئے گا، دوسرے دن پہونچا تو کہا آپ کا مضمون آرہا ہے۔ جب مضمون شائع ہوا تو اس میں حذف و اضافہ مطلق نہ تھا۔ اس سے مجھے حوصلہ ملا اور میں برابر تعمیر حیات میں لکھتا رہا، مرحوم ان لوگوں میں تھے جو مضمون نگاروں کے مندرجات و آراء سے اگرچہ متفق نہ ہوتے تھے، لیکن مضمون نگار کے خیالات و الفاظ میں رد و بدل وہ عیب سمجھتے تھے، جب کہ یہ ایک واقعہ ہے کہ مدیران رسائل و جرائد غیر ضروری حذف و اضافہ ہی کو اپنی کارکردگی یا صحافتی ذمہ داری خیال کرتے ہیں مگر مولانا محمد میاں جو ایک با اختیار ایڈیٹر تھے اس کو بے اصولی سے تعبیر کرتے، ان کا یہ اختیار ان کے ظرف کا پتہ دیتا ہے،

محمد میاں اس خانوادۂ فضل و کمال کے چشم و چراغ تھے جس نے ایمان و یقین، تزکیۂ باطن، اصلاحِ معاشرہ، تبلیغ و جہاد، اخلاق و انسانیت اور علم و ادب کے میدان میں وقیع و ناقابل فراموش خدمات انجام دی ہیں، ابتداء میں ان کی تعلیم و تربیت ان کے فرشتہ صفت والد مولانا ڈاکٹر عبد العلی حسنی مرحوم کے زیر سایہ ہوئی۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے عم مکرم مولانا علی میاں مدظلہ، مربی و سرپرست ہوئے، یہ ان میں صلاحیت و صالحیت ابھارنے کا غیبی انتظام تھا، مولانا موصوف کی مثالی تربیت کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے عالم اسلام کی دکھتی رگوں کو ٹٹولا، اور اس کے جسد بے روح میں ایک نئی روح پھونک دی، حق و صداقت کی بات ادا کرنے میں ذاتی مفادات کو بالائے طاق رکھ دیا اور ایک چوتھائی صدی تک عربی صحافت پر چھائے رہے اور اپنی فکر انگیز تحریروں سے گہرے نقوش ثبت کرتے رہے۔ انہوں نے مغربی تہذیب قومیت، وطنیت اور اشتراکیت کے دلفریب نعروں پر کاری ضربیں لگائیں، اور البعث الاسلامی کے صفحات پر ان زخموں کی نمائش کرتے ہوئے ملتِ اسلامیہ کو اس کے اصل منصب و ذمہ داری سے آگاہ کرنے کا فریضہ انجام دیتے رہے،

ان کا طرز تحریر البیلا تھا، بے باکی و بے خوفی اس پر مستزاد، جس زمانہ میں اخبارات وسائل جمال عبد الناصر کی شان میں قصائد پڑھ رہے تھے، اس وقت ان کا قلم اخوانیوں پر مظالم کی خونچکاں داستاں تحریر کیا کرتا تھا، اس برق دباراں کی جمالی حکومت کو کہاں تاب تھی۔ اسی جرم میں البعث الاسلامی پر مصر میں پابندی

عائد کی گئی، ان کی دلگداز تحریروں سے عالم اسلام حرکت میں آرہا تھا، انہوں نے عرب سربراہوں کی اسلام دشمن پالیسیوں اور لن ترانیوں پر بار بار البعث کے صفحات پر خون کے آنسو بہائے اور جس صاف و کھرے انداز میں باتیں بار بار رقم کی ہیں وہ ان کی جرأت ایمانی، ایمانی بصیرت، لذت کردار اور جرأت اندیشہ کی آئینہ دار ہیں، ابھی حال ہی میں ہندوستانی مسلمانوں نے جس بے ضمیری، بے حسی و بے دانشی کا ثبوت دیا اور مسٹر بھٹو کے سلسلہ میں مغربی طاقتوں کے اشاروں پر جو طوفانِ بدتمیزی کھڑا ہوا اس پر بھی ان کا شعلہ بار قلم اٹھا اور اس جذباتی بہاؤ پر انہوں نے ماتم کیا، واقعہ یہ ہے کہ باطل تحریکات کا مقابلہ وہ جس بے جگری سے کرتے تھے وہ انہی کا حصہ تھا ؎

مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ تجھے

وہ اسٹیج اور تقریر کے آدمی نہ تھے، گوشۂ عافیت میں بیٹھ کر قرطاس و قلم سے خدمت کو انہوں نے وظیفۂ حیات بنا لیا تھا مگر ایسا نہیں ہے کہ وہ ملی مسائل و ضروریات سے باخبر نہ تھے۔ مسلم مجلس مشاورت، مسلم پرسنل لا، فسادات، اردو، علی گڈھ، اور دیگر مسائل پر بھی انہوں نے اپنے پرزور اداریوں سے شرکت کی، اتحاد و اتفاق برقرار رہنے کے لئے صائب مشورے دیے اور انتشار و منافقت پر دل کے پھپھولے پھوڑے۔ اس کے لئے انہوں نے تعمیر حیات کو اختیار کیا اور ۱۵ سال تک بڑی کامیابی کے ساتھ اس کی ادارت کرتے رہے۔ ان میں کام کرنے کی اسپرٹ غضب کی تھی، عربی و اردو پرچوں کی بیک وقت ذمہ داری کے ساتھ اپنے چچا کی عربی کتابوں کے ترجمے کرتے رہے، ہر ترجمے اپنے اسلوب طرز تحریر، سلاست و متانت اور رعنائی خیال میں مولانا علی میاں مدظلہ، کی تحریر کا مثنیٰ ہیں، مولانا ان کے ترجموں سے بہت خوش ہوئے اور فرماتے معلوم ہوتا ہے کہ میں اپنی تحریر پڑھ رہا ہوں، اسلوب تحریر میں ایسی یکسانیت بہت کم دیکھنے میں آئی ہے۔ تعمیر حیات میں ان کے گرانقدر اداریوں اور مضامین کو اگر یکجا کر کے شائع کیا جائے تو اس کی کئی ضخیم جلدیں تیار ہو سکتی ہیں جو پاکیزہ صحافت کا ایک قیمتی تحفہ ہو سکتی ہیں۔

انہوں نے اپنی زندگی کی صرف ۴۴ بہاریں دیکھیں، لیکن اس مختصر عرصۂ حیات میں انہوں نے کتابوں اور ترجموں کا ایک انبار لگا دیا، اتنا کام صرف موہوبی صلاحیت والے لوگ ہی کر سکتے ہیں، اس اعتبار سے بھی

ان کا شمار حسنی خاندان کے کثیر التصانیف مصنفین میں ہوگا اور خاندانی روایات کو آگے بڑھانے والوں میں ان کا نام بھی لیا جائے گا، ذیل میں ہم ان کے علمی کام کا ایک سرسری تعارف کراتے ہیں،

۱۔ "طوفان سے ساحل تک"۔ یہ نومسلم محمد اسد کی انگریزی کتاب "روڈ ٹو مکہ" کا ترجمہ ہے۔ یہ ترجمہ اتنا سلیس و رواں ہے کہ اصل کا گماں ہوتا ہے، اس ترجمہ سے ان کی انگریزی میں مہارت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ سے ۱۳۸۰ھ میں یہ شائع ہوا اور اربابِ علم سے خراجِ تحسین وصول کیا،

۲۔ سیرت مولانا محمد علی مونگیری: مولانا محمد علی مونگیری ناظم اول ندوۃ العلماء کی سوانح حیات موجود نہ تھی اس ضرورت کو دیکھتے ہوئے ندوہ کے منتظمین کے اصرار پر محمد میاں نے ان کی سوانح حیات لکھنا شروع کی، اس کتاب میں ایک باب شبلی کے اختلافات اور ندوہ سے استعفیٰ پر ہے، اس پر مخالفانہ تبصرے بھی ہوئے اور اس سے اختلاف کی گنجائش بھی ہے مگر اس سے قطع نظر کرتے ہوئے مولانا مونگیری کے اوراق حیات اور ان کی مساعی جمیلہ پر چار سو صفحات پر ضخیم کتاب ان کی تصنیف و تالیف میں مہارت تامہ کا بین ثبوت ہے، یہ کتاب مکتبہ ندوۃ العلماء سے ۱۳۸۳ھ میں شائع ہو چکی ہے۔

۳۔ تذکرہ شاہ علم اللہ: خاندان حسنی کے گل سرسبد کی سیرت اور ان کی خدمات کا اس کتاب میں جائزہ لیا گیا ہے، یہ کتاب شاہ صاحب کی سوانح کے ساتھ اس خاندان کی خدمات کو بھی واضح کرتی ہے، یہ کتاب بھی ان کی تلاش و تحقیق پر شاہد عدل ہے۔ ۱۳۹۰ھ میں شائع ہوئی۔

۴۔ کاروانِ مدینہ: یہ کتاب دراصل مولانا علی میاں کی عربی کتاب "الطریق الی المدینۃ" کا شگفتہ و سلیس اردو ترجمہ ہے، ترجمہ کی زبان صاف ستھری اور شگرف ہے ترجمہ کے لفظ لفظ سے ذات رسالت مآب (صلی اللہ علیہ وسلم) سے محبت و عقیدت عیاں ہے، اربابِ علم نے اسلوب بیان کی دل کھول کر داد دی ہے۔ یہ کتاب عرصہ ہوا شائع ہو چکی ہے۔

۵۔ جب ایمان کی بہار آئی: یہ بھی مولانا علی میاں کی مقبول عام عربی کتاب "إذا هبّت ریح الایمان" کا ترجمہ ہے۔ اس کتاب میں سید احمد شہیدؒ کی خدمات اور ان کے جہاد و تبلیغ پر روشنی ڈالی گئی ہے زبان و بیان کے اعتبار سے یہ ترجمہ ان کی کامل قدرت پر دلالت کرتا ہے۔ ۱۳۹۳ھ میں مکتبہ فردوس

سے شائع ہوا۔

۶۔ ارکانِ اربعہ: یہ مولانا محترم کی شاہکار کتاب "الأرکان الاربعۃ" کا ترجمہ ہے۔ اس میں عبادات پر قرآن و حدیث کا نچوڑ پیش کیا گیا ہے، یہ ترجمہ کافی ضخیم ہے اور نقل مطابق اصل ہے، عرصہ ہوا شائع ہو کر مقبولیت عام حاصل کر چکا ہے۔

۷۔ معرکۂ ایمان و مادیت: مولانا علی میاں نے "تأملات فی سورۃ الکہف" کے عنوان سے عرصہ ہوا سورۂ کہف کی تفسیر لکھی۔ اس کا ترجمہ بھی افادۂ عام کے خیال سے محمد میاں نے کیا، ترجمہ خوب انداز میں کیا، مجلس تحقیقات سے ۱۳۹۰ھ میں شائع ہو کر قبولیت حاصل کر چکا ہے۔

۸۔ تزکیہ یا احسان: مولانا علی صاحب کی کتاب "ربانیۃ لا رهبانیۃ" کا اردو ترجمہ ہے، یہ ترجمہ ان کے انتقال کے بعد شائع ہوا۔

۹۔ رودادِ چمن: ندوہ کے ۸۵ سالہ جشن کی یہ بہت ضخیم روداد ہے اس کا اسلوب بیان اتنا دلکش ہے کہ قاری اپنے آپ کو اس جشن میں شریک محسوس کرتا ہے، ندوہ کے فکر اور اس کے مقاصد کو بہت خوبصورت انداز میں سمویا ہے، ندوہ کی تاریخ کی جھلکیاں بھی اس میں ملتی ہیں، یہ روداد دار العلوم سے شائع ہو کر قبولیت پا چکی ہے۔

۱۰۔ نبی رحمتؐ: مولانا علی میاں نے عربی میں "السیرۃ النبویہ" کے نام سے ایک ضخیم کتاب تحریر کی، جدید و قدیم مآخذ کی روشنی میں سیرت نبویؐ پر ایک لاجواب کتاب ہے، اس کا ترجمہ دو حصوں میں محمد میاں نے کیا، ترجمہ میں ذات رسالت مآب سے شیفتگی و عقیدت سطر سطر سے عیاں ہے، یہ ترجمہ ۱۳۹۸ھ میں مجلس تحقیقات و نشریات اسلام سے شائع ہو چکا ہے۔ کیا عجب کہ بارگاہِ صمدیت میں یہ شفاعت و محبوبیت کا ذریعہ بن جائے۔

۱۱۔ حیات مولانا مدنیؒ: محمد میاں عرصہ سے مولانا مدنیؒ کی سوانح حیات مرتب کر رہے تھے اور اس سلسلہ میں کافی مواد بھی فراہم کر چکے تھے۔ کتاب ابھی نصف ہی ہو پائی تھی کہ پیامِ اجل آپہونچا اور یہ کتاب تشنہ رہ گئی، امید ہے کہ مولانا ثانی صاحب اس کو مکمل کر کے محمد میاں کی یہ آرزو پوری کرینگے۔

۱۲۔ پاجا سراغِ زندگی: یہ مولانا علی میاں مدظلہ، کی کچھ تقاریر کا مجموعہ ہے جس کو محمد میاں نے سلیقہ د

دمحنت سے ترتیب دیا، طلباء بھٹکل عرصہ ہوا اس کو شائع کر چکے ہیں۔

اس کے علاوہ مولانا کے مختلف کتابچوں اور مضامین کے ترجمے بھی کیے اور خود بھی سیکڑوں اردو میں مقالات تحریر کئے اردو مضامین کا انتخاب بھی جلد شائع ہونا چاہیئے، اردو کے علاوہ ان کی عربی کی قابلِ ذکر خدمات یہ ہیں:۔

۱۳۔ مکانۃ الصلوٰۃ فی الاسلام: یہ دراصل شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کی مقبول عام کتاب "فضائل نماز" کا عربی ترجمہ ہے اس کا اسلوب بیان بہت دلچسپ ہے۔ اور عالم عرب سے خراج تحسین وصول کر چکا ہے۔

۱۴۔ رسالہ ندوۃ العلماء: جشن ندوہ کے موقع پر اردو میں "روداد چمن" لکھی اور عالم عرب میں ندوہ کے پیغام و مقاصد کا تعارف اس سے کرایا، اس میں تحریک ندوۃ العلماء پر بصیرت افروز مقالات کو یکجا کر دیا ہے۔ البعث الاسلامی کے جشن سے پہلے اور بعد دو ضخیم نمبر بھی ان کی قابل قدر یادگار ہیں،

۱۵۔ الاسلام الممتحن: یہ ان عربی مقالات کا مجموعہ ہے جو وقتاً فوقتاً البعث الاسلامی کی زینت بنتے رہے، اس فکر انگیز مجموعۂ مقالات کو عالم عرب بلکہ دنیائے اسلام میں بڑی قبولیت حاصل ہوئی، نوجوان طبقہ کو خواب غفلت سے جگانے میں اس نے نمایاں کردار ادا کیا ہے، اس وقت تک اس کے چار ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

۱۶۔ مصر تتنفس: مصر کے حالات اور تبدیلیوں پر یہ مقالات کا مجموعہ ہے، یہ بھی البعث میں شائع ہوتے رہے۔ ابھی یہ مجموعہ طباعت کے مراحل میں ہے۔

۱۷۔ الی القیادۃ العالمیۃ: یہ بھی البعث کے اداریوں کا مجموعہ ہے جو عالمی قائدین سے صاف صاف باتوں کی شکل میں ہے، یہ مجموعہ بھی جلد شائع ہوا چاہتا ہے۔

الغرض اردو و عربی زبان کی انہوں نے جو خدمت انجام دی ہے، اس کو فراموش نہیں کیا جا سکے گا، ان کی ناوقت موت ندوہ، ندوی برادری اور عالم اسلام کے لئے ایک عظیم سانحہ ہے، ان کے عم محترم اور خاندان کے لئے یہ اچانک حادثہ سوہانِ روح کا باعث ہوگا مگر خدائی حکمتیں و مصلحتیں ہی

ان کے صبر و شکیب کا سہارا ہوں گی۔ ان کے انتقال سے صحافت اسلامیہ کا ایک قوی و جری شہسوار رخصت ہو گیا، خدا ان کی اسلامی، دینی اور ملی خدمات کو قبول کرے۔ آمین

تدمع العین و یحزن القلب ولا نقول الا ما یرضی ربنا وانا لفراقك لمحزونون ہ

سب سے بڑا کمال

انسان کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ اس کا ظاہر و باطن یکساں ہو، ایک طرف اس کا سینہ ایمان و یقین سے اور اس کا دل لازوال محبت سے معمور ہو اور دوسری طرف اسکی زبان اس کے دل کی ہمنوا اور اس کا عمل ان جذبات اور کیفیات کی ترجمانی کر رہا ہو۔ اگر یہ بات کسی انسان کو حاصل ہو جائے تو اس کا ہر قول و عمل اور اس کی ہر تقریر اور تحریر میں ایک ایسی دلکشی اور دلآویزی پیدا ہو جائے گی جس کی تعبیر الفاظ سے نہیں کی جا سکے گی لیکن اس کی مٹھاس ہر شخص محسوس کرے گا اور اسے ایسا معلوم ہوگا کہ جیسے کسی نے اس کے دل کی بات کہہ دی یا اسکی گمشدہ دولت اس کو واپس مل گئی ؎

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

(مولانا محمد الحسنی ندوی مرحوم)

مولانا محمد الحسنی ـــــ اسلامی ادیب کی حیثیت سے

شمس تبریز خاں

بعض ناقدین ادب کا کہنا ہے کہ "اسلوب ہی شخصیت ہے"۔ یہ مقولہ جواں مرگ وجواں قلم اسلامی ادیب مولانا محمد الحسنی مرحوم پر پوری طرح صادق آتا ہے ان کی شخصیت ہی کی طرح ان کے اسلوب تحریر میں بھی جوش و خروش کے ساتھ متانت وسنجیدگی، وقار وتمکنت کے ساتھ سوز وگداز، فکر وخیال کے پہلو میں جذبات واحساسات، علم وفن کی بغل میں ایمان ویقین، اور 'جدید نافع' کے ساتھ 'قدیم صالح' کا حسین وخوشگوار امتزاج دل کو موہ لیتا اور ان کی دل نشیں تحریروں کے پڑھنے والے کو ان سے ملنے والے کی طرح اپنی طرف پوری طرح متوجہ کر لیتا ہے ؎

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم — کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

پروفیسر رشید احمد صدیقی کی طرح اپنا یقین بھی یہی ہے کہ 'ایک اچھا ادیب اچھا انسان بھی ہوتا ہے' اور اپنا یہ یقین محمد الحسنی جیسے اچھے انسانوں اور اچھے ادیبوں کے نمونے دیکھ کر کچھ اور پختہ ہو جاتا ہے' ان کی تحریروں میں ایمان واحسان کی جو پختگی اور برگزیدگی، اخلاص ودل سوزی کی جو مٹھاس، اسلام کی نشأۃ ثانیہ کے لیے جو تڑپ اور بے چینی اور پاکیزہ جذبات کی حدت وشدت کے ساتھ فکر ونظر کی جو جامعیت ومتانت نظر آتی ہے وہ اس بات کی تصدیق کرتی ہے کہ "ہر اسلوب کے پیچھے ایک شخصیت چھپی ہوتی ہے"، یہ کیونکر ممکن ہے کہ ایک بے عمل اپنی باتوں سے لوگوں میں روح عمل پھونک دے، مردہ دپژمردہ جذبات والا کوئی شخص کسی انسانی معاشرے میں اضطراب اور بیداری کی لہر پیدا کر دے اور ایک بے کردار وبے ضمیر آدمی، اپنے ہم جنسوں میں غیرت وحمیت کے جذبات کو متحرک کر دے اور خود بیمار ہوتے ہوئے دوسروں کے لیے مسیحا بن جائے ؟ ؎

حسنِ فروغِ شمعِ سخن دور ہے اسدؔ
پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی

ایمان ویقین عمل کی طرح فنی عمل، یعنی ادب میں بھی جان پڑ جاتی ہے اور مقصد کا عشق، منزل کی

لگن اور کامیابی کا اذعان قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتا اور اسے مسخر ومسحور کر دیتا ہے۔ اسلامی یا مقصدی ادب اپنے واضح اور متعین ہدف کے سبب قاری کو دھندلکے اور اشتباہ میں نہیں رکھتا بلکہ شروع ہی سے اسے اپنے اعتماد میں لیکر اور اسے اپنی ہمدردی میں شریک کر کے کسی نصب العین تک پہنچاتا اور اپنے اندر صراحت وصاف گوئی، افادیت ومقصدیت، اور اصلاحی وتعمیری قطعیت کی وجہ سے اس کے لئے زبردست اپیل اور دلکشی رکھتا ہے۔ اسلامی یا ایمانی ادب، انسان وکائنات اور خالقِ کائنات کے باہمی رشتے کے عرفان زندگی میں اسکے نفاذ اور اس کے ذریعہ رضائے الٰہی کے حصول اور فلاحِ آخرت کے یقین یا دوسرے لفظوں میں توحید رسالت اور آخرت کے وسیع امکانات پر ایمان کے سبب سے زندگی کا مثالی تصور بن کر سامنے آتا اور اپنے اندر خود زندگی جیسا زور اور اثر رکھتا ہے اور ابہام واشتباہ، فکری انارکی اور بے مقصدیت پر مبنی ادب کے مقابلے میں ہر طرح بڑھا ہوا ہوتا ہے۔

مولانا محمد الحسنی کی تحریریں بھی اسلامی ادب کی انہی خصوصیات کی حامل ہوتی تھیں اور سب سے پہلے اپنے ایمان پرور اور یقیں آفریں اسلوب سے قاری کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی تھیں، اسے ان تحریروں میں ایمان کی حرارت، اخلاص کی قطعیت وصراحت، اور دعوتی جذبہ کی قوت وتاثیر صاف طور پر محسوس ہوتی اور دیکھتے ہی دیکھتے اسے بے یقینی سے یقین تک، بے مقصدیت سے ایک واضح نصب العین تک اور مادہ وحواس کی محدود دنیا سے نکال کر ماورائے محسوسات، کیفیات تک پہنچا دیتی تھیں، خدائے بزرگ وبرتر کی ہمہ جہت ذات وصفات پر یقین، توحید ورسالت کے عظیم امکانات پر اور ان کی کارسازی ومشکل کشائی پر غیر متزلزل ایمان، رہتی دنیا تک نبوت محمدی کی چارہ سازی اور انسانیت کی دستگیری ورہنمائی کی ابدی صلاحیت پر مکمل اعتماد کے سبب ان کے قلمی شاہکار زندگی آمیز اور زندگی آموز ادب کی طاقتور عکاسی اور ترجمانی کرتے ہیں، اور افادیت ومقصدیت کے حامل ادب کا اچھا نمونہ کہے جا سکتے ہیں۔

عصر حاضر میں اسلام کے دعوتی لٹریچر کی پیشکش ایک طرف روایتی زبان اور عوامی وواعظانہ انداز میں ہو رہی ہے جس کی اپیل بہت محدود ہے اور اس میں کہنگی وفرسودگی نظر آتی ہے دوسری طرف دین کو عصری سیاسی اصطلاحات میں پیش کرنے کی کوشش ہے جس سے خود اسلام کی اصلیت (Original Islam) کو خطرہ ہے اور اس کے اصول ومبادی کے اندر تحریف اور سلفِ صالحین وجمہور اسلام کی روش سے انحراف وعلیحدگی کا

اندیشہ پیدا ہو جاتا ہے اس لیئے یہ طرز و اسلوب بھی قابل قبول اور سود مند نہیں، یہی حال تجدد پسند اور مغرب زدہ مسلمان اہل قلم کا ہے جو دیدہ و دانستہ تقلیدِ مغرب میں مبتلا ہیں اور وہ اپنی تحریروں کے ذریعہ اسلام پر اعتماد بحال کرنے کے بجائے اسے متزلزل کر دیتے اور قاری کے ذہن میں نئے شکوک و شبہات پیدا کر دیتے ہیں۔

ان اسالیب تحریر و دعوت کے درمیان ایک طرز نگارش اور بھی ہے جو جدید و قلم کے امتزاج، فکر و خیال کے ساتھ جذبات و احساسات کی ہم رشتگی اور عقل و دل کے صحیح توازن اور اعتدال و سنجیدگی کا نمونہ ہے جس کے علم برداروں میں مولانا شبلی، علامہ اقبال، علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا سید مناظر احسن گیلانی، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور مولانا سعید احمد اکبر آبادی ہیں، مولانا محمد الحسنی مرحوم بھی فکر و خیال اور طرز و اسلوب کے اعتبار سے اس طلائی زنجیر کی ایک کڑی اور اس دبستانِ فکر کے ایک رکن ہیں۔

ان کی بیش قیمت اردو عربی تحریروں کو پڑھیے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان میں اسلام کامل اور دینِ خالص کی وہ ترجمانی موجود ہے جو اسلام کی ۱۴۰۰ سالہ تاریخی میراث کا تقاضا ہے اور جس میں سلف کی تعبیر و ترجمانی کا لحاظ رکھا گیا ہے مگر اسے پیش کرتے وقت اپنے لئے مخاطب کے رجحانات نئے ماحول اور نئے مسائل و مطالبات کی بھی پوری رعایت رکھی گئی ہے اور اسلام کو نہ صرف عقائد و اعمال کے ایک روایتی مجموعہ کے طور پر پیش کیا گیا ہے جس میں سیاست و حکومت کو دنیاداری سمجھا جاتا ہے اور نہ اسے سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی نظامِ حیات بنا کر دکھایا گیا ہے جس میں اسلام کا روحانی نظام اور اس کا احسانی و عبادتی پہلو دب کر رہ جاتا ہے اور اس طرح اسلام اپنی پوری آب و تاب اور مکمل شکل و صورت میں سامنے آنے کے بجائے ایک ناقص و نامکمل انداز میں سامنے آتا ہے۔

محمد میاں کے اسلوب میں فکر و جذبہ، علم و ایمان اور عقل و وجدان کا ایسا توازن اور رکھ رکھاؤ ملتا ہے جس سے عصر حاضر میں اسلام کی طاقتور ترجمانی اور موثر نمائندگی بہت آسان ہو جاتی اور وہ بیک وقت اسلام کی عقلی و فکری اور وجدانی و قلبی تفہیم و تشریح اور دعوت و اشاعت کا بہترین نمونہ ہے۔

اس میں فکری صلابت و پختگی کے دوش بدوش جذبہ و احساس کی رقت و شگفتگی، عقل و ذہن کی روشنی و بیداری کے پہلو بہ پہلو قلب و وجدان کی چھٹکی ہوئی چاندنی اور نرم و نازک، لطیف و سبک روحانی تقاضوں کی

تکمیل کا سامان موجود ہے۔

جہاں فکری لحاظ سے اسلام کو دین و دنیا کے ایک مکمل اور جامع نظام کی حیثیت سے روشناس کرانے کے ساتھ اسلامی انقلاب کے راستے میں حائل فکری و سیاسی تحریکات میں مغربیت و مادیت، آمریت و اشتراکیت، قومیت و صیہونیت، لادینیت اور اباحیت کی کامیاب تنقید و تردید ان کا یادگار کارنامہ ہے وہیں عصری اسلوب و زبان میں ایسے تعمیری و اصلاحی خیالات کی ترویج و اشاعت، اردو و عربی کے اسلامی ادب و انشاء میں ایک وقیع و گراں قدر اضافہ ہے، ان کے تیار کردہ لٹریچر کی لسانی قدر و قیمت بھی کسی طرح کم نہیں، انکی تحریر بے تکلف و بے تصنع، جذبات و احساسات اور خلوص و صداقت کا آئینہ، سلجھے ہوئے اور معتدل و متوازن افکار و خیالات کے شایانِ شان زبان و بیان کا گلدستہ ہے، حسن ذاتی کی طرح تکلف سے بری، تصنع سے دور، رواں دواں الفاظ جن میں کہیں کہیں مترنم جذبات و خیالات، رعایتِ لفظی کے سبب شعرِ منثور کا رنگ اختیار کر لیتے ہیں، اور برمحل اشعار مزہ دے جاتے ہیں، عصری اصطلاحات سے کام لے کر عصری کمزوریوں پر لطیف طنز و تعریضیں اور مجموعی طور پر ان کے فکر و اسلوب کی پاکیزگی و برگزیدگی، لطافت و نزاکت اور رفعت و متانت اسلامیات پر لکھنے والوں کے لئے سامانِ ہدایت اور سرمۂ بصیرت ہیں۔

محمد میاں مرحوم کے تحریری کارنامے مختلف موضوعات اور اصناف علم و ادب سے متعلق ہیں جن پر مجموعی طور پر انشا پردازی و مقالہ نگاری اور تاریخ و تذکرہ نویسی کا رنگ غالب ہے، وہ ایک کامیاب صحافی بھی تھے جس کے شاہد ان کے رسالے "البعث الاسلامی" اور "تعمیر حیات" ہیں، انہوں نے صحافت کو بھی ایک وقار و اعتبار اور معیار بخشا اور اس میں ثقاہت و شائستگی پیدا کی۔

وہ ایک بہترین مقالہ نگار تھے اور اپنے موضوع میں جذباتی کشش اور وجدانی دل کشی پیدا کرنا جانتے تھے (اگرچہ اس میں کسی تکلف اور شعوری کوشش کو دخل نہ تھا اور یہ فن کاری سے زیادہ ان کے خلوص کا نتیجہ ہوتا تھا) اس صنف کا عمدہ نمونہ ان کی کتاب "الاسلام الممتحن" اور "تعمیر حیات" میں ان کے ادارتی مضامین ہیں۔

مستقل تصنیف و تالیف کا انھیں موقع کم ملا ورنہ ان میں ایک کامیاب اور مثالی مصنف کی صلاحیتیں موجود تھیں پھر بھی ان کی لکھی ہوئی "سیرت مولانا محمد علی مونگیریؒ" "تذکرہ شاہ علم اللہؒ" پیام ندوۃ العلماء اور

رودادِ چمن، عرصہ تک باقی رہنے والی کتابیں ہیں، سیرتِ مولانا مونگیری اور تذکرہ شاہ علم اللہ، تاریخ و تذکرہ اور سیرت و سوانح کی بہترین کتابوں میں شامل ہونے کے لائق ہیں، ان میں تاریخی و سوانحی مواد کی عمدہ ترتیب و تنظیم کے ساتھ، تاریخی شعور، صاحبِ سوانح کے ماحول اور زمانے کا احساس اور اس کے درمیان صاحب سوانح کی عظمت اور حقیقی کارناموں کا تعین بھی کیا گیا ہے اور اس کے خیالات و جذبات کی مؤثر ترجمانی کی گئی ہے اور اس طرح اس کے حالات و واقعات کے ساتھ ذہنی کیفیات اور تصورات و رجحانات بھی سامنے آتے اور ناظرین کے اندر اس کی تقلید و اتباع کا جذبہ پیدا کرتے ہیں۔

تذکرہ شاہ علم اللہؒ، ایجاز و جامعیت اور مختصر نویسی کا ایک اچھا نمونہ ہے، اس کے پونے دو سو صفحات میں مختلف اکابر سادات و مشائخ کا تذکرہ آگیا ہے اس کے ساتھ تصوف و سلوک کے افکار کا خلاصہ بھی۔

پیامِ ندوۃ العلماء بھی اسی طرح کی مختصر کتاب ہے جس میں ندوۃ العلماء جیسی بڑی تحریک کے آثار و افکار کو چند صفحات میں سمیٹنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔

"رودادِ چمن"، ۱۹۷۵ء میں ہونے والے پچاسی سالہ جشنِ ندوۃ العلماء کی روداد اور رپورتاژ ہے، اس میں انہوں نے اپنے موئے قلم سے اس عظیم الشان اجلاس کی ایسی چلتی پھرتی تصویر کھینچی ہے جس سے قاری اپنے کو اجلاس کے ماحول میں محسوس کرنے لگتا ہے اور خبر اس کے لیے نظر بن جاتی ہے۔

مولانا محمد میاں ایک لائق و مشاق مترجم بھی تھے ان کے بیشتر ترجمے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی مدظلہ، کی عربی کتابوں کے ہیں، انہوں نے مولانا کی بہت سی اہم کتابوں کو اردو کا جامہ پہنا کر اردو کو مالا مال کیا اور اسلامی ادب میں اضافہ کیا ہے۔ ان کے تراجم میں اصل کی روح موجود ہے، بلکہ اصل و نقل کا فرق ختم ہو گیا ہے۔ اور اندازہ ہی نہیں ہوتا ہے کہ یہ کتابیں کسی اور زبان میں لکھی گئی ہیں، ان کے قیمتی تراجم میں "اسلامیت و مغربیت کی کشمکش"، "ارکانِ اربعہ"، "نبیِ رحمتؐ"، اور "تزکیہ و احسان"[1] شامل ہیں۔

ان کا ایک اور کامیاب ترجمہ محمد اسد کی 'ROAD TO MECCA' کا ہے جو اردو میں "طوفان سے ساحل تک"، کے نام سے شائع ہو کر بہت مقبول ہوا ہے۔

---

[1] یہ ترجمہ مرحوم کی وفات کے بعد ابھی حال میں شائع ہوا ہے جسے وہ مطبوعہ شکل میں نہیں دیکھ سکے۔

۴۴ سال کی مختصر عمر میں ان کے ایسے علمی، دینی اور ادبی کارنامے اور ایسی قلمی فتوحات انکی غیر معمولی اور خداداد صلاحیتوں کا نتیجہ کہی جا سکتی ہیں، جس کا ایک ثبوت اُن کا وہ فکر انگیز مضمون ہے جو، اسال کی عمر میں انہوں نے دمشق کے موقر اسلامی مجلہ "المسلمون"، میں اپریل ۱۹۵۴ء کے شمارے میں "العالم الاسلامی علیٰ مفترق الطرق"، کے عنوان سے لکھا تھا۔

اس تبصرہ کو خود ان کے اس تبصرہ پر ختم کیا جا رہا ہے جو انہوں نے اپنی کتاب "الاسلام المتحن" کے دیباچے میں اپنی تحریروں پر کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:۔

"یہ مقالات مختلف اوقات و حالات میں اور مختلف موضوعات پر لکھے گئے مگر ان کا پیغام یکساں ہے اور ایک ربط باہمی موجود ہے جسے میں اللہ کے لیے محبت اور اللہ کے لیے نفرت کہنا پسند کروں گا۔ . . . . . .

اس میں سرگشتہ مسلم نوجوان ایسا مواد پائیں گے جو دین پر ان کے اعتماد کو بحال کرے گا اور ان کے ایمان کی تقویت اور اسلام کے لیے شرح صدر کا باعث ہوگا اور حق و باطل، نور و ظلمت کے معرکے میں اسے ثابت قدمی عطا کرے گا۔"

(عربی سے ترجمہ)

کلی نے یہ سُن کر تبسّم کیا

ایک تعزیتی مکتوب

ڈاکٹر حبیب الحق ندوی۔ ڈربن یونیورسٹی جنوبی افریقہ

کل پہلی رمضان المبارک کو تعمیر حیات، مؤرخہ ۲۵ جون ۱۹۷۹ء، سید محمد الحسنی کے اچانک سانحہ ارتحال کی جگر پاش خبر لایا، ہاتھ سے پرچہ چھوٹ گیا جیسے بجلی کا جھٹکا سا لگ گیا۔ دیر تک اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ اس جانگسل حادثہ پر جس قدر اشکہائے ماتم والم کا سیلاب بہایا جائے کم ہے۔ ابھی ڈیڑھ سال قبل برادر عزیز محمد الحسنی سے میری ملاقات ندوہ میں ہوئی تھی۔ چند صحبتوں میں جہاں یادوں کی برات ایام رفتہ کو حیات تازہ عطا کرتی رہی اور ابتدائی طالب علمی کے دور کے بہت سے واقعات کو اجاگر کرتی رہی وہاں مرحوم کی محبت تواضع وانکساری، جو انسانی کردار کے تاج محل کا کلس ہے۔ میرے ذہن پر انمٹ مثبت نقوش بھی نسب کرتی رہی۔ دیر تک سوچتا رہا آخر صیاد اجل نے اس نو دمیدہ کلی کو اسلامی نشاۃ ثانیہ کے گلستاں و بوستاں سے اس قدر جلد کیوں اچک لیا؟ شاید اس لیے کہ ریاض الجنۃ کو اس کلی کی عطر بیزی کی ضرورت تھی۔! فکر و نظر اور دعوت و شجاعت کی نو میدہ کلی سید محمد الحسنی نہضۃ اسلامیہ کے گلشن میں بھرپور طور پر کھلنے بھی نہ پائی تھی کہ اچانک یہ کلی تبسم کے نقطہ ارتکاز یا ارتحال پر جا پہنچی، نونہالان نہضۃ اسلامیہ کی نظریں ہنوز اس کی شگفتگی کی منتظر تھیں۔ افکار کی آبیاری پر نگاہیں جمی ہوئی تھیں کہ وقعت الواقعۃ لیس لوقعتھا کاذبۃ" کا مرحلہ پیش آگیا، یعنی کلی سے جو پوچھا کہ کتنا ہے گل کا ثبات ع

ع ..... کلی نے یہ سن کر تبسم کیا۔

کیا واقعۃً فعّال انسانی زندگی کا وقفہ یا لمحہ ایک کلی کے تبسم سے زیادہ نہیں؟ کیا یہی ہے زندگی اور حقیقت زندگی۔؟

نہضۃ اسلامیہ کا تابندہ ستارہ

آج جبکہ دنیا کے گوشہ گوشہ اور چہار سمت سے جانبازان راہ حریت اور سرفروشان راہ حق کا

فیروز مند قافلہ توحید کی دعوت دے رہا ہے اور نہضۃ اسلامیہ کی لہریں نشاط وانبساط، حوصلہ و شجاعت کی فضا پیدا کر رہی ہیں۔ محمد الحسنی جیسے تابندہ ستاروں کی ضرورت ہر دور سے زیادہ تھی، تاکہ دردمندان اسلام اور مخلصین لہ الدین" کا یہ قافلہ حوصلہ واعتماد کے ساتھ مغربی جادو کی سیاہ چادر کو چاک کرتا ہوا "شعارنا الوحید الی الاسلام من جدید" کا ترانہ گاتا ہوا سوئے حرم تیز گام ہوتا اور خوابیدہ روحوں کو معمار حرم باز بہ تعمیر جہاں خیز کی اذان سے جگاتا ہوا ایمان وعلم اور ایقان کے سرحد تک پہنچا دیتا۔

لیکن کل من علیھا فان ویبقی وجہ ربک ذوالجلال والاکرام ایک ابدی وسرمدی حقیقت ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون" استعانۃ بالصبر والصلوۃ ہی مومن کا سہارا ہے اور سامان زیست کا ذریعہ بھی۔

اس جانکاہ المیہ اور دلدوز و دلسوز جواناں موئی نے اسلامی نشاۃ ثانیہ کے ہر سپاہی کو مغموم و مجروح کیا ہے اور صدمہ پہنچایا ہے۔ لیکن موت وزیست کے فلسفہ سے باخبر انسان محمد حسنی سے جو صدا سن سکتا ہے وہ اس کے سوا کچھ اور نہیں ؎

زندگی کا شعلہ اس دانے میں جو مستور ہے
خود نمائی خود فزائی کے لیے مجبور ہے

سردی مرقد سے بھی افسردہ ہو سکتا نہیں
خاک میں دب کر بھی اپنا سوز کھو سکتا نہیں

پھول بن کر اپنی تربت سے نکل آتا ہے یہ
موت سے گویا قبائے زندگی پاتا ہے یہ

ہے لحد اس قوت آشفتہ کی شیرازہ بند
ڈالتی ہے گردن گردوں میں جو اپنی کمند

موت تجدید مذاق زندگی کا نام ہے
خواب کے پردے میں بیداری کا ایک پیغام ہے

خوگر پرواز کو پرواز میں ڈر کچھ نہیں
موت اس گلشن میں جز میجیدن پر کچھ نہیں

جوہر انساں عدم سے آشنا ہوتا نہیں
آنکھ سے غائب تو ہوتا ہے فنا ہوتا نہیں

محمد الحسنی کی زندگی کا شعلہ نہاں سردی مرقد سے افسردہ نہیں ہو سکتا۔ تحریکی شخصیتیں کبھی مردہ نہیں ہوتیں، وہ زندہ جاوید ہیں، کیونکہ ان کی زیست کا تسلسل دعوت کے تسلسل سے قائم ہے، تاج محل کی حسین آرائشوں ریاضی یا ریاضیاتی پرکاریوں کی سج دھج میں سونے والے آج محض آثار قدیمہ کی یادگار ہیں، زائرین لال قلعہ دیوان عام اور دیوان خاص کی پیشانی پر "اگر فردوس بر روئے زمین است ۔ ہمیں است وہمیں است"

کا ٹیکہ دیکھ سکتے ہیں، جو اپنے پیش رو آقاؤں کو آواز دے رہا ہے کہ نو سو برس کی کشور کشائی کے بعد بھی سرزمین ہند تمھیں اپنا نہیں بنا سکی، تم اس کے سینے پر بوجھ ہو، اجنبی ہو اور حملہ آور کے نام سے یاد کیے جاتے ہو، کیوں؟ اس لیے کہ دعوت وعزیمت کی راہ سے تم ناآشنا تھے۔ اس کے برخلاف سید احمد شہید، مجدد الف ثانی، خواجہ اجمیری نظام الدین اولیاء یحییٰ منیری اور محمد علی مونگیری وغیرہم زندۂ جاوید ہیں۔ وہ آثار قدیمہ یا موزیم کی زینت نہیں بلکہ زینت ارواح وقلوب ہیں، ان کی حکومت آج بھی دلوں پر قائم ہے، بیشتر مسلم سلاطین ہند آج تاریخ کے صفحات میں گم ہیں لیکن سلاطین اور اولیاء فکر ودعوت متحرک وفعّال ہیں، اسی دعوت اور سلسلہ افکار کی ایک کڑی محمد الحسنی بھی تھے۔ اس کڑی کو موت چھو نہیں سکتی اور تا قیامت دعوت محمدی اور دعوت حسنی جاری وساری رہے گی۔

عالم اسلام کی فضا تیزی سے بدل رہی ہے، اسلام واپس آرہا ہے۔ چودھویں صدی ہجری کا اختتام نشأۃ اسلامیہ کے آغاز کی تمہید ہے۔ تقدیر کا سینہ پھٹنے والوں کو عزم وحوصلہ کا درس دیا جارہا ہے، ہر طرف سے آواز بلند ہو رہی ہے ؎

میری ہمتوں کو مٹانا ہے مشکل　　سمندر میں اب اتنا پانی نہیں ہے

اہل مغرب اور ان کے ایشیائی ایجنٹ اسلام کے اقدام کو روک نہیں سکتے۔ کیونکہ اب اہل اسلام خود تقدیر یزداں بن چکے ہیں، وہ خاک کی آغوش میں تسبیح ومناجات کے بجائے وسعت افلاک میں تکبیر مسلسل پر آمادہ ہیں عشق اسلام اور عشق الٰہی نے آداب خود آگاہی کا درس عام کردیا ہے اور غلاموں پر اسرار شہنشاہی کو فاش کردیا ہے۔ اس پوری تحریک میں محمد الحسنی، اہل ندوہ اور رفقاء ندوہ کا نمایاں ہاتھ ہے، اس کارواں کو یقین ہے کہ "عالم پیر دگر بار جواں خواہد شد۔

ذاتی تاثرات کا ذکر سطور بالا میں کسی حد تک کرسکا ہوں، لیکن جنوری ۱۹۷۸ء کی ملاقاتوں میں جو تاثرات مرتب ہوئے ان کا ذکر مشکل ہے۔ مرحوم نے باصرار مجھ سے وعدہ لیا کہ میں تعمیر حیات کے ساتھ پھر تحریری رابطہ قائم کروں اور مسلم ذہنوں کو فسون فرنگ سے نجات دلانے اور فلسفہ اعتذار کے خلاف جس مہم کا آغاز ۱۹۶۴ء میں جامعہ ہارواڈ سے کیا تھا اسے دوبارہ شروع کروں، افسوس ہے کہ ایفاء وعدہ سے قبل ہی مرحوم نم کنوم العروس کی منزل تک جا پہنچے۔ مرحوم نے اپنی چند تالیفات بھی نقد ونظر کے خیال سے ہدیہ پیش کیا تھا تاکہ اپنی رائے لکھ سکوں۔

قصد ہے کہ انشاء اللہ اسلامی نہضہ کے مختلف گوشوں پر وقتاً فوقتاً کچھ نہ کچھ لکھتا رہوں۔ خود افریقہ میں اسلامی اور اسلامی تحریکات ایک دلچسپ موضوع ہے۔ افریقہ اسلامی براعظم کے نام سے پکارا جاتا ہے، کیوں کہ ۶۲ فیصدی مسلم آبادی، تمام مسیحی پریشہ دوانیوں کے باوجود فعّال ومتحرک ہے، مغربی استعماری افریقہ کو موت کا جنگل، سیاہ وتاریک براعظم ثابت کرتے رہے تاکہ دنیا کی نظریں اس کی طرف نہ اٹھ سکیں۔ اس پردہ زنگار کے پیچھے وہ پورے افریقہ کا استحصال کرتا رہے۔ سونے اور ہیرے وجواہرات کی کانوں پر سیاہ ناگ کی طرح بیٹھے رہے۔ مسیحی تحریکات کا جال بچھا کر۔ مشنری اسکول، کالج، ہسپتال اور رفاہ عام کے ادارے کھول کر استعماریوں نے سب سے زیادہ صدمہ اسلام اور اہل اسلام کو پہنچایا ہے، لیکن خدا کی شان ہے کہ استعماری مرضیات کے خلاف اسلام پھر افریقہ کی سرزمین پر جاگ اٹھا ہے، شاید اس لیے کہ افریقہ واقعۃً اسلامی براعظم ہے۔ سن پانچ نبوی میں اسلام جزیرہ عرب سے نکل کر سب سے پہلے حبشہ یعنی افریقہ پہنچا، اس قافلہ میں رسولؐ کی لخت جگر اور داماد حضرت عثمانؓ بھی شریک تھے۔ ام المومنین ماریہ قبطیہ اسی زمین کے عزو شرف کا سبب بنیں اور اسلام کے جد امجد حضرت ابراہیم کی رفیق حیات حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیل کی والدہ ماجدہ اسی گلشن افریقہ سے کھلیں۔ بلال حبشی کی ذات نے سرزمین افریقہ کی پیشانی پر عزت کا ٹیکہ لگایا۔ محمد الحسنی مرحوم افریقہ میں بیداری اسلام کی داستان سن کر بلاشبہ بے حد مسرور ہوتے۔ موقع ملا تو ان موضوعات پر محمد الحسنی ممورییل سریز کے تحت کچھ لکھوں گا۔ محمد الحسنی مرحوم کی پہلی روح پرور کتاب سیرت مولانا محمد علی مونگیری جو پہلی بار اپریل ۱۹۶۴ء میں شائع ہوئی۔ جون یا جولائی میں میری نظروں سے گزری، اسی وقت سے ایک روحانی لگاؤ پیدا ہوا۔ کیونکہ مولانا محمد علی مونگیری میرے خاندان کے پیر ومرشد تھے، بلکہ میری والدہ ماجدہ کا مکتب بھی اپنے دست مبارک سے شروع کرایا۔ مولانا محمد علی کے ۶۲ غیر مطبوعہ خطوط میرے پاس ہیں۔ محمد الحسنی مرحوم انھیں دیکھ کر بے حد خوش ہوتے بلکہ اپنی کتاب سیرت محمد علی کا ضمیمہ تصور کرتے یہ خطوط ہمارے نانا جان سید ابو البقاء محمدؐ (لفظ محمدؐ حضرت مونگیری مرشد کی جانب منسوب ہے) کے نام لکھے گئے۔ ان میں ذاتی، خاندانی حالات اور مشوروں کے ساتھ ساتھ بعض اہم دینی وملی مشورے بھی موجود ہیں۔ قادیانی تحریک کے استیصال کی جو مہم ہمارے نانا جان نے ضلع مونگیر وبھاگلپور میں چلائی تھی اس کے رہبر مولانا محمد علی مونگیری ہی تھے۔ ان خطوط میں ان تحریکات کی بعض جھلکیاں بھی موجود ہیں۔ ارادہ تھا کہ ان خطوط کو ایڈٹ کرکے محمد الحسنی مرحوم کی خدمت میں ارسال کردیتا تاکہ آپ کے

مشورہ سے ان کی اشاعت کا سامان کیا جاتا۔ اس کا ذکر میں اپنے سابق خط میں کر چکا ہوں۔ لیکن کیا خبر تھی کہ اس منصوبہ کی تکمیل سے قبل ہی سید محمد الحسنی رخصت ہو جائیں گے۔ اور سید مولانا محمد علی مونگیری، سید احمد شہید اور دیگر مجاہدین اسلام کی ارواح سے جا ملیں گے۔!

مثل ایوانِ سحر مرقد فروزاں ہو ترا
نور سے معمورۂ خاکی شبستاں ہو ترا
آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

یا ایتھا النفس المطمئنة ارجعی الی ربك راضية مرضية

سوگوار و غم گسار

سید حبیب الحق ندوی

ایمان....!

ایمان زندگی کی دعوت ہے بغیر تردد و شرمندگی و بے حیائی کے بغیر کسی معذرت و لکنت و اضطراب کے، بغیر کسی خوف و خطر کے وہ ایک صاف واضح اور بین دعوت ہے، اس میں نہ کوئی پیچیدگی ہے نہ ابہام و پوشیدگی،

(مولانا محمد الحسنی ندوی مرحوم)

زندہ دل صاحب ذوق

(مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی کے نام مکتوب)

محمد شبیر ندوی جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

۱۴ جون ۷۹ء کی صبح کو سانحۂ عظیم کی خبر سنی، اس کے ساتھ یہ بھی معلوم ہوا کہ آپ بمبئی سے ۲ بجے تشریف لا رہے ہیں لیکن ایسی جگہ پھنسا ہوا تھا کہ ۲ بجے پالم حاضر نہ ہو سکا پھر اسی دن نظام الدین میں آپ سے شام کو ملاقات ہوئی لیکن اُس وقت حال یہ تھا کہ دل میں جو کچھ تھا وہ لب پہ آسکتا نہیں، کا تقاضا پورا کرنا تھا ہم سب ایک دوسرے کو دزدیدہ نظروں سے دیکھتے تھے پھر اس اندیشے سے کہ دل کا حال کھل جائے نظروں کو ہٹا لیتے تھے۔

کچھ بھی سہی لیکن، ہے وہ درد پسندیدہ — چہرے سے نہ ظاہر ہو دلمیں ہو جو پوشیدہ

جب آپ لکھنؤ کے لیئے رخصت ہونے لگے تو پھر ایک مرتبہ دل امڈا۔ اتنے میں آپ روانہ ہو گئے اور جامعہ کے لیے نظام الدین کے بس اسٹینڈ کی طرف چل پڑا۔ دل میں خواہش تھی کہ کاش میں بھی اس وقت سفر میں ساتھ ہوتا، جن مجبوریوں کی وجہ سے اس وقت اس ارادے پر عمل نہ ہو سکا، انھیں مجبوریوں کی بناء پر جناب مشیر الحق اور محمد اجتبا ندوی کے ہمراہ نہ آسکا دیکھئے یہ مجبوری کس دن دور ہوتی ہے اور خدمت میں حاضر ہونے کا شرف حاصل ہوتا ہے۔

جب تعزیت کے نام سے خط لکھنے کا ارادہ کیا تو سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ آپ سے تعزیت کروں یا خود اپنی ذات سے۔ ایک مرتبہ کبھی ایسے موقع پر شاید آپ کا لکھا ہوا مضمون پڑھا تھا کہ غم اگرچہ مادی چیز نہیں ہے لیکن اس کی کیفیت اور کمیت ظاہر کرنے کے لیے تشبیہ کسی مادی چیز سے دی جاتی ہے، کبھی کہا جاتا ہے کہ غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا، کبھی کہا جاتا ہے کہ دل، غم والم کے بوجھ تلے دب کر رہ گیا۔ اگرچہ یہ بوجھ مادی نہیں ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ سب بوجھوں سے زیادہ وزنی ہے قضا و قدر کا مالک جو اس بوجھ کو ڈالتا ہے وہی اس کے برداشت کی طاقت بھی دیتا ہے ورنہ انسان کی کیا بساط کہ اسے اُٹھا سکے۔ حضرت مظہر جان جاناں کا یہ شعر

الٰہی دردِ غم کی سرزمیں کا حال کیا ہوتا　　محبت گر ہماری چشم تر سے مینہ نہ برساتی

یہ حقیقت ہے کہ غم کی شدّت آنسوؤں کی کثرت سے کم ہوتی ہے اور دل کا بوجھ اسی سے ہلکا ہوتا ہے ویسے تو آپ کا خاندان اہل اللہ کا خاندان ہے جسے اللہ تعالیٰ کی مشیّت پر پورا اعتقاد ہے جسے اللہ تعالیٰ نے صبر و ضبط اور استقامت کی دولت سے نوازا ہے، جو اس غم کا مداوا ہے ؎

امتحاں سخت سہی، پر دلِ مومن ہی وہ کیا　　جو ہر اک حال میں امید سے معمور نہیں

جب مرحوم پر نذرانۂ عقیدت پیش کرنے کا ارادہ کیا تو اندازہ ہوا کہ الفاظ ساتھ نہیں دے رہے ہیں پھر ذہن میں یہ شعر یاد آیا جس سے ہمّت بندھی ؎

فریاد کی کوئی لَے نہیں ہے　　نالہ پابندِ نَے نہیں ہے

محمد میاں کے ساتھ مرحوم کا لفظ شامل کرتے وقت دل لرز جاتا ہے۔ محمد میاں جن کے بارے میں تھا کہ اپنے دادا حضرت مولانا عبدالحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خوابوں کی تعبیر اور ان کے علم و فضل کا سجادہ نشین بنیں گے، محمد میاں جو اپنے والد بزرگوار محترم ڈاکٹر سید عبدالعلیؒ کے لختِ جگر اور ان کی شرم و حیا زہد و تقویٰ کے وارث تھے، محمد میاں اپنے پیارے چچا کے علم و فضل، امنگوں، حوصلوں، آرزوؤں و تمناؤں کے جانشین، ابوبکر حسنی کی نظروں کے سرور و ٹھنڈک، محمد ثانی، محمد رابع، محمد واضح کے ہم جلیس و ہم نشین اور سارے خاندان کے چشم و چراغ و اُجالا تھے، چلے گئے اور سچ پوچھئے تو اس گھر کا عاشق رسول مقبول صلعم چلا گیا ؎

دل ہے تو اُسی کا ہے جگر ہے تو اُسی کا　　اپنے کو رہِ عشق میں برباد جو کر دے

مجھے کسی نے سنایا تھا کہ آپ کے ساتھ ایک مرتبہ مدینہ منورہ سے کار میں مکہ مکرمہ کے لئے آرہے تھے جب مدینہ منورہ کے چھٹنے کا احساس ہوا تو بے قرار ہو کر رونے لگے اور سرکار کے دروازے سے ٹکرانے لگے۔ اس واقعہ سے ان کے عشق کا پتہ چلتا ہے کہ وہ کس درجہ کے عاشق تھے۔

محمد میاں اپنے قلم و ذہن سے حقائق کے کھولنے میں مصروف تھے اور ابھی ان کے قلم سے بہت سے حقائق کھلنے کی توقع و امید تھی جو اُن کے ساتھ جاتی رہی یہ نقصان قوم و ملّت کا نقصان ہے وہ زندہ رہتے تو عالمِ اسلام کے علم و فضل کا قطب بنتے۔ اس قطب سے قوم و ملّت خود محروم ہو گئی۔

میں جس زمانے میں ندوہ میں طالب علم تھا مجھے یاد نہیں کہ محمد میاں کی عمر کیا تھی یہ بھی یاد نہیں کہ

وہ اس زمانے میں ندوہ کے طالب علم بن چکے تھے یا نہیں؟ آپ کے تعلق سے ان سے تعارف ہوا، قربت اُس وقت ہوئی جب ندوہ کے ۸۵ سالہ جشن کی تیاری کے سلسلے میں ندوہ میں کثرت سے آنا جانا ہوا اور مختلف موقعوں پر ایک ساتھ اُٹھ بیٹھنے کا موقع ملا۔ عزّت و احترام کے ساتھ جس بے تکلفی سے پیش آتے تھے اس پر مجھے شرمندگی ہوتی تھی لیکن باوجود منع کرنے کے باز نہیں آتے تھے ۸۵ سالہ جشن منانے کے موقع پر انکی انتہائی آرزو ندوہ میں اچھے لان بنانے اور اچھے خوبصورت پیڑ پودوں کے لگانے کی تھی وہ چاہتے تھے کہ ندوہ خوبصورت پیڑوں، اچھے پودوں اور پھولوں سے سجا کر دولہن بنا دیا جائے، ہر ملاقات پر بس اسی کا تقاضا رہتا اور اس کی خواہش، فرماتے کہ جشن کی دوسری باتیں ہو کر کاغذ پر آجائیں گی۔ صرف یہی ایک ایسی یادگار ہوگی جو ہر وقت نظروں کے سامنے رہے گی۔ چنانچہ جب چمن بندی کا کام شروع ہوا تو ان کا دل دیکھ کر باغ باغ ہونے لگا۔ اس ضمن میں جتنا کچھ اُس وقت ہوا تھا اس سے خوش تو تھے لیکن مطمئن نہیں تھے اس لئے کہ ان کے تصور و خیال میں جس نوع کی چمن بندی تھی اس معیار تک نہ ہو پائی تھی، انھیں ماحول اور جگہ کی خوبصورتی، سجاوٹ و بناوٹ سے حد درجہ لگاؤ تھا، اِس سے ان کے ذوقِ جمال کی نشان دہی ہوتی ہے کہ وہ خشک نہیں بلکہ شرم و حیا کی چادر میں لپٹے ہوئے زندہ دل اور صاحبِ ذوق تھے۔ جشن کے بعد جس طرح سے جشن کی روئداد لکھ کر اُسے ہمیشہ کے لئے ایک دستاویز بنا دیا یہ ان کے ذوق و شوق کا کرشمہ ہے۔

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد
روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

محمد الحسنی کی رحلت ناگہانی پر

نشور واحدی

لختِ جگرِ بوالحسن از دارِ فنا رفت — گوئی کہ شبِ آخر شد و از ماہ ضیا رفت

اُو بود مبلّغ بہ صفِ بعثتِ اسلام — آں شمعِ ہُدیٰ بزمِ ہُدیٰ نجمِ ہُدیٰ رفت

در ہند کہ او نطق عرب فکرِ عرب داشت — محراب بہ شیون شد و منبر بہ قفا رفت

کس نیست کہ اسرارِ توکّل بہ شناسد — کاں سالکِ عرفاں کدۂ فقر و غنیٰ رفت

در فرقتِ او شبنمِ گل دیدۂ حیراں — مانندِ سحر آمد و مانندِ صبا رفت

در ماتم بے لفظ عروسانِ معانی — کز شہرِ حنا لکھنؤ آں رنگِ حنا رفت

صدق است و لے نیست صفائے بہ مزاجش — آں آئینہ جلوہ گہِ صدق و صفا رفت

خالی شدہ از زیر و بمِ شعر و تخیل — کاں نغمہ سرائے چمنِ صوت و صدا رفت

در رحلت ناگاہ ندا داد سروشے

راضی بہ رضا آمد و راضی بہ رضا رفت

محمد الحسنی ۔ سراپا جمال و کمال

مولانا محمد ثانی حسنی

وہ جگر گوشۂ اہل فضل و کمال — عندلیبِ چمن قوم کے نونہال

بازوئے بوالحسن جان عبد العلی — نازشِ خاندان اپنی بہنوں کے لال

میرے محبوب بھائی محمد میاں — جن پہ قرباں مرے جان و دل جاہ و مال

نکتہ رس، خوش طبع، بردبار و حلیم — خندہ رو، خندہ لب، نیک شیریں مقال

نیک خو، پاک رو، خوش دل و خوش نظر — خوش ادا، خوش نوا خوش خیال و خصال

صاحبِ خیر فیاض، مردِ خدا — شیوۂ خاص تھا ان کا اخفائے حال

صحبتِ بد سے تا مرگ محفوظ تھے — نیک لوگوں سے ان کا رہا اتصال

نازِ اہلِ قلم علم دین کے چراغ — اپنے اسلاف کی ایک زندہ مثال

مثلِ دادا کے اپنے تھے مرد غیور — بے حقیقت تھا ان کی نگاہوں میں مال

اپنے والد کے مانند تھے صلح کل — وہ تھے ناآشنائے جدال و قتال

وہ تھے اپنے چچا کے قدم بر قدم — ایک سا تھا خیال ایک سے تھے خصال

فکر بھی ایک تھی طرز بھی ایک تھا — ایک ہی تھا مزاج ایک ہی حال و قال

شہرہ ہر سو ہے ان کے مقالات کا — شرق ہو غرب ہو یا جنوب و شمال

وہ سوانح نگار محمد علی — جن کی عظمت کے قائل ہیں اہل کمال

جن کی تصنیف ہے "روئداد چمن" — جس میں ہے جشن ندوہ کا حسن و جمال

تذکرہ لکھ کے شاہ علم کا کیا — منکشف اہل ہمت مشائخ کا حال

ہے الاسلام یا الممتحن وہ کتاب — معترف جس کے ہیں اہل فضل و کمال

ہے کتاب ان کی طوفاں سے ساحل تلک — ترجمہ روڈ ٹو مکہ کا ہے بے مثال

اَلاِمَامُ الَّذِیْ لَمْ یُوفِ حَقَّہٗ — ترجمہ اس کا کر کے دکھایا کمال

نبی رحمت بھی ہے شاہکار قلم
جو کہ ہے مظہر عشق حضرت بلال

ایسے اہل قلم نوجواں اب کہاں
دور ہے آج کا دور قحط الرجال

وہ محمد میاں نیک دل نوجواں
عمر پائی جنھوں نے چوالیس سال

نو بجے دن ہوا ان کو دردِ شکم
دی گئی ہر دوا کی گئی دیکھ بھال

شام تک جب نہ کچھ بھی افاقہ ہوا
ہو کے مجبور پھر وہ گئے اسپتال

گم ہوئیں سب کی عقلیں قضا آگئی
نو بجے شب کو وہ کر گئے انتقال

جان دی کرتے کرتے قلم کا جہاد
اک طرف تیغ حق اک طرف حق کی ڈھال

ان کی تعمیر ملت میں گزری حیات
انتقال ان کا ملت کا ہے انتقال

اُن کا نقش قلم حق کی تلوار تھا
کانپتا تھا شکوہ کمال[1] و جمال[2]

اُن کے جانے سے غم کی فضا چھا گئی
ہو رہا ہے ہر اک ان کے غم سے نڈھال

وہ جواں سال تھے نیک اعمال تھے
قابل رشک تھا اُن کا ماضی و حال

اس جواں موت سے سب ہی غم ناک ہیں
کیا عرب کیا عجم ہیں اسیر ملال

ہے کہاں وہ گھر اور کس حال میں
دیدۂ تر کا دل سے یہی ہے سوال

دیکھ کر دیدۂ تر کی بے چینیاں
اس سے بولا دلِ صاحب کشف و حال

میں بتاؤں تمھیں ہے کہاں وہ گھر
کس مکاں میں مکیں ہے وہ گودڑ کا لال

روضہ شاہِ علم میں وہ مدفون ہے
ہو رہا ہے خلف کا سلف سے وصال

جمع ہیں آج جس مرکز نور میں
مہر و بدر و کواکب نجوم و ہلال

خوش ہوئے خوش سے خوش تر ہوئے کر کے حل
دو فرشتوں نے آکر کیے جو سوال

اُن سے رخصت ہوئے کہہ کے منکر نکیر
نَمْ كَنَوْمِ العروس اے حمیدہ خصال

روح سوئے جناں مست ہو کر چلی
بولا رضوان پھر یا حبیبی تعال

اُدخلی جنتی کی صدا گونج اٹھی
ہو گئے داخلِ خلد ہو کر نہال

اُن کو ایسی حسیں ایک جنت ملی
ہے تصور سے بالا تر اس کا جمال

جنۃٌ عالیہ، عیشۃٌ راضیہ
اور ان سے سوا نعمتیں بے مثال

[1] مصطفیٰ کمال اتاترک [2] جمال عبدالناصر

ہو مبارک تمھیں اے مری چشم تر
مغفرت ان کی کر دی گئی بال بال

تاج سر پر وہ رکھے ہوئے نور کا
چلتے پھرتے ہیں وہ کیف و مستی کی چال

سب کو جانا ہے دنیا سے اک دن ضرور
فکر ہے فکر در اصل فکر مآل

کھو نہ جانا کبھی عیش دنیا میں تم
لحظہ لحظہ رہے آخرت کا خیال

جانے والے سے ملنا ہے جس کو کبھی
کیوں ہو وہ جانے والے کے غم میں نڈھال

جس کو جنت کے ملنے کی امید ہے
قید دنیا میں رہنا ہے اس پر وبال

ہے دعا میری ہر دم یہ اللہ سے
بخشے سب کو رضا بالقضا کا کمال

اہلیہ کو عطا کر تو صبر جمیل
اپنی رحمت سے کر دور ان کا ملال

تیری مرضی پہ راضی رہیں تا حیات
ان کے بھائی عزیزان کے اہل و عیال

ان کے فرزند عبداللہ، عمار ہیں
تیسرے خورد سال ان کے بیٹے بلال

یہ بنیں اپنے والد کے نعم الخلف
علم دیں کا بنا ان کو بدر و ہلال

ہر قدم ہر نفس ان کا دل شاد ہو
زندگی بھر رہیں نعمتوں سے نہال

ان کی بہنوں کو یارب عطا کر سکوں
دور سے دور کر ان کا رنج و ملال

ان کے عم مکرم کو دے زندگی
عام سے عام کر ان کا فضل و کمال

ان سے پائیں ہدایت خواص و عوام
مستفید ان سے ہو حلقۂ حال و قال

بخش ان کو محمد کا نعم البدل
توڑ دے جو قلم سے طلسم ضلال

ان کے بھانجوں کو یارب تو توفیق دے
اپنے ماموں کے ہوں ہم قلم ہم خیال

رحمتیں کر محمد میاں پر مدام
تو رحیم و کریم اور ہے ذوالجلال

کر عطا ان کو یارب تو قرب و رضا
تو غفور و شکور اور ہے برّ و عال

بیادِ محمد الحسنی مرحوم

ڈاکٹر طفیل احمد مدنی

کٹے گی کیسے شبِ غم محمد الحسنی
تمہاری یاد ہے اور ہم محمد الحسنی

سُنی ہے جب سے یہ روداد غم معاذ اللہ
عجیب دل کا ہے عالم محمد الحسنی

یقین ہی نہیں آتا کہ تم نہیں موجود
ہے حیرتوں کا وہ عالم محمد الحسنی

دل فسردہ کو میرے کچھ ایسا لگتا ہے
ہے زلف دہر بھی برہم محمد الحسنی

مرے عزیز، مرے دوست کس زباں سے کہوں
تمہارے مرنے کا ہے غم محمد الحسنی

فضائے ندوہ و تکیہ بڑی اُداس سی ہے
بچھی ہے اک صفِ ماتم محمد الحسنی

وفورِ غم سے ہر اک آنکھ اہلِ ندوہ کی
تمہاری یاد میں ہے نم محمد الحسنی

تمہارے مرنے پہ اہل ادب ہیں افسردہ
کہ تم ادب کے تھے ضیغم محمد الحسنی

تمہارے واسطے جتنا بھی روئیں اہلِ قلم
یقین جانو کہ ہے کم محمد الحسنی

تمہارے دوست، اعزا و اقربا سب ہی
ہیں دل شکستہ و پُر غم محمد الحسنی

بھلا سکیں گے نہ تم کو کسی طرح برسوں
تمہارے مخلص و ہمدم محمد الحسنی

ابوالحسن بھی تمہارے لیے بہت روئے
تمہارے محرم و عم محمد الحسنی

کروں تو کیسے کروں ان سے تعزیت آخر
پڑا ہے ان پہ بڑا غم محمد الحسنی

الٰہی دے انہیں اس حادثہ پہ صبرِ جمیل
کہ ہے یہ زخم کا مرہم محمد الحسنی

شدید غم ہے مگر مرضیٔ الٰہی تھی
ہمارے سر ہیں یہاں خم محمد الحسنی

تمہاری قبر ہے نور سے سدا لبریز
اور اس کو تر کرے شبنم محمد الحسنی

طفیلِ احمدِ مرسل دعا ہے، ہو تم پر
نزولِ رحمتِ پیہم محمد الحسنی

بیادِ
مولانا محمد الحسنی مرحوم

(مجیب بستوی)

حقیقت ہے گدا کے بھیس میں اک شاہ تھے حسنی
یقیناً وقت کی گردش سے بے پرواہ تھے حسنی

ابھی تک محفل ارباب دانش میں یہ چرچا ہے
جہاں کے واسطے اب تک چراغِ راہ تھے حسنی

پیامِ زندگیٔ جاوداں دیتے تھے دُنیا کو
جہادِ زندگی میں آدمی کیا واہ تھے حسنی

تو ہی جانے کہ تیرے علم میں دنیا کی ہر شئی ہے
نہیں معلوم مجھ کو کیا مرے اللہ تھے حسنی

نکاتِ زندگی رازِ حیاتِ آدمیت بھی
رموزِ اشک ہائے غم حدیثِ آہ تھے حسنی

جو ملتا تھا اسے محسوس ہوتی تھی توانائی
سکونِ دل کی گویا ایک جلوہ گاہ تھے حسنی

جو تھے اہلِ نظر وہ دیکھتے تھے اے مجیب ان کو
یقیناً جگمگاتے ماہ سے تاکاہ تھے حسنی

تأثرات

مولانا محمد الحسنی مرحوم کی تعزیت میں آنے والے خطوط کے اقتباسات

مولانا سید محمد الحسنی مرحوم اپنے بلند پایہ، بصیرت افروز اور فکر انگیز عربی اردو مقالات اور تصنیفات کی وجہ سے ہندوستان ہی نہیں بلکہ عالم اسلامی میں مشہور تھے۔ ڈاکٹر سید عبد العلی مرحوم کے فرزند ارجمند اور مولانا سید ابو الحسن علی ندوی مدظلہ کے ساختہ پرداختہ، انکے نقش ثانی اور بہت سے کاموں میں انکے معاون ہونیکی وجہ سے مرحوم سے محبت وعقیدت رکھنے والوں کا حلقہ خاصا تھا۔ مختلف ممالک میں اسلام کی نشأۃ ثانیہ کے لئے سرگرم عمل لوگوں میں اکثر کے ساتھ ان کے ذاتی تعلقات تھے اور جن سے تعلقات نہیں تھے وہ ان کو اچھی طرح جانتے تھے اور ان سے بڑی امیدیں وابستہ کئے ہوئے تھے یہی وجہ ہے کہ اچانک انتقال کے المیہ کا اثر دور دور تک محسوس کیا گیا، متعدد اداروں میں تعزیتی قرار دادیں منظور کی گئیں، مساجد اور مدارس میں انکے لئے قرآن خوانی اور دعائیں ہوئیں۔ اخبارات ورسائل میں مضامین اور نوٹ لکھے گئے اور ہر طرف سے تاروں اور خطوط کا سلسلہ قائم ہوگیا، ہند وپاکستان کے علماء، دینی اور سیاسی رہنماؤں، ندوی برادری اور ندوہ سے تعلق رکھنے والوں اور حضرت مولانا سے تعلق رکھنے والوں نے اس حادثہ پر اپنے رنج وغم کا اظہار کیا۔ ہندوستان سے باہر کے بھی لوگوں کے خطوط اور تار موصول ہوئے۔ شیخ محمد علی الحرکان سکریٹری جنرل رابطہ عالم اسلامی مکہ، صفوت السقا یمنی نائب سکریٹری، کامل الشریف وزیر اوقاف اردن، عبد الرحمٰن البکر وزیر عدل وشئون اسلامیہ ابوظبی، ڈاکٹر احمد توتونجی سکریٹری ندوۃ الشباب، مولانا محمد شمیم ناظم مدرسہ صولتیہ مکہ، سکریٹری جمعیۃ الاصلاح الاجتماعی دبئی۔ اور دوسرے ممتاز حضرات نے بذریعہ تار وخط مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کی تعزیت کی اور مرحوم کے بارہ میں اپنے احساسات وخیالات کا اظہار کیا۔ اس طرح تاروں اور خطوط کی تعداد کئی سو ہے، ان میں سے چند خطوط کے اقتباسات یہاں دیے جارہے ہیں۔ تمام خطوط کو شامل اشاعت کرنا ممکن نہیں اور ان میں انتخاب بھی کوئی آسان کام نہیں۔ باقی ماندہ خطوط میں یقیناً بہت سے مختلف اعتبارات سے قابل ذکر وقابل اشاعت ہونگے۔ ہم ان تمام حضرات سے معذرت خواہ ہیں۔

یہاں دیئے گئے خطوط کے اقتباسات میں کسی خاص ترتیب کا خیال نہیں رکھا گیا ہے، بلکہ جو خط جس ترتیب

سے سامنے آگیا لے لیا گیا ہے۔ عالم عربی کے ممتاز افراد واہل قلم کے تأثرات پہلے دیے جارہے ہیں۔ عربی خطوط کا ترجمہ صدر الحسن ندوی کے قلم سے ہے۔ (مرتب)

"ISLAM IN THE WORLD" کے مصنف، مشرق کے بلند پایہ اہل قلم، امیر شکیب ارسلان کے رفیق ڈاکٹر زکی علی مصری حال مقیم سوئزرلینڈ نے مولانا محمد الحسنی مرحوم ۲۷ رجب ۹۹ھ (۲۲ جون ۷۹ء) کو ایک خط لکھا۔ اس وقت مولانا کی وفات کو ایک ہفتہ ہوچکا تھا لیکن ڈاکٹر زکی صاحب کو اطلاع نہیں ملی تھی، وہ اپنے مکتوب میں مرحوم کو ان الفاظ سے خطاب کرتے ہیں:۔

"برادر محترم! مومن ومخلص انشاء پرداز، گفتار وکردار کے مجاہد، بیمثال مصنف، سلیم الفکر مفکر، ٹھوس اور معقول رائے کے حامل، جذبات واحساسات اور عزائم کو بیدار کرنے والے اسلوب کے مالک جناب محمد الحسنی صاحب ایڈیٹر "البعث الاسلامی"۔

وفات کی اطلاع ملنے کے بعد انہوں نے مرحوم کے برادر محترم مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی ایڈیٹر "الرائد" کے نام ایک تعزیتی خط بھیجا۔ ذیل میں اس کا اردو ترجمہ پیش کیا جاتا ہے:۔

"۲۰ رجب ۹۹ھ (۱۶ جون ۷۹ء) کے "الرائد" سے جو مجھے آج ہی ملا ہے آپ کے برادر عزیز جناب محمد الحسنی صاحب کی وفات کی اطلاع ملی، اس سانحہ کا مجھ پر کیا اثر ہوا اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے، اف! کتنا عظیم سانحہ ہے، کیسی جانکاہ مصیبت ہے!! عالم اسلام کے لئے کتنا زبردست خسارہ ہے۔ اس بے مثال انشاء پرداز، مخلص داعی، باشعور مفکر، امانت دار صحافی، عظیم مجاہد اور عبقری مصنف کی وفات نے ندوۃ العلماء اور "الرائد" "البعث الاسلامی" کی برادری کو کتنا متاثر کیا ہے، افسوس! عالم اسلام ان کے وجود سے محروم ہوگیا، حالاں کہ اس وقت مسلمانانِ عالم کو ان جیسی عبقری شخصیتوں کی شدید ضرورت ہے۔ آہ! نئی نسل ان کے فکر وتدبر اور دانش وحکمت کے ثمرات سے محروم ہوگئی، اسلامی دنیا کے آسمان پر وہ ایک درخشندہ ستارہ بن کر ابھرے جو عین عروج کے وقت غروب ہوگیا۔ مشیت خداوندی میں کسی کو کیا دخل۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مرحوم کے عم محترم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے نام عرب کے مشہور اہلِ قلم، عالم وادیب، متعدد بوں کے مصنف، جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے استاذ شیخ محمد مجذوب کا تعزیت نامہ۔

"میں جناب کی خدمت میں یہ سطور سپردِ قلم کر رہا ہوں اور دل غم سے گھٹا جا رہا ہے۔ آنکھوں میں آنسو ہیں اور ذہن میں یہ پریشان کُن سوال کہ ہم آپ کی تعزیت وغم خواری کر رہے ہیں یا خود اپنی۔ یہ سانحہ تنہا آپ کا نہیں بلکہ اس میں عالم اسلام کے وہ سارے افراد شریک ہیں جو ان کے قلم گہربار سے فیضیاب ہوتے رہے ہیں۔

اس وقت ہم فتنہ وفساد اور ابتلا، وآزمائش کے دور سے گذر رہے ہیں، اس پرآشوب ماحول میں ہمیں ایسے تازہ دم لشکر کی ضرورت ہے جو عفت وپاکیزگی اور حریت وآزادی میں یکتا وبے مثال ہو۔"

ذیل میں ایک عراقی نژاد عظیم داعی کے مضمون کا اقتباس پیش کیا جاتا ہے۔ انہوں نے مشرق وسطیٰ میں دعوت خ کے میدان میں اہم خدمات انجام دی ہیں، ان کے افکار وخیالات پر اسلامیت کی گہری چھاپ ہے — وہ دستان اور یہاں کی اہم شخصیات سے اچھی طرح واقف ہیں۔ یہ مضمون ریاض کے مشہور مجلہ "الدعوۃ" میں شائع ہے۔

"مجلہ "البعث الاسلامی" وہ مشعل راہ، حق کی گونجتی ہوئی صدا اور سرچشمۂ صافی ہے جس نے اسلامی عربی فکر کو اس وقت بالیدگی عطا کی جب اسلامی اور عربی ممالک میں مسلم نوجوانوں کی رہنمائی کے سارے چشمے خشک ہو گئے تھے، اس کی دعوتی سرگرمیوں کا آغاز موجودہ صدی کی چھٹی دہائیوں کے نصف میں ہوا۔ وہ اول روز سے اب تک حق گوئی وفکر صالح کا دریا بہا رہا ہے اور ہندستان کے اسلامی فکر کے نتائج اہل عرب تک پہنچا رہا ہے۔ اس کے روح رواں، یگانۂ روزگار نوجوان، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے برادر زادہ مولانا محمد الحسنی مرحوم تھے، یہی وہ رسالہ ہے جس نے خاص مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی نگرانی میں زمانہ کے سرکش وطاغوتی رجحانات کو چیلنج کیا، خصوصاً وہ مصر کے طاغوت کو برابر چیلنج کرتا رہا اور اس سے

کبھی مصالحت نہیں کی بلکہ اس کے غلط افکار ونظریات کا پردہ فاش کیا اور ان کی منافقت کو آشکارا کرتا رہا۔

مرکز "الدعوۃ الاسلامیۃ"، شارقہ کے ناظم اعلیٰ شیخ عبداللہ بن علی المحمود کا مکتوب حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے نام۔

"برادر محترم! آپ کے لختِ جگر مولانا محمد الحسنی ندوی کی خبر وفات انتہائی غم واندوہ کا پیام لائی، مرحوم بیس سال سے زیادہ مدت سے اسلامی صحافت کے امتیازی شان کے ساتھ ابھرے تھے اور دعوت اسلامی کی نشرواشاعت اور اعلائے کلمۃ اللہ کے میدان میں بے باک مجاہد کی حیثیت سے دعوت کا فریضہ انجام دے رہے تھے، انہوں نے ہمیشہ اور ہر جگہ مسلمانوں کے حقوق کی مدافعت کی اور ان کے اندر اتحاد واتفاق پیدا کرنے کے لئے تمام باطل طاقتوں کا کھل کر مقابلہ کیا، وہ مسلمانوں کو کفر والحاد، صیہونیت اور مغربی استعمار کے خطرات سے مقابلہ کی دعوت دیتے رہے۔"

جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے استاذ شیخ محمد السید الوکیل کا خط:۔

"برادر عزیز محمد الحسنی ندوی کی وفات کی خبر بڑے رنج والم اور حسرت ویاس کا باعث بنی، اللہ تعالیٰ ان کو غریق رحمت کرے اور جنت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔

اس خبر سے ہمارے دل غم میں ڈوب گئے، ہم امن وسکون اور راحت ومسرت سب بھول گئے۔ ان کی وفات نے باجبر اور عدیم المثال اسلامی صحافت میں ایک عظیم خلا پیدا کر دیا ہے۔ ان کا طاقتور اور بے باک قلم اپنے ان بھائیوں کے احساسات وجذبات کا ترجمان تھا جو بے وزن سیاست کی تاریک فضا اور قید خانہ کی اندھیری کوٹھریوں میں مقید ہونے کی وجہ سے اپنے ضمیر کی آواز دوسروں تک نہیں پہنچا سکتے تھے۔ یہی وہ وزن تھا جس سے وہ ضمیر کی گہرائیوں میں کھوئی ہوئی حریت وآزادی کی خوشبو محسوس کرتے تھے۔ ان کے گرانقدر اور موثر مضامین نے مسلمانوں کی روحانی اقدار کو فروغ دیا اور باطل پرستوں کی لن ترانیوں

کا پردہ چاک کیا اور فریب خوردہ مسلمانوں کی آنکھوں پر سے پردے اٹھا دئے۔

مرحوم کی وفات سے صرف صحافت ہی کے میدان میں نہیں خلا پیدا ہوا ہے بلکہ ہم تعلیم و تربیت کے میدان کے ایک ماہر استاذ، کریم النفس مربی اور شفیق مصلح کے وجود سے محروم ہو گئے۔ اللہ کا فضل ہے کہ انہوں نے ایک باشعور دبستان فکر اور ایسے صالح و وفادار شاگرد چھوڑے ہیں جو انشاء اللہ ان کے نقش قدم پر چل کر ان کے اسلوب کو اپنائیں گے۔

عربی رسائل و اخبارات نے بھی مولانا محمد الحسنی مرحوم کی وفات پر مؤثر ڈھنگ میں حالات اور احساسات پیش کئے۔ اسلامی پرچوں نے عام طور پر مولانا مرحوم کے بے باک و جرأت مندانہ اسلامی قلم کو سراہا، ان میں سے قاہرہ اور ریاض کے الدعوۃ، کویت کے المجتمع، البلاغ، مکہ مکرمہ کے ہفتہ وار اخبار العالم الاسلامی اور روزنامہ الندوہ، مصر کے الاعتصام کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ابھی اخبارات سے اطلاع ملی کہ جناب محترم کے ابن الأخ مولانا محمد الحسنی کا اچانک انتقال ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ جسے عم الرجل أبیہ فرمایا گیا ہے، اس کے مطابق حقیقتاً ابن الاخ ابن ہی ہوتا ہے۔ جناب کو جس قدر بھی صدمہ ہو کم ہے، ہم سب اس غم میں شریک ہیں۔ مرحوم ایک بہترین صاحب قلم اور ذی استعداد عالم تھے اور البعث الاسلامی کے نہایت کامیاب اور باصلاحیت مدیر تھے۔ حق تعالیٰ شانہٗ انہیں اپنے جوار رحمت میں قبول فرمائے۔

(مولانا) محمد طیب

دیوبند

برادر زادۂ محترم کے سانحۂ ارتحال کی المناک خبر معلوم ہو کر طبیعت پر انتہائی اثر طاری رہا۔ صبح جناب مولانا عمران خانصاحب سے تفصیل معلوم ہو کر مزید حسرت و غم کے اضافہ کا باعث ہوا۔

ان العین تدمع و القلب یحزن ولا نقول الا ما یرضی بہ

ربنا۔ حضرت والا کو کیا تعزیت پیش کی جائے، یہ سانحہ تو تمام اہل علم و ادب کے لئے وجہ تعزیت ہے۔ ان فی اللہ عزاء من کل مصیبۃ وخلفا من کل فائت۔ ارحم الراحمین روح طیبہ پر اپنے رضوان اور رحمتوں کی بارش فرمائے اور ہم سب کو تسلیم و صبر کی توفیق دے۔

محمد سعید مجددی غفرلہٗ

خانقاہ شریف مجددیہ بھوپال

کل یہ افسوسناک اطلاع ملی کہ عزیزم مولانا محمد الحسنیؒ ہم سب کو داغ مفارقت دے گئے۔ خبر سنکر مجھ پر ایک سکتہ کا عالم طاری ہو گیا، اور ایسی سخت چوٹ دل پر لگی کہ دیر تک افاقہ نہ ہو سکا۔ افسوس ہے کہ جنھیں کل تک سلمہ اللہ لکھتے تھے آج انھیں رحمہ اللہ لکھ رہے ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

صدمہ دہرا ہے، ایک تو اپنے ذاتی تعلق کی وجہ سے، دوسرے اس لئے کہ اس قحط الرجال کے دور میں قوم ایک سلیم الفکر، مخلص، ذہین اور صالح خادم دناصر دین سے محروم ہو گئی۔ زور قلم رکھنے والے تو بہت ہیں، مگر مولانا محمد الحسنی مرحوم کے زور قلم کا منبع نور ایمان تھا۔ ایسا زور قلم رکھنے والے جس کی قوت، ایمان و یقین کی قوت کی رہین منت ہو احمر کی طرح النادر کالمعدوم ہیں۔

اللہ تعالیٰ اس جوان صالح پر اپنی رحمتوں کی بارش فرمائیں۔ اور کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائیں۔

(مولانا) محمد اسحٰق سندیلوی ندوی

کراچی

یہاں پاکستان کے اخبارات کے ذریعے یہ المناک خبر معلوم کر کے انتہائی

صدمہ ہوا کہ آپ کے فاضل بھتیجے اور "البعث الاسلامی" کے ایڈیٹر عزیزی محمد الحسنی ندوی کا انتقال ہوگیا ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ یقین کیجئے کہ مرحوم سے واقف جس شخص نے بھی یہ خبر سنی سناٹے میں آگیا۔ مرحوم کا قلم اسلام کی ترویج واشاعت کے لئے وقف تھا اور ان کی دینی وعلمی خدمات محتاج بیان نہیں۔ یہ حادثہ فاجعہ آپ اور آپ کے خاندان کے لئے ہی نہیں بلکہ دین کا کام کرنے والے تمام لوگوں کے لئے رنج و الم کا باعث ہے۔

طفیل محمد
امیر جماعت اسلامی پاکستان

ابھی ابھی محمد بھائی نے فون پر حادثہ جانکاہ کی خبر سنائی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ کیا بتاؤں اس خبر کو کس طرح سنا۔ محمد میاں جیسا جوان صالح ولائق دنیا سے اٹھ گیا اور ہمارے ایسے بیکار جی رہے ہیں۔ حادثہ ہمارے لئے سخت ہے تو آپ کا کیا حال ہوگا۔ اللہ پاک صبر جمیل عطا فرمائے اور جواں مرگ محمد میاں کی بال بال مغفرت فرمائے اور اپنے اکرام واعزاز سے انہیں نوازے۔ اسلامی فوج کے ایک باہمت صاحب قلم سپاہی تھے۔ ان کا اداریہ البعث میں پڑھ کر روح تازہ ہوجاتی تھی۔ ان کے قلم کی ہر چیز پڑھنے کا اہتمام کرتا تھا اور مردہ رگوں میں خون دوڑنے لگتا تھا۔

(مولانا) محمد عمران خاں ندوی
بھوپال

بلاشبہ یہ حادثہ بڑا جانکاہ ہے اور نہ صرف آنمحترم اور متعلقین اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کے لئے ہی بلکہ پوری امت اسلامیہ کے لئے۔ اس حادثۂ فاجعہ کا میرے قلب ودماغ پر جو اثر ہوا ہے اسکے بیان کرنے سے قاصر ہوں بس بارگاہ الٰہی میں یہی دعا ہے کہ وہ مرحوم کی بال بال مغفرت فرمائے۔

عبید اللہ رحمانی۔ اعظم گڑھ

"میرے پاس الفاظ نہیں ہیں جن کے ذریعہ سے مرحوم کے غیر معمولی کمالات اور خصوصیات کا بیان ہو سکے۔ وہ صحیح معنوں میں آپ کے جانشین تھے۔

مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی
صدر آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت

میں ان کے علم، عمل اور سلامتی طبع کا ہمیشہ معترف رہا۔ . . . مرحوم کا سانحۂ وفات علم و ادب اور دینی واسلامی ثقافت کی دنیا کا ایک عظیم حادثہ ہے اس لئے تنہا آپ سوگوار نہیں بلکہ ایک عالم آپ کے ساتھ سوگوار ہے۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادی

وہ ہر اعتبار سے خاندانی روایات کے ترجمان تھے اور ان کے کریمانہ اخلاق، حلم ووقار کے ساتھ ان کی دینی خدمات نوجوان اہل علم کے لئے مشعل راہ ہیں۔

قاضی اطہر مبارکپوری

ڈاکٹر صاحب مرحوم کی ہر لحاظ سے ایک ممتاز یادگار جسے آپ کی خاص توجہ اور محبت نے بین الاقوامی شہرت سے نوازا تھا اب اس دنیا میں نہیں رہی اور ایک ایسی جگہ خالی ہوگئی جو آسانی سے بھری نہ جاسکے گی، کیسا بھرا ہوا گھر خالی ہوگیا۔

ڈاکٹر ضیاء الدین فاروقی
جامعہ ملیہ دہلی

"واقعہ یہ ہے کہ آپ کے خانوادہ سے ذاتی طور پر مجھے مرحوم ومغفور ڈاکٹر سید عبد العلی صاحب کی شفقتوں کے ذریعہ ہی تعلق خاطر پیدا ہوا تھا۔ مرحوم محمد میاں کی زیارت جب کبھی ہوتی تو ڈاکٹر صاحب مرحوم اپنی تمام شفقتوں اور عنایتوں کے ساتھ یاد آجاتے۔ محمد میاں مرحوم بھی اس ربط کو کماحقہ محسوس کرتے تھے۔"

مولانا محمد رضا انصاری
فرنگی محل لکھنؤ

"سب عزیزوں کے ساتھ اس اندوہناک حادثے پر مجھے دلی ہمدردی ہے اور مرحوم کے لئے رحمت و مغفرت کی تہہ دل سے دعا ہے۔

(مولانا) حبیب الرحمٰن خاں شیروانی

علی گڑھ

مرحوم کی رحلت بلاشبہ عالم عربی اور عالم اسلامی کے لئے ایک عظیم اور ناقابل تلافی صدمہ ہے۔

مفتی محمد مکرم احمد

شاہی امام مسجد فتح پوری دہلی

زندگی اور موت کا مالک تو کوئی اور ہی ہے، ہم لوگ افسوس کے علاوہ اور کر بھی کیا سکتے ہیں خدا سے دعا ہے کہ مرحوم کو فردوس بریں میں جگہ دے۔

ہیم وتی نندن بہوگنا

وزیر پٹرولیم و کیمیکلز ـــــ دہلی

"پچھلے سفر میں دوران قیام لکھنؤ ان سے وعدہ لیا تھا کہ آئندہ سفر انگلستان میں وہ آپ کے ہم سفر ہوں گے لیکن وہ وعدہ بقول شخصے "وہ وعدہ ہی کیا جو پورا ہو جائے" کے مصداق ہو گیا۔ . . . ہم تو اس منحنی جسم لیکن بیدار مغز شخصیت سے بڑی امیدیں باندھے بیٹھے تھے۔ آہ! ساری امیدوں پر اوس پڑ گئی۔"

مسرور حسین ـ لندن

"میں نے فقید عزیز کے نام خط میں اپنے دستخط کے نیچے "الطالب بجامعۃ البعث الاسلامی" لکھا تھا اپنے جواب میں انہوں نے لکھا کہ اس تحریر سے خیال کی رو چلی جس سے متاثر ہو کر انہوں نے کوئی مقالہ سپرد قلم کیا۔

مولانا احمد حسنی

لاہور۔ پاکستان

"مرحوم سے آخری ملاقات پاکستان میں ایشیائی اسلامک کانفرنس کے موقع پر ہوئی تھی ان کے حسن اخلاق اور خداداد صلاحیت کی یاد ہمیشہ رہا کرتی ہے۔"

ڈاکٹر عبدالحفیظ سلفی

دربھنگہ ۔ بہار

"ڈاکٹر عبدالعلی مرحوم نے جو نقش تاباں ورثہ میں چھوڑا تھا افسوس کہ آج قضا نے اسے مٹا دیا۔ جس چمن کو حضرت مولانا علی میاں نے اپنے خون جگر سے سینچ کر شاداب بنایا تھا، صد حیف کہ نذر خزاں ہو گیا، ندوہ کی ایک زبان خاموش ہو گئی جس سے وہ عالم عرب کے ساتھ بے تکلف گویا ہوتا تھا۔"

مولانا سید عبدالکبیر۔ دارالسلام عمر آباد

". . . . رحلت اسلامیان ہند کا خصوصی اور کل ملت کا عمومی سانحہ ہے . . . . ابھی جو سعودی عرب کو جھنجھوڑا تھا وہ ان کی غیرت ایمانی اور سوز ملی کی یادگار رہے گی۔"

غلام محمد۔ کراچی

"مرحوم سے نیاز تو گذشتہ سال حاصل ہوا لیکن اس سے قبل سالہا سال سے میں ان کی تحریریں رشک و حسرت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ پڑھتا تھا۔"

مولانا محمد تقی عثمانی

دارالعلوم۔ کراچی

. . . . ہم جیسوں کے لئے بھی یہ حادثہ سخت ہے اس کے علاوہ ندوہ اور اس سے متعلق علمی کارروائیوں کے لئے ناقابل تلافی نقصان ہے۔"

سید سلمان ندوی

ڈربن جنوبی افریقہ

"مرحوم اتنی کم عمر میں اپنی خداداد عظیم صلاحیتوں کی بنا پر بہت سے اچھے لکھنے والوں میں فوقیت لے گئے تھے اگر وہ رہے رہتے تو آپ کے صحیح جانشین ہوتے۔"

جناب حافظ کاصاحب سفیر ہند۔ جدہ

"مرحوم کے فطری ملکات اور کسبی کمالات کے پیش نظر بہت سی توقعات تھیں کہ حق تعالیٰ شانہٗ دینی خدمات کا جو کام قریباً گذشتہ دو صدی سے لے رہے ہیں مرحوم اپنے اسلاف کی اس وراثت کو سنبھال لیں گے کسبی نسبت کے اسرار وہی حکیم مطلق جانتے ہیں۔"

مولانا محمد یوسف لدھیانوی

کراچی

"مولانا کی وفات سے خالص دینی اسلامی صحافت کا ایک عظیم خسارہ ہوا۔ اللہ تعالیٰ ہی ان کی جگہ کو پُر فرمائے۔"

مولانا محمد یونس۔ مظاہر العلوم سہارنپور

"اس کم عمری میں اتنی غیر معمولی ذہانت اور قابلیت کے حامل تھے لیکن خدا کو منظور نہیں تھا کہ وہ دنیا میں رہ کر اور خدمت کرتے اور اس نے اپنے پاس بلالیا۔"

محمد شفیع۔ پرووائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

"اس خبر کو پڑھ کر دل پر ایک گھونسا سا لگا اور کچھ دیر تک یہ ماننے کو جی نہ چاہا کہ ان جیسا ہونہار عالم ہمیشہ کے لئے اپنے خاندان ہی نہیں بلکہ پوری اسلام پسند دنیا سے یوں جُدا ہو جائے گا۔"

مولانا عرشی۔ رضا لائبریری رامپور

"ان کے اسلوب نگارش، انداز بیان، تحلیل و تجزیہ کو دیکھ کر خیال ہوتا تھا کہ ابھی بہت دنوں تک زمام عربی ادب و لغت ہمارے ہاتھوں سے شاید نہ جاسکے گی۔ اگر "اپنے صحرا میں ابھی آہو بہت پوشیدہ ہیں"، مگر اس غزال رعنا کے ہاتھ سے نکل جانے پر آنکھیں بے اختیار اشکبار ہیں اور نہ معلوم کب تک "البعث" کے صفحات پر ان کے رشحات نہ پاکر آنکھیں اشکبار رہیں گی۔"

عبدالحلیم ندوی۔ حیدر آباد

"میرا تاثر یہ ہے کہ اس سانحہ کے اثرات کا دائرہ بہت وسیع ہے اور اس ایک

ہفتہ میں یہ مشاہدہ بھی ہوا کہ دعاؤں کا تسلسل وسیع سے وسیع تر ہو رہا ہے، درانحالیکہ ہنوز کسی جریدہ میں خبر شائع ہو کر حرمین میں نہیں پہونچی ہے میں اسے اپنے جذبات کے لحاظ سے "ویوضع لہ القبول" کا مظہر سمجھتا ہوں۔"

حکیم عبدالرحیم اشرف۔ مکتوب از جدہ

"مجھ کو ان کی جواں مرگی کا سخت صدمہ ہے، اب کی بار جس محبت سے وہ جلد از جلد لکھنؤ آنے کا تقاضا اور خود نہ آنے کی معذرت کر رہے تھے وہ منظر ہر وقت آنکھوں کے سامنے رہتا ہے۔"

مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی

"ایک طرف ان کی خاموش طبیعت اور نہایت سادہ مزاج، دوسری طرف ان کی علمی قابلیت اور اتنا عبور دیکھ کر دل متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا تھا، ان کا عربی رسالہ "البعث" پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی پیدائشی عربی داں لکھ رہا ہے، ان کی دینی و سیاسی تحریروں سے پتہ نہیں کتنے لوگ مستفید ہوتے ہوں گے۔

عبدالرحمٰن نورولی مکہ مکرمہ

"وہ ندوہ کے لئے اور ساری ملت کے لئے سرمایۂ افتخار تھے۔ آئندہ نہ معلوم کس کس انداز سے وہ دین و ملت کی خدمت انجام دیتے۔ اس نوعمری میں آسمان صحافت کے درخشاں ستارے کا ٹوٹ جانا آپ ہی کے لئے نہیں ہم سب لوگوں کے لئے ایک عظیم حادثہ ہے۔"

مولانا نظام الدین۔ جامعۃ الفلاح۔ اعظم گڈھ

"مرحوم میں جو خصوصیات تھیں اور امت کے لئے جو درد تھا، قلم میں جو تاثیر تھی بلاشبہ ان کی جواں مرگی آپ کے خاندان کے لئے ہی نہیں، اس قحط الرجال کے زمانہ میں امت اسلامیہ کے لئے بڑا حادثہ ہے۔"

مولانا مجاہد الاسلام قاسمی

قاضی شریعت۔ امارت شرعیہ۔ بہار

"ہماری جماعت کا گوہر شب چراغ گم ہوگیا، ان کا بانکمال افراد کی صف میں ایک دردناک اضافہ ہوا جن کی عمریں کم تھیں۔ امام سیوطی، مولانا عبدالحی فرنگی محلی، مولانا عبدالرحمٰن نگرامی، مولانا مسعود عالم ندوی، مولانا محمد یوسف، مگر ان میں سے کسی بات کو بھی سوچ کر دل کو تسکین نہیں ہو رہی ہے.... آپ سے کیا عرض کروں جب اپنا یہ حال ہے، بقول ابوفراس کے ؎

انی أجدك أن تكفى بتعزية
عن خير مفتقد يا خير مفتقد

ڈاکٹر مولانا عبداللہ عباس ندوی
کنگ عبدالعزیز یونیورسٹی۔ مکہ مکرمہ

"انہوں نے عربی زبان وادب پر جو قدرت حاصل کی اور ان کے قلم سے عربی میں جو بلند پایہ کتابیں اور بیش قدر مضامین نکلے ان سے نہ صرف ہندوستان بلکہ بیرون ہند کے ممتاز عربی مصنفین میں ان کا شمار ہوا۔ ان کی اردو تحریریں بھی سلاست زبان کے ساتھ اعلیٰ علمی وتحقیقی معیار متعین کرتی ہیں۔"

ظل الرحمٰن ندوی
اجمل خاں طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

"محمد میاں آپ کی علمی، دینی، ادبی اور فکری شخصیت کا عکس جمیل تھے، ان کی وفات تمام عالم اسلام کے لئے ایک زبردست سانحہ ہے۔

ایں ماتم سخت است کہ گویند جواں مرد

ابوالمجاہد زاہد
درسگاہ جماعت اسلامی رامپور

"مرحوم کی ذات ملی اور علمی امیدوں کا مرکز تھی.... توقع تھی کہ آپ کے خاندان کی علمی اور دینی روایات انکے ذریعہ اور زیادہ مضبوط ہونگی، مشیت کے معاملات میں انسان کتنا مجبور ہے۔"

پروفیسر خلیق احمد نظامی۔ شعبۂ تاریخ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

"ان کے لئے تو یہی خیال ہوا کرتا تھا کہ یہ اپنے دادا صاحب، والد صاحب اور چچا جان کی جانشینی کریں گے۔ مگر.....!"

مولانا افتخار فریدی۔ مراد آباد

"یہ پورے حلقۂ ندوہ اور ملت اسلامیہ کا حادثہ ہے۔ محمد الحسنی اس خانوادہ کے فرد تھے جو کئی صدیوں سے اس ملک میں دین وملت کی اصلاح وتجدید کا کام کر رہے تھے، شاید اس مصرعہ کا مصداق اس خاندان سے زیادہ کوئی نہیں ؎

ایں خانہ ہمہ آفتاب است

مولانا مجیب اللہ ندوی۔ جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ

"موصوف کی عظیم تر علمی اور قلمی صلاحیتیں عرب وعجم کو اپنا معترف بنا چکی تھیں... یقین تھا کہ خانوادہ عامرہ کی مثالی خدمات سے دیر تک ملت کو مستفید ہونے کا موقعہ ملیگا لیکن مشیت ربانی میں مجال دم زدن نہیں ہے۔"

مولانا محمد سالم صاحب۔ دارالعلوم دیوبند

"عزیز گرامی قدر ابھی غنچۂ نوشگفتۂ چمن علم وعمل ہی تھے مگر ان کی شمائل وفضائل کی عطر بیزی سے عرب وعجم کے ارباب علم وفضل محظوظ ہو رہے تھے.... جناب والا کے تو وہ قوت بازو اور قرۃ العین تھے ہی، مگر ملت کے بھی وہ آپ کے متوقع جانشین کی حیثیت سے مرجع آمال تھے مگر مرضی مولیٰ از ہمہ اولیٰ۔"

قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی

"یہ ایک ایسا سانحہ ہے جس کو علمی وتحقیقی حلقوں میں مدتوں غم والم کے ساتھ یاد رکھا جائے گا اور قلب ودماغ مدتوں اس کو فراموش نہ کریں گے۔"

مولانا نسیم احمد فریدی۔ امروہہ

"موجودہ دور میں جب کہ اسلامی صحافت غیر اسلامی ادب وصحافت سے فیصلہ کن جنگ کر رہی ہے اور دنیا کے مسلم نوجوان ملحدانہ افکار وخیالات سے اکتا کر اسلام کے سایہ

میں تیزی سے آرہے ہیں امت مسلمہ کو موصوف کے زبان و قلم کی بہت ضرورت تھی۔"

مولانا محمد باقر حسین، مولانا معاذ الاسلام و دیگر اساتذہ

مدرسہ امدادیہ مراد آباد۔ یوپی

"ایسا حادثہ جس پر مہینوں کے بعد بھی شاید صبر نہ آئے نوجوان صالح، اسلامی فکر و عمل کا پیکر، رواں دواں قلم کا مالک، مجاہد خاندان کا چشم و چراغ، امت کا ہونہار فرزند جس کے قلم نے بہت کم دنوں میں بڑی اہم خدمات انجام دیں۔"

مولانا ظفر الدین صدیقی۔ دار الافتاء۔ دار العلوم دیوبند

"اپنے حلقہ میں یہ بات پوری قوت سے کہتا تھا کہ حضرت مولانا علی میاں کے جانشین مولانا محمد الحسنی ہوں گے۔ قضائے الٰہی کے آگے کسی کی کیا مجال۔ ہم خدام نہ صرف آپکے شریک غم ہیں بلکہ مستحق تعزیت ہیں۔"

مولانا احمد علی قاسمی۔ مسلم مجلس مشاورت دہلی

"ڈاکٹر عبد العلی صاحب مرحوم اور جناب سے خصوصی تعلق کی بنا پر میں اس کو اپنا ذاتی نقصان تصور کرتا ہوں۔"

مولانا رشید الدین مدرسہ شاہی مراد آباد یوپی

"مرحوم کے انتقال سے جو علمی خلا پیدا ہو گیا ہے اس کا پُر ہونا دشوار ہے۔"

محمد اقبال انصاری ندوی۔ علی گڑھ

"ایسے صالح با علم و عمل غیر معمولی صلاحیتیں رکھنے والے نوجوان انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں کسی ایک کا اٹھ جانا بھی مستقبل کی کمر توڑ دینا ہے۔"

حکیم شکیل احمد شمسی۔ لکھنؤ

"مرحوم کی عمر، صلاحیتوں اور خدمات کے پیش نظر یہ سانحہ ہم سب کے لئے زبردست خسارہ ہے۔"

مرزا عبد الستار بیگ

سکریٹری آل انڈیا خلافت کمیٹی بمبئی

"ایسے متبحر جوان العمر عالم کی اچانک موت سے ہم سب کو جو دھچکا پہنچا ہے وہ تو ایک انفرادی معاملہ ہے لیکن ملت کو جو نقصان پہونچا ہے اس کی تلافی مشکل ہی سے ہو گی۔"

ظفر احمد صدیقی ایڈوکیٹ۔ دینی تعلیمی کونسل لکھنؤ

"کتنا عظیم ملی خسارہ ہے، اور آپ کے لئے اور آپ کے تمام متوسلین کے لئے کتنا عظیم حادثہ۔ اور کچھ لکھنے کی ہمت نہیں۔"

قاضی محمد عدیل عباسی۔ بستی

"انسان بڑی محنتوں اور مشکلوں سے کسی قابل بنتا ہے پھر ایک دم اس کی جدائی کس قدر شاق ہوتی ہے۔۔۔۔ مرحوم کیا تھے، ملت کی توقعات ان سے کیا وابستہ تھیں، آپ کو کس قدر لگاؤ تھا اور نہ معلوم کیا کیا باتیں بے چین کئے ہوئے ہیں۔"

مولانا محمد تقی امینی۔ سنی دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

"۔۔۔۔ سچ یہ ہے کہ رونے کو جی چاہتا ہے مگر یہاں کون ہے کس سے مل کر روؤں، یہ کیسا حادثہ ہو گیا اللہ ہی اپنی مصلحتیں جانتا ہے، بس اس کی بارگاہ علم و حکمت میں سر تسلیم خم ہے۔"

مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی۔ مقیم حال لندن

"ایسے ہونہار، ذی علم، متقی اور پرہیزگار بھتیجے کی واقعی جدائی سے آپکو جتنا ملال ہوا ہو کم ہے۔"

محمد یونس سلیم۔ دہلی

"علم و فضل کے ساتھ ان کی نیک نفسی قابل رشک تھی۔ کیا بات ہے کہ ایسے چنے ہوئے اور منتخب افراد جن کی یہاں ضرورت ہے وہ جلد وہاں طلب کر لئے جاتے ہیں۔"

شاہ عون احمد قادری۔ پھلواری شریف۔ پٹنہ

"افسوس کہ مولانا دین و ملت کی جو خدمات فرما رہے تھے اس سے محرومی ہو گئی۔"

مولانا ابو بکر اصلاحی

جامعۃ الفلاح۔ بلریا گنج۔ اعظم گڑھ

"خبر سنتے ہی عجیب سا اثر دل و دماغ پر ہوا، اتنے بڑے عالم ہونے کے باوجود